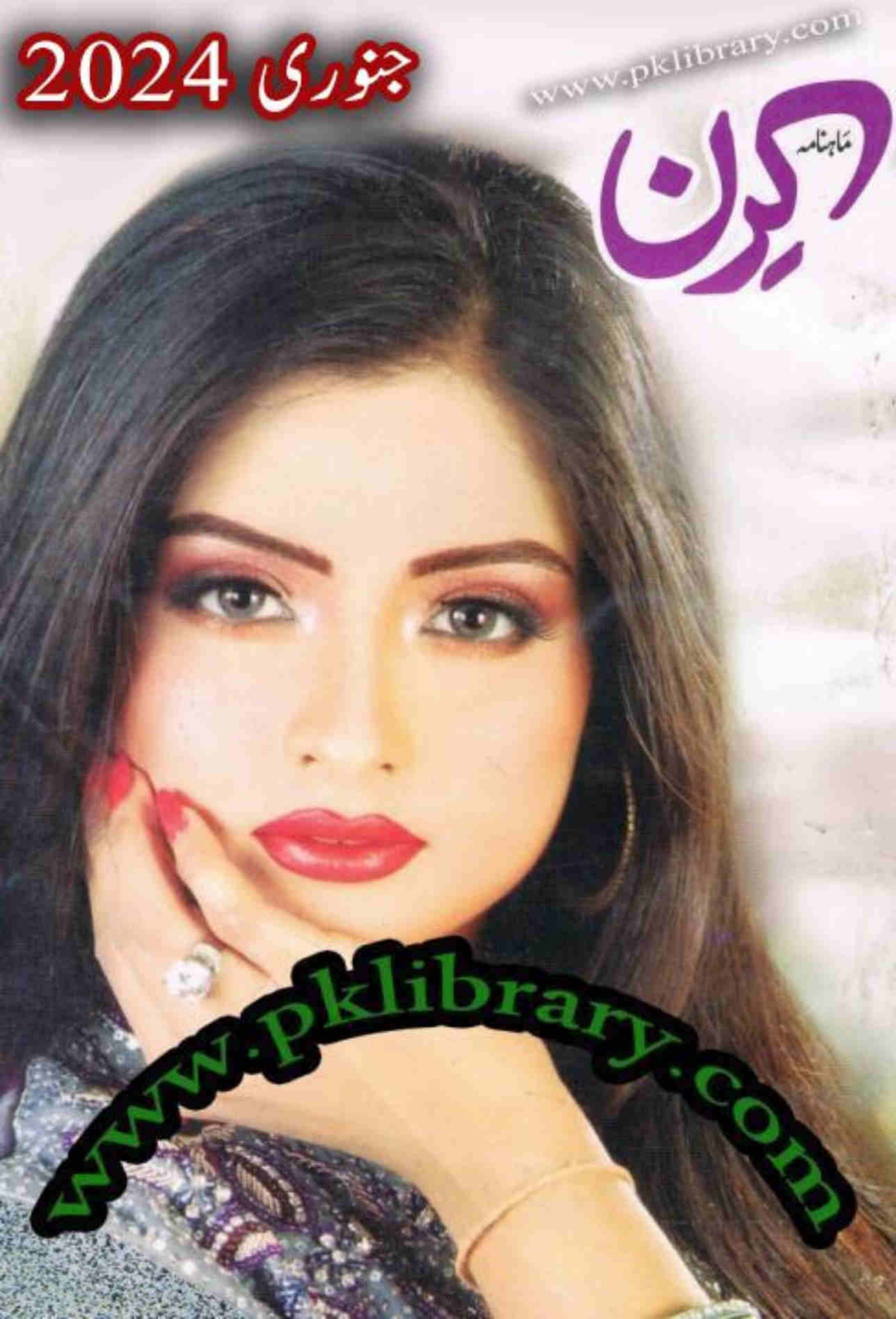

جنوری 2024
ماہنامہ
کرن
www.pklibrary.com
www.pklibrary.com

چاند نگر گروپ آف پبلیکیشنز

کرن

MEMBER
APNS رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
CPNE رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

انٹرویو

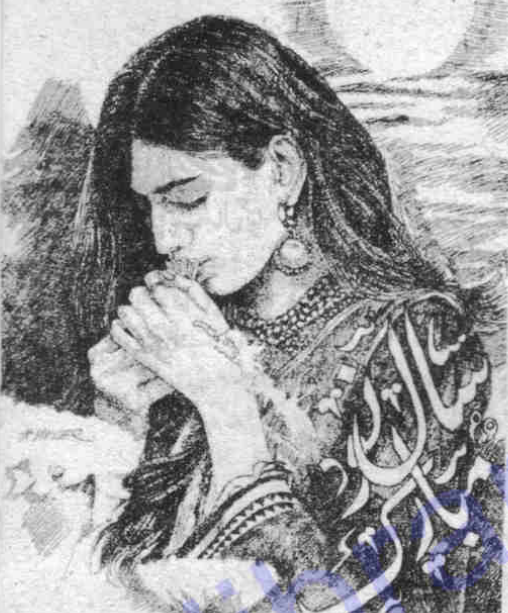
ناول

مکمل ناول

بانی ——— محمود بابر فیصل
نگران ——— محمود ریاض
مدیرہ ——— نادرہ خاتون
مدیر اعلیٰ ——— عامر محمود
نائب مدیرہ ——— شعاع عمیر
مدیرہ خصوصی ——— امت الصبور
قانونی مشیر ——— نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

ناولٹ

افسانے



واٹس ایپ
03172266944

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) .... 1,800 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، یورپ --- 25000 روپے
سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں
subscriptions@khawateendigest.com

کرن کتاب

مستقل سلسلے

خط وکتابت کا پتہ

مُدیرہ

اداریہ

ایک سال گیا، ایک سال نیا ہے آنے کو، وقت میں ٹھہراؤ کہاں، زندگی تو پل پل، اتار چڑھاؤ اور نشیب و فراز سے عبارت ہے یکسانیت کسے نہیں اکتاتی لیکن زندگی کے نشیب و فراز سکون سے جینے بھی نہیں دیتے۔ خصوصاً ہمارے ہاں اجتماعی سطح پر جو بے چینی اور بے یقینی ہے، اس نے ہم کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ملک کی ترقی کے لیے استحکام بہت ضروری ہے۔ اس حوالے سے سال گزشتہ کو دیکھیں تو ملکی سطح پر نہ عالمی سطح پر استحکام کہیں نظر نہیں آیا۔ خصوصاً غزہ پر اسرائیل کی اندھا دھند وحشیانہ بمباری نے پوری مسلم دنیا کو اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے۔ دوسری طرف اقوام عالم کی بے حسی اور بے ضمیری نے ان کی انسان دوستی کا رہا سہا بھرم بھی ختم کر دیا ہے۔

کل کیا ہونے والا ہے، یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے،

قدرت جب کرم کرتی ہے تو سارے اندازے، سارے تجزیے دھرے رہ جاتے ہیں۔ انسان جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو اسی کی طرف رجوع کرتا ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ نیا سال ہم سب کے لیے خوشیاں لے کر آئے۔ ہمارے ملک میں استحکام اور خوشحالی ہو۔

آپ سب کو نیا سال مبارک ہو۔

انشاجی

انشاجی کا نام اردو ادب میں کئی حوالوں سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہ کھرے اور سچے شاعر تھے۔ بناوٹ اور تصنع سے کوسوں دور۔ ان کی شاعری میں ہجر و فراق کے قصے ہیں۔ جوگ بجوگ کی کہانیاں ہیں۔ سادگی اور بے ساختگی نے ان کی شاعری کو ایک جداگانہ رنگ دیا ہے۔

مزاح نگار انشاجی کو دیکھیے تو ایک بالکل مختلف رنگ اور انداز ہے۔ ان کے کالم اس قدر بے ساختہ اور رواں ہیں کہ پڑھتے جائیے اور ہنستے جائیے۔ ان کے کالموں میں ہماری زندگی اور ہماری تہذیب و ثقافت کا سچا رنگ ہے۔ اردو کی آخری کتاب میں مزاح کے پیرائے میں جو لطیف طنز ہیں وہ تو اب ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

انشاجی کو دنیا سے رخصت ہوئے نصف صدی ہونے کو آئی ہے لیکن ان کے کالم آج بھی تازہ ہیں۔

11 جنوری 1978ء کو انشاجی دنیا سے رخصت ہوئے۔ انہوں نے بہت کم عمر پائی۔ شاید جو زندہ رہنے کے لائق ہوتے ہیں انہیں موت جلدی اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔

سانحہ ارتحال

ہمارے ایک اور ساتھی انیس الرحمٰن اس دار فانی سے رحلت فرما گئے

انا للہ وانا الیہ راجعون

کسی بھی ادارے کی کامیابی میں اس کے کارکنان کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ انیس الرحمٰن ہمارے بہت مخلص اور محنتی کارکن تھے۔ ادارے میں سب ان کے اچھے اخلاق کے معترف تھے۔

ان کی وفات ہمارے لیے ایک بڑا سانحہ اور ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اللہ پاک ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین

حمد باری تعالیٰ

تو ہی خالق تو ہی مالک گدا تیرے ہی سارے ہیں
تیری حمد و ثنا کرتے یہ سورج چاند ستارے ہیں

تو ہی فریاد سنتا ہے ہر اک مظلوم و بے کس کی
تیرا در چھوڑتے ہیں وہ جہالت کے جو مارے ہیں

زمین و آسمان کے ہیں خزانے تیرے قبضے میں
یہ ایسا بحر ہے جس کے نہیں کوئی کنارے ہیں

تیرے زیرِ تسلط ہے یہ دنیا و ما فیہا
تیرے اک حرف کن نے تو کئی بگڑے سنوارے ہیں

خداوندا ہمیں ہے آسرا تیری کریمی کا
گناہوں سے بہت لتھڑے ہوئے دامن ہمارے ہیں

جمیل اپنی صفات و ذات میں وہ ذات یکتا ہے
اسی توحید کے قرآن و سنت میں اشارے ہیں

میاں جمیل احمد

نعت رسول مقبول ﷺ

بزم کونین سجانے کے لیے آپ ﷺ آئے
شمع توحید جلانے کے لیے آپ ﷺ آئے

ایک پیغام جو ہر دل میں اجالا کر دے
ساری دنیا کو سنانے کے لیے آپ ﷺ آئے

ایک مدت سے بھٹکے ہوئے انسانوں کو
اک مرکز پہ بلانے کے لیے آپ ﷺ آئے

ناخدا بن کے ابلتے ہوئے طوفانوں کو
کشتیاں پار لگانے کے لیے آپ ﷺ آئے

قافلے والے بھٹک جائیں نہ منزل سے کہیں
دور تک راہ دکھانے کے لیے آپ ﷺ آئے

چشم بیدار کو اسرار خدائی بخشے
سونے والوں کو جگانے کے لیے آپ ﷺ آئے

ساغر صدیقی

نیا سال نئی اُمیدیں

شاہین رشید

ہر سال کی طرح اس سال بھی سروے حاضر ہے۔اس سال سروے کے دو ہی سوال ہیں کہ اپنا تجزیہ پیش کریں کہ سال کیسا گزرا اور 2024ء چونکہ الیکشن کا سال ہے تو تجزیہ پیش کریں کہ کیسا رہے گا۔تو سوال کچھ یوں ہیں کہ۔

1۔2023ء کیسا گزرا اپنی ناکامیوں اور کامیابیوں کا احاطہ کریں۔

2۔2024ء میں پاکستان کو کیسا دیکھتے ہیں۔



ابوراشد......ڈرامہ رائٹر+ براڈ کاسٹر

1۔''2023ء میں بہت ساری کامیابیاں دیکھیں۔''گرو''،''ہاسٹل''اور''ماں نہیں ساس ہوں میں''جیسے پروجیکٹ پاکستان کے مختلف چینلو کے لیے لکھے۔ 2023ء میں ہی بہت سارے وہ

امکانات پیدا ہوئے جس کا ثمر ان شاء اللہ 2024ء میں ملے گا۔ مگر اس سال بہت بڑا ناقابل تلافی نقصان ہوا جب میرا جوان سال بھائی ''ابو عذیر خان'' ہمیں چھوڑ گیا۔''

2۔''پاکستان کی راہ متعین ہونے کے بعد ہی کہا جا سکتا ہے کہ 2024ء میں پاکستان میں کیا ہوگا۔اور کیسا ہو گا۔ پاکستان کے آنے والے دنوں کی قسمت کے ٹاس کے لیے جو سکہ اچھالا گیا ہے وہ ابھی ہوا میں ہے۔دعا ہے کہ پاکستان یہ ٹاس جیت جائے۔''

نازیہ رزاق......رائٹر

1۔''جب 2023ء شروع ہوا تو میں ایک کامیابی کے ساتھ اس میں داخل ہوئی تھی تو میرا سول سروسز کا امتحان پاس ہو چکا تھا 2022ء میں...... اور 25 جنوری 2023ء کو میرا انٹرویو تھا اسی سلسلے کا۔ انٹرویو بہت اچھا ہوا تھا لیکن ایلوکیشن نہیں ہوئی 7 اپریل کو رزلٹ آیا تھا تو چونکہ ایلوکیشن نہیں ہوئی تھی تو بہت زیادہ مایوسی ہوئی تھی۔تو یہ میری پہلی ناکامی تھی پھر جون 2023ء میں دوبارہ سے پیپرز ہوئے۔ پھر پاس ہو گئی اور انٹرویو بھی کچھ دن

پہلے ہی دیا ہے رزلٹ آنے میں دیر ہے۔اس میں طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ پہلے تحریری امتحان ہوتا ہے ،پھر انٹرویو ہوتا ہے پھر فائنل میرٹ بنتا ہے۔تو میرا انٹرویو بھی پاس تھا جس میں ٹاپ اسکورر تھی اور تحریری امتحان۔لیکن میرا جواوور آل میرٹ بنتا تھا ایگری گیٹ مارکس کا ،اس کے حساب سے ایلوکیشن نہیں ہوئی تھی۔کیونکہ میرے دو مضامین میں نمبر کم تھے۔یہ ناکامی کیئریر کے حوالے سے تھی اور ڈائجسٹ کے حوالے سے اگر میں بات کروں تو سب سے زیادہ دکھ کی بات تھی وہ یہ کہ میں نے پورا سال دل لگا کر ایک ناول لکھا تھا اور اس ناول سے مجھے اسی طرح پیار تھا جس طرح والدین کو اپنی کسی ایک اولاد سے زیادہ پیار ہوتا ہے تو یہ ناول مجھے سب سے زیادہ عزیز تھا لیکن وہ شائع نہیں ہوا اور جب میں نے "میم احمل" صاحبہ سے بات کی توانہوں نے کہا کہ وہ ایک بہت ہی مشکل ناول تھا۔

2۔مجھے لگتا ہے کہ پاکستان میں بہت زیادہ تبدیلیاں آرہی ہیں اور سب سے بڑی تبدیلی تو یہ کہ 2024ء میں الیکشن ہوں گے اور اس کی وجہ سے رجیم چینج ہوگا۔ہاں ہماری اکانومی اگلے دو تین سال ایک جیسی ہی رہنے والی ہے۔سوائے ہمارے "جی،ڈی،پی" کے کہ شاید وہ گرو کر جائے یا ہمارے ٹیکسوں میں اضافہ ہو جائے۔یا ہو سکتا ہے کہ ہم ایکسپورٹ کچھ بڑھا لیں۔نئی حکومت کو بھی سیٹ ہونے میں ٹائم لگے گا۔اور مہنگائی تو ساری دنیا میں بڑھ رہی ہے اور اس نے بڑھنا ہی ہے ،کم نہیں ہونا۔ہاں اب لوگوں میں اویرنیس آگئی ہے اب ایک کماتا ہے دس کھاتے ہیں والا کام نہیں رہا۔اب لوگوں کو سمجھ میں آگیا ہے کہ جب تک سب نہیں کمائیں گے گزارا نہیں ہوگا اور الیکشن میں تو پرانے چہرے ہی آئیں گے۔"

رضا احمد......ڈرامہ نگار

1۔"2023ء کا آغاز بہت خوب صورت ہوا۔یکم جنوری 2023ء کو میرے ڈرامہ "کچا دھاگا" کی پہلی قسط نشر ہوئی۔اس پروجیکٹ کا بہت بے صبری سے انتظار تھا۔یوں سال کی شروعات کامیابی کے ساتھ ہوئی اس کے بعد "دل پہ زخم کھائے ہیں" نشر ہوا جس نے کافی ریٹنگ لی۔یوں مجموعی طور پر اس سال اتنی بڑی کامیابیاں ملیں کہ چھوٹی ناکامیاں ان میں دب کر رہ گئیں۔"

2۔"پاکستان کے ہر آنے والے سال میں بہتری دیکھتا ہوں لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ مایوسی ہوتی ہے۔بین الاقوامی سطح کی ہر رپورٹ میں ہمارا گراف نیچے سے مزید نیچے کی طرف جا رہا ہے۔پھر چاہے روپے کی قدر کی بات ہو،انصاف کی ہو،ایمانداری کی ہو،خوش اخلاقی کی ہو،انفرادی ترقی کی ہو یا تعلیمی معیار کی ......لیکن امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔تو بس اسی امید کے ساتھ یہ سال بھی گزرے گا کہ پاکستان کے حالات اور عوام کے اعمال بہتری کی طرف گامزن ہوں۔"





عرفان واسطی......شیف

1۔ ”اگر میں اپنے حوالے سے بات کروں تو بہت اچھا رہا۔ بہت کچھ اچیومنٹ بھی ہوئی۔ میں نے ایک جاب بھی چینج کی۔ ایک اچھی اپرچونیٹی تھی وہ میں نے اویل کی اور اس کے ساتھ ساتھ جو میری یوٹیوب چینل اور میڈیا سے وابستگی تھی اس میں بھی بہت کامیاب رہا۔ الحمد للہ اگر پورے سال کا جائزہ لوں تو بہت اچھا رہا اور ناکامیوں سے بھی سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ آپ کے تجربات میں اضافہ ہوتا ہے اور پھر ہم دوبارہ وہ غلطیاں نہیں کرتے۔ اپنی ناکامیوں کو پازیٹو لیں تو پھر یہ فیوچر کے لیے بہت کارگر ثابت ہوتی ہیں اور آپ کو Decision لینے میں آسانی ہوتی ہے۔

2۔ ”پاکستان کو بہت اچھے طریقے سے ترقی کرتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ آج کل پاکستان کے جو حالات ہیں ایسے حالات سب ممالک پر آتے ہیں۔ دنیا کے بہت سارے ممالک کو ہم نے گرتے اور سنبھلتے دیکھا ہے۔ مجھے بڑی امید ہے کہ ہمارا ملک صحیح ہاتھوں میں جائے گا الیکشن کے بعد اور وہ ملک کے لیے کچھ سوچیں گے، اسے ترقی کی راہ پر گامزن کریں گے۔ 2024ء کے لیے دعا ہے کہ پاکستان کا جو مقام پہلے تھا وہ وہی مقام حاصل کر لے۔ پاکستان کی خوشحالی کے لیے ہم بھی جو کچھ کر سکتے ہیں کریں گے ان شاءاللہ۔“

مصباح نوشین۔ ڈرامہ رائٹر+ ناول نگار، افسانہ نگار

1۔ ”2023ء کا آغاز شاندار ہوا تھا۔ میں نے اپنا من پسند گھر خریدا تھا جو میرے اپنے نام ہے آج کل ”سکون“ سیریل آن ایر ہے جو کہ بہت ہٹ ہو رہا ہے اور اس سال لکھنے کا کام بھی زیادہ کیا اور بہت اچھے موضوعات کا انتخاب کیا جو کہ یقیناً 2024ء میں آپ سب دیکھ سکیں گے ان شاءاللہ۔ 2024ء سے مجھے کسی بھی سال سے زیادہ امیدیں ہیں میرے کافی سارے پروجیکٹس ہیں جن کے آن ایر آنے کا مجھے انتظار ہے۔ عمرے پر جانے کا پلان ہے۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔“

2۔ ”پاکستان میں الیکشن ہونے والے ہیں تو



دلی طور پر چاہتی ہوں کہ ملکی حالات بہترین ہو جائیں۔ مہنگائی کم ہو جائے۔ غریب خوشحال ہو جائے۔ میرے کچھ خواب ہیں جن کی لسٹ بنا چکی ہوں 2024ء میں ان کو مکمل کرنا ہے۔“



ڈاکٹر حبا سلیم کاشمیری......ڈراما ٹو لو جسٹ

1۔ ”2023ء ذاتی طور پر کافی خوش قسمت سال رہا۔ دین سے اور خدا سے قربت بہت زیادہ رہی۔ میری بھی، میرے بچوں کی بھی اور میرے میاں صاحب کی...... اور الحمد للہ اس حوالے سے بہت اطمینان ہے دل کو۔“

2۔ پاکستان کے لوگوں کے دلوں میں تھوڑا صبر، شکر اور سکون دیکھنا چاہتی ہوں۔ پاکستان کی اکانومی کو بہتر ہوتا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں اور یہ جو اتنی مہنگائی ہو گئی ہے اس کو تھوڑی کم ہوتی دیکھنا چاہتی ہوں۔ اور لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت، پیار، ہمدردی، تعاون دیکھنا چاہتی ہوں۔ اور میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے پاکستان میں مسلمان ہی مسلمان کے خلاف ہو جاتا ہے اس کو ختم ہوتا ہوا دیکھنا چاہتی

ہوں۔“



کامران اکبر خان......ڈائریکٹر۔ ڈرامہ + فلم

1۔ ”2023ء اچھا گزرا، کام بھی ہوا اور کامیاب بھی ہوا۔ خدا کے کرم سے آگے ہی بڑھتے رہے۔ لیکن اس خوشی اور کامیابی کو جس چیز نے ماند کر دیا وہ فلسطینیوں کی بے بسی اور ظلم نے کیا۔ ہم تو یہاں اچھی زندگی گزار رہے ہیں اور وہاں، بچے، بوڑھے اور جوان گاجر مولی کی طرح کٹ مر رہے ہیں بلکہ شہید ہو رہے ہیں، اور کوئی اس ظلم کو روکنے اور پوچھنے والا نہیں ہے اور امت مسلماں کچھ نہیں کر پا رہی۔ تو اس لحاظ یہ سال کچھ زیادہ اچھا نہیں گزرا۔ دکھی کر گیا یہ سال۔“

2۔ ”دعا ہے کہ 2024ء بہت اچھا رہے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے گناہوں کی معافی مانگیں اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں تا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں سرخروئی عطا کرے۔ فتح سے ہمکنار کرے۔ ہمارے خلفاء راشدین کے دور میں جو

یکجہتی تھی خدا کرے وہی دور واپس آ جائے۔ اللہ تعالیٰ فلسطین کو آزاد کرے۔ سب کی مغفرت فرمائے اور دلوں میں سکون دے۔ آمین۔"



نجیلہ عاصم ...... ڈرامہ رائٹر

1۔ "2023ء الحمد للہ بہت اچھا گزرا، اچھا رہا۔ مجھ پر کافی قرضہ تھا وہ بھی الحمد للہ اتر گیا۔ زندگی میں اچھے برے تجربات ہوتے رہتے ہیں اور وہ بھی ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ اللہ نے بہت کرم کیا۔ ہاتھ تھامے رکھا۔ اس کے بہت احسانات ہیں ناکامیوں کا ذکر کر کے میں ناشکری نہیں کرنا چاہتی کیونکہ مجھے میرے رب نے بہت نوازا ہوا ہے۔"

2۔ "میرا خواب ہے کہ پاکستانی قوم میں انسانیت جاگ جائے اور میری تمنا ہے کہ پاکستان میرے ملک میں انسان، انسان سے پیار کرے۔ جانوروں سے پیار کرے۔ انسان، انسان کی قدر کرے۔ خیال رکھے اور ایک دوسرے کی خوشیوں میں خوش ہونا سیکھیں۔ جلنا، کڑھنا، اپنی ناکامیوں کا بدلہ دوسروں سے لینا ان کی خوشیوں میں زہر گھولنا ان سے پرہیز کریں۔ اور اللہ تعالیٰ سے بہت دعا ہے کہ میرا ملک ترقی کرے اور مہنگائی کا زور ٹوٹے، انصاف ہو، محبت ہو، لاء اینڈ آرڈر ہو، قانون کا احترام ہو، اللہ پاک میرے ملک کو ترقی دے۔ کیونکہ پاکستان ہے تو ہم ہیں۔ ہماری ہستی مستی سب اسی سے جڑی ہوئی ہے۔ اللہ پاک میرے ملک کو ہر نعمت سے نوازے اور عوام کے دلوں میں وطن کی محبت کا جذبہ ڈالے۔ (آمین)"



ثاقب سمیر ...... آرٹسٹ

1۔ "2023ء بہت بہت اور بہت ہی اچھا گزرا۔ اور میرے جتنے بھی ڈرامے آن ایئر ہوئے، بے حد مقبول ہوئے۔ تو پروفیشنلی طور پر بہت اچھا سال گزرا اور اگر ذہنی طور پر بات کریں تو ہم ہر سال کچھ نیا سیکھتے ہیں اور پھر اسے عملی زندگی میں اپلائی بھی کرتے ہیں۔ اور فیملی کے حوالے سے بات کروں تو میری دو بیٹیوں نے اس سال اسکول جانا شروع کیا۔ صبح اٹھنا، ان کو چھوڑنا، اسکول میں دن کیسا گزرا وغیرہ کی روٹین سے زندگی میں یہ خوشگوار تبدیلی آئی ہے۔ بہت مزا آتا ہے بچیوں کی نئی ڈیولپمنٹ کو دیکھ کر۔ 2023ء ایسا گزرا کہ اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ اور اگر آپ ناکامی

کی بات کر رہی ہیں تو یہ سوال ہی نگیٹو ہے اور پھر اس کا جواب بھی نگیٹویٹی میں ہی آئے گا۔ یہ تو کبھی سوچا ہی نہیں کہ ناکامی کیا ہوتی ہے کیونکہ یہ تو زندگی کا حصہ ہے۔ سیانے کہتے ہیں کہ اگر آپ کو زندگی کی ریس جیتنی ہے تو گاڑی میں ایکسل یٹر بھی ہوتا ہے جو کہ اسپیڈ کا ہوتا ہے اس کے ساتھ ایک بریک کا ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ سڑک بالکل سیدھی نہیں ہوتی اس میں موڑ بھی آتے ہیں اسپیڈ بریکرز بھی آتے ہیں اور یوٹرن بھی آتے ہیں تو صرف ایکسلیٹر پر پاؤں رکھنے سے گاڑی نہیں چلتی تو ناکامی ایک بریک ہوتی ہے۔ جس کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اور اس کے بعد ہی ہم ری فریش ہوتے ہیں۔ تو آگے بڑھنے کے لیے یہ سب کچھ بہت ضروری ہے۔"

2۔ یہ تو ایک بہت ہی سنگین سوال ہے کیونکہ بہت اچھے طریقے سے دیکھنے کی کوشش کی مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ تو بس دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اس کی ساتھ جو ہو بہتر ہو۔ ہم نے تو اقتدار میں لا کر سب کو ٹرائی کر لیا اب کسی انسان سے کوئی امید نہیں رہی۔ اب صرف اللہ سے ہی امید ہے۔

1۔ "2023ء جیسا گزرا بس گزر ہی گیا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ بہت ہی کڑے دن تھے۔ اللہ تعالیٰ بہتری کرے گا۔ اور بہت جلد کامیابیوں کے دن بھی آئیں گے۔ 2024ء کے لیے میری خواہش ہے کہ دوبارہ سے لکھنا شروع کر دوں اور اللہ نے چاہا تو ایسا ہی ہو گا۔ بس آپ سب میرے حق میں دعا کریں۔"

2۔ "2024ء میں اپنے پیارے ملک کو بہت خوشحال دیکھنا چاہتی ہوں۔ فی الحال تو مہنگائی سے ہر کوئی بہت پریشان ہے۔ امیر امیر تر ہو رہا ہے اور غریب غریب تر ہو رہا ہے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ دنیا آگے بڑھ رہی ہے اور ہم پیچھے کی طرف جا رہے ہیں۔ میں تو حیران ہوں کہ کراچی میں لوگ پینے کا پانی بھی خرید رہے ہیں۔ گیس کا فقدان ہے۔ تو اگر حکمران عوام کے مسائل حل نہیں کر سکتے تو پھر لعنت ہے ان کے اوپر...... سمجھ میں نہیں آتا ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ بس اللہ ہی خیر کرے۔"



اقبال بانو......رائٹر



اسماء سایانی ...... ڈرامہ رائٹر

یجہتی تھی خدا کرے وہی دور واپس آجائے۔ اللہ تعالیٰ فلسطین کو آزاد کرے۔ سب کی مغفرت فرمائے اور دلوں میں سکون دے۔ آمین۔"



زنجبیل عاصم......ڈرامہ رائٹر

1۔"2023ء الحمد للہ بہت اچھا گزرا، اچھا رہا۔ مجھ پر کافی قرضہ تھا وہ بھی الحمد للہ اتر گیا۔ زندگی میں اچھے برے تجربات ہوتے رہتے ہیں اور وہ بھی ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ اللہ نے بہت کرم کیا۔ ہاتھ تھامے رکھا۔ اس کے بہت احسانات ہیں ناکامیوں کا ذکر کر کے میں ناشکری نہیں کرنا چاہتی کیونکہ مجھے میرے رب نے بہت نوازا ہوا ہے۔"

2۔"میرا خواب ہے کہ پاکستانی قوم میں انسانیت جاگ جائے اور میری تمنا ہے کہ پاکستان میرے ملک میں انسان، انسان سے پیار کرے۔ جانوروں سے پیار کرے۔ انسان، انسان کی قدر کرے۔ خیال رکھے اور ایک دوسرے کی خوشیوں میں خوش ہونا سیکھیں۔ جلنا، کڑھنا، اپنی ناکامیوں کا بدلہ دوسروں سے لینا ان کی خوشیوں میں زہر گھولنا ان سے پرہیز کریں۔ اور اللہ تعالیٰ سے بہت دعا ہے کہ میرا ملک ترقی کرے اور مہنگائی کا زور ٹوٹے، انصاف ہو، محبت ہو، لاء اینڈ آرڈر ہو، قانون کا احترام ہو، اللہ پاک میرے ملک کو ترقی دے۔ کیونکہ پاکستان ہے تو ہم ہیں۔ ہماری ہستی مستی سب اسی سے جڑی ہوئی ہے۔ اللہ پاک میرے ملک کو ہر نعمت سے نوازے اور عوام کے دلوں میں وطن کی محبت کا جذبہ ڈالے۔ (آمین)"



ثاقب سمیر......آرٹسٹ

1۔"2023ء بہت بہت اور بہت ہی اچھا گزرا۔ اور میرے جتنے بھی ڈرامے آن ایئر ہوئے، بے حد مقبول ہوئے۔ تو پروفیشنلی طور پر بہت اچھا سال گزرا اور اگر ذہنی طور پر بات کریں تو ہم ہر سال کچھ نیا سیکھتے ہیں اور پھر اسے عملی زندگی میں اپلائی بھی کرتے ہیں۔ اور فیملی کے حوالے سے بات کروں تو میری دو بیٹیوں نے اس سال اسکول جانا شروع کیا۔ صبح اٹھنا، ان کو چھوڑنا، اسکول میں دن کیسا گزرا وغیرہ کی روٹین سے زندگی میں یہ خوشگوار تبدیلی آئی ہے۔ بہت مزا آتا ہے بچیوں کی نئی ڈیولپمنٹ کو دیکھ کر۔ 2023ء ایسا گزرا کہ اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ اور اگر آپ ناکامی

کی بات کر رہی ہیں تو یہ سوال ہی نگیٹو ہے اور پھر اس کا جواب بھی نگیٹویٹی میں ہی آئے گا۔ یہ تو کبھی سوچا ہی نہیں کہ ناکامی کیا ہوتی ہے کیونکہ یہ تو زندگی کا حصہ ہے۔ سیانے کہتے ہیں کہ اگر آپ کو زندگی کی ریس جیتنی ہے تو گاڑی میں ایکسل یٹر بھی ہوتا ہے جو کہ اسپیڈ کا ہوتا ہے اس کے ساتھ ایک بریک کا ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ سڑک بالکل سیدھی نہیں ہوتی اس میں موڑ بھی آتے ہیں اسپیڈ بریکرز بھی آتے ہیں اور یوٹرن بھی آتے ہیں تو صرف ایکسلیٹر پر پاؤں رکھنے سے گاڑی نہیں چلتی تو ناکامی ایک بریک ہوتی ہے۔ جس کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اور اس کے بعد ہی ہم ری فریش ہوتے ہیں۔ تو آگے بڑھنے کے لیے یہ سب کچھ بہت ضروری ہے۔"

2۔ یہ تو ایک بہت ہی سنگین سوال ہے کیونکہ بہت اچھے طریقے سے دیکھنے کی کوشش کی مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ تو بس دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اس کی ساتھ جو ہو بہتر ہو۔ ہم نے تو اقتدار میں لا کر سب کو ٹرائی کر لیا اب کسی انسان سے کوئی امید نہیں رہی۔ اب صرف اللہ سے ہی امید ہے۔



اقبال بانو......رائٹر

1۔ "2023ء جیسا گزرا بس گزر ہی گیا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ بہت ہی کڑے دن تھے۔ اللہ تعالیٰ بہتری کرے گا۔ اور بہت جلد کامیابیوں کے دن بھی آئیں گے۔ 2024ء کے لیے میری خواہش ہے کہ دوبارہ سے لکھنا شروع کر دوں اور اللہ نے چاہا تو ایسا ہی ہو گا۔ بس آپ سب میرے حق میں دعا کریں۔"

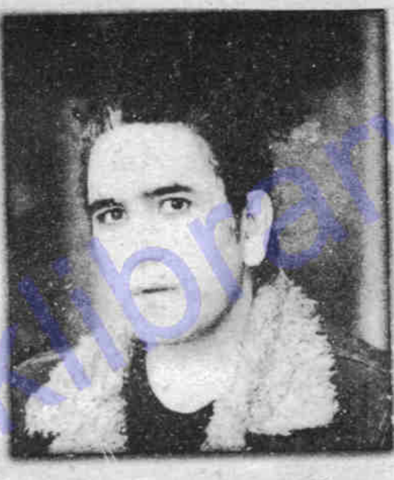
2۔ "2024ء میں اپنے پیارے ملک کو بہت خوشحال دیکھنا چاہتی ہوں۔ فی الحال تو مہنگائی سے ہر کوئی بہت پریشان ہے۔ امیر امیر تر ہو رہا ہے اور غریب غریب تر ہو رہا ہے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ دنیا آگے بڑھ رہی ہے اور ہم پیچھے کی طرف جا رہے ہیں۔ میں تو حیران ہوں کہ کراچی میں لوگ پینے کا پانی بھی خرید کر پیتے ہیں۔ گیس کا فقدان ہے۔ تو اگر حکمران عوام کے مسائل حل نہیں کر سکتے تو پھر لعنت ہے ان کے اوپر...... سمجھ میں نہیں آتا ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ بس اللہ ہی خیر کرے۔"



اسماء سایانی ...... ڈرامہ رائٹر

1۔ "اب تو زندگی اس مقام پر آ گئی ہے کہ جہاں ناکامی بھی زیادہ میٹر نہیں کرتی اور کامیابی...... اور 2023ء کا جو آخری کوارٹر گزرا ہے اور اس میں فلسطین پر جو ظلم ہوا ہے اس کے ذکر سے انسان افسردہ ہو جاتا ہے۔ پھر جو پاکستان کے معاشی حالات ہیں اور جو پوری دنیا میں ہو رہا ہے اس نے اتنا بددل کر دیا ہے دنیاوی معاملات سے کہ اب میں اپنی زندگی پر کوئی اتنا اثر لیتی نہیں ہوں۔ ہر چیز فانی ہے اور اس سے بڑا دکھ نہیں کہ آپ اپنے ماں باپ کو کھوتے ہیں اور اس سے بڑا دکھ نہیں کہ ماں باپ اپنی اولاد کو کھوتے ہیں...... اور یہی چیز فلسطین میں ہو رہی ہے اور جس انداز میں ہو رہی ہے اس نے ہم سب کو منجمد کر دیا ہے۔ اور اگر میں پروفیشنل پوائنٹ آف ویو سے دیکھوں تو مجھے ایک بڑی کامیابی میرے لکھے سیریل "بیٹیاں" سے ملی اور میرے اسی سیریل کو لکس اسٹائل ایوارڈ ملا۔ اور یہ میرے لیے بہت بڑی بات تھی۔ لیکن اس کے باوجود زندگی اس پوائنٹ پہ آ چکی ہے کہ وہ جس حال میں رکھے خوش رہیں۔ اگر آپ کی ٹیبل پر اچھا آپ کی پسند کا کھانا ہے اور آپ اچھے کپڑے پہن رہے ہیں تو بہت شکر ادا کریں اپنے رب کا اور جو کام نہیں ہو پا رہے اس میں یقیناً اس کی مصلحت ہو گی اور میں اپنے اللہ سے یہی دعا کرتی ہوں کہ مجھے اپنی رضا میں راضی رکھ اور ان چیزوں سے میرا دل ہٹا دے جن کے پیچھے میں بھاگ رہی تھی اور جو سب دنیاوی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ دنیا اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہی ہے اور کسی بھی چیز کی اب بہت خوشی نہیں ہوتی دل کو، شاید بوڑھے ہو گئے ہیں۔ شاید وقت ایسا آ گیا ہے۔"

2۔ "بظاہر تو حالات بہت مایوس کن نظر آتے ہیں۔ 2024ء میں جو کچھ پچھلے ایک ڈیڑھ سال میں ہوتا رہا ہے سوشلی بھی اکنامکس کے حوالے سے اور جو جنریشن ہماری بھاگ رہی ہے ڈیجیٹل ایج میں اور جو میں ٹک ٹاک دیکھ رہی ہوں۔ یوٹیوبرز دیکھ رہی ہوں تو مجھے اپنی نئی جنریشن کے فیوچر کے حوالے سے بہت فکر ہوتی ہے کہ ہم نے اپنی نئی نسل کو کہاں لگا دیا ہے۔ پڑھنے لکھنے کی اہمیت کم ہو گئی ہے کہ بس آپ اسی طرح کما سکتے ہیں۔ اور میں دیکھتی ہوں کہ اس ملک میں انصاف نہیں ہے۔ ڈاکٹر، پڑھا لکھا بندہ ریڑھی لگا رہا ہے کوئی بھی ایرا غیرا یوٹیوب سے کما رہا ہے۔ سیاست بھی صحیح ڈائریکشن میں نہیں چل رہی۔ الیکشن سر پر ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ کوئی امید نہیں ہے موجودہ نظام میں شفاف الیکشن ہونے کی کوئی امید نہیں ہے مگر اللہ کے ایک "کن" کہنے سے سب کام ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ بہ حیثیت مسلمان کے مایوس ہونا گناہ ہے اور بہ حیثیت ایک قوم کے ہم فیل ہو چکے ہیں۔"



مصطفیٰ چودھری......اداکار+صداکار

1۔ "اللہ کا شکر رہا 2023ء بہت ہی اچھا گزرا اور کامیابی اور ناکامی تو بس ریلیٹو ہے۔ لیکن اللہ کا شکر رہا سب ٹھیک تھا۔ کرم رہا مالک کا۔"

2۔ "مملکت خداداد کو جیسے دانستہ ناکام تجربہ کر کے پیچھے دھکیلا گیا تھا اب ان شاء اللہ ترقی اور خوشحالی کی طرف ہی گامزن ہو گا اور اللہ کی ذات سے امید ہے کہ بہت بہتر ہو گا۔"

☆☆

میری بھی سنئے

جویریہ نیّر

شاہین رشید

بے بی باجی کی...... گلشن آراء

1۔ "پورا نام؟"

"جویریہ نیّر"

2۔ "پیار کا نام"

"موٹی اور میڈیا والے وی جے کے نام سے پکارتے ہیں۔"

3۔ "جنم لیا؟"

"22 مئی کو اور سال ہے 1986ء"

4۔ "گھر میں بولی جانے والی زبان؟"

"اردو"

5۔ "میرا ستارہ؟"

"میرا ستارہ جیمنائی (جوزا) اور اپنا قد بھی بتادوں کہ میں پانچ فٹ پانچ انچ کی ہوں۔"

6۔ "بہن بھائی؟"

"ہم چھ بہن بھائی ہیں اور میرا نمبر آخری ہے۔"

7۔ "فیلڈ میں آئی؟"

"اپنے شوق کی وجہ سے۔ اور اچانک ہی شوق نے جنم لیا...... اور اللہ نے کامیاب بھی کردیا۔"

8۔ "کون خوش ہوا؟ کون ناراض ہوا؟"

"میرے فیلڈ میں آنے سے کس کو خوشی ہوئی اس کا اظہار تو کسی نے نہیں کیا...... البتہ گھر والوں نے اعتراض کیا مگر کوئی خاص پنگا نہیں لیا...... جلدی مطمئن ہوگئے۔"

9۔ "تعلیم، ڈگریاں؟"

"ڈگری تو نہیں ہے۔ البتہ کمرشل آرٹ میں



گریجویٹ ہوں۔ بس یہی ایک ڈگری ہے۔"

10۔ "پہلا ڈرامہ، شہرت؟"

"بے بی باجی اور شہرت بھی اسی نے دی۔"

11۔ "بچپن میں کس سے ڈر لگتا تھا؟"

"موت سے"

12۔ "مطلب اپنی موت سے؟"

"اپنی موت کی بچپن ہی کسے سمجھ ہوتی ہے۔ کسی کے انتقال کی خبر سن کر خوف زدہ ہو جاتی تھی۔ حتیٰ کہ مسجد میں کسی کے انتقال کا اعلان بھی ہو رہا ہوتا تھا تو میری روح فنا ہونے لگتی تھی۔"

13۔ "اور اب؟"

"اب تو خیر ایسا کچھ نہیں...... لیکن بچپن میں تو انتقال کی خبر سن کر رات کو نیند نہیں آتی تھی۔"

14۔ "پہلی جاب پریکٹیکل لائف کی؟"

"ایک اسکول میں جاب کی تھی اور میری سیلری آٹھ ہزار تھی اس وقت میں خود بھی طالبہ تھی...... سیکنڈ ایئر کی۔"

15۔ "پہلی کمائی کہاں خرچ کی؟"

"میں نے اپنی امی جان کے لیے ایک سوٹ لیا تھا اور اپنی دونوں بہنوں کے لیے اور اپنے بھانجے کے لیے۔ سوٹ لیے تھے۔ بھانجا اس وقت اکلوتا تھا اس لیے اس کے لیے لینا لازمی تھا۔"

16۔ "اپنے لیے کیا خریدا؟"

"اپنے لیے بھی کپڑے ہی لیے...... اور کچھ کیش رکھ لیا خرچ کرنے کے لیے...... سستا زمانہ تھا...... اب تو آٹھ ہزار سے ڈھنگ کا ایک سوٹ نہیں آتا۔"

17۔ "جاب کی وجہ؟ شوق یا ضرورت؟"

"جاب کرنا میرا شوق تھا ضرورت نہیں تھی...... بچپن سے ہی شوق تھا اسکول میں جاب کرنے کا...... اس لیے کیا!"

18۔ "بچپن کی بری عادت؟"

"بہت بری عادت یہ تھی کہ جہاں بھی کوئی جا رہا ہوتا تھا اس کے ساتھ میں بھی جانے کے لیے تیار ہو جاتی تھی۔ اب گھر والے لے جانے کو تیار ہوں یا نہ ہوں میں نے ضرور جانا ہوتا تھا اب افسوس ہوتا ہے کہ میں ایسا کیوں کرتی تھی۔"

19۔ "صبح کب اٹھتی ہیں؟"

"صبح ساڑھے پانچ بجے خواہ سردیاں ہوں یا گرمیاں میرا فکس ٹائم ہے...... ہاں کبھی دیر تک سونے کا موڈ ہو تو پھر دس بجے تک سوتی رہتی ہوں...... کبھی کبھی گیارہ بھی بج جاتے ہیں۔"

20۔ "نیند سے اٹھتے ہی کیا کھانے پینے کو دل چاہتا ہے؟"

"کھانے کی تو نہیں البتہ پینے کی طلب ہوتی ہے کہ کچھ بھی پینے کو مل جائے، کافی یا بلیک کافی اور پانی۔"

21۔ "پسندیدہ مشروب؟"

"مجھے بلیک کافی بہت پسند ہے...... اور ہاں میں آپ کو یہ بتانا بھول گئی کہ صبح اٹھتے ہی مجھے پانی کی بہت طلب ہوتی ہے۔ اور قہوہ بھی میں بہت شوق سے پیتی ہوں۔"

22۔ "ناشتے کی طلب ہوتی ہے؟"

"الحمدللہ...... چائے کافی کے بعد ناشتا کرتی ہوں۔ اور کبھی ایسا نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے کہ میں ناشتا چھوڑ دوں...... ناشتا میری پسندیدہ چیز ہے۔"

23۔ "کیا برداشت نہیں؟"

"بھوک برداشت نہیں ہے...... صبح اٹھتے ہی پہلے کافی پھر ناشتا ضرور ہوتا ہے۔"

24۔ "غصہ......!"

"غصہ آتا ہے کبھی نکال دیتی ہوں تو کبھی پی لیتی ہوں یا دبا لیتی ہوں۔"

25۔ "الیکشن قریب ہیں کیا کہیں گی؟"

"کیا کہنا ہے...... بس یہی خواہش ہے کہ پاکستان کے حالات ٹھیک ہو جائیں۔"

26۔ "ملک سے باہر قیام کی خواہش ہے؟"

"بالکل بھی نہیں، مجھے تو اپنے ملک سے بہت پیار ہے جن حالات میں بھی یہ ملک ہوگا ہم اس کو نہیں چھوڑیں گے۔"

27۔ "پیار کے علاوہ کیا خوبی ہے پاکستان میں؟"

"آزادی...... آزادی بہت بڑی نعمت ہے اگر آپ کے پاس پیسہ ہے تو سب سے زیادہ عیش

اپنے ہی ملک میں کر سکتے ہیں کیوں بہت سکون ہے اپنے ملک میں......"

28۔ "کس کی سپورٹر ہیں سیاست میں؟"

"میرا اگرچہ سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن میں پھر بھی پیپلز پارٹی کی سپورٹر ہوں۔"

29۔ "سوشل کاموں سے میری دلچسپی؟"

"بہت زیادہ......میں سوشل کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہوں......جہاں مجھے موقع ملتا ہے......میں بڑھ چڑھ کر کام کرتی ہوں۔"

30۔ "گھومنے پھرنے کا شوق؟"

"بہت زیادہ ہے شوق ہے۔ مختلف ممالک میں گھومنے پھرنے کا......اور بس یہی دل چاہتا ہے کہ گھوم گھام کر واپس اپنے پیارے ملک واپس آجاؤں......"

31۔ "فضول خرچ ہوں؟"

"ہرگز نہیں ہوں فضول خرچ......البتہ یہ شوق ضرور ہے کہ میرے پاس ہر طرح کی چیز موجود ہو اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مجھے کسی سے ماچس کی تیلی بھی مانگنی پڑی ہو......میں جو چیز لیتی ہوں کام کی لیتی ہوں۔"

32۔ "شوبز میں کیا برائی ہے؟"

"جو ٹیلنٹ ہوتا ہے وہ دربدر پھر رہا ہوتا ہے اور اس کو کام کرنے کا موقع نہیں دیتے۔ اور جن کے پاس رسائی ہوتی ہے یا ریفرنسز ہوتے ہیں وہ آرام سے اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔"

33۔ "اور اچھائی؟"

"یہ اچھائی ہے کہ ریفرنس پہ کام مل جاتا ہے اور کچھ ہی لوگ ہوتے ہیں جنہیں ڈائریکٹ چلتے پھرتے کام مل جاتا ہے۔"

34۔ "اسپورٹس سے لگاؤ؟"

"اسپورٹس سے مجھے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔"

35۔ "کب اونچا یا زور زور سے بولتی ہوں؟"

"جب کوئی بلاوجہ کسی بات کے پیچھے لگ جائے تب میری آواز اونچی ہو جاتی ہے۔ اور بہت ڈانٹ پڑتی ہے اس بندے یا بندی کو جو بلاوجہ پیچھے پڑ جاتا ہے۔"

36۔ "کس چیز کو خریدنا آپ کا خواب ہے؟"

"الحمدللہ کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے کہ جس کو خریدنا میرا خواب ہو۔ شکر الحمدللہ جتنا ہے اس پر بہت خوش ہوں۔"

37۔ "کس کی خاطر یہ فیلڈ چھوڑ سکتی ہیں؟"

"اپنے بچوں کی خاطر......اگر کوئی ایسی صورت حال ہو جائے کہ گھر اور بچے دونوں ڈسٹرب ہو رہے ہوں تو پھر یہ فیلڈ چھوڑ دوں گی۔"

38۔ "کون سا کام ہے جو پہلے کبھی نہیں کیا تھا اب کرنے لگیں ہوں؟"

"اداکاری پہلے کبھی نہیں کی تھی اب کرنے لگی ہوں۔ موقع مل گیا تو شوق پورا کر لیا۔"

39۔ "خاندان میں کون سب سے جلدی ناراض ہو جاتا ہے۔"

"میری سب سے بڑی بہن۔"

40۔ "کون سی عادتیں ایسی ہیں جو چاہتی ہوں کہ مجھ میں آجائیں۔"

"صبر، اطمینان، سکون اور عمل......میں چاہتی ہوں کہ مجھ میں بھی آجائیں۔"

41۔ "کھوئے ہوئے وہ لوگ جن کو دوبارہ پانا چاہتی ہوں؟"

"اپنے اماں اور ابا۔"

42۔ "کون سا دور دوبارہ آجائے؟"

"میرا بچپن بہت خوب صورت تھا۔ بس وہ واپس آجائے تو کیا کہنے۔"

43۔ "میری اتنی مانی جاتی ہے کہ؟"

"کہ میرے فیصلے پر کوئی مداخلت نہیں کرتا۔"

44۔ "اگر بیمار ہو جاؤں تو؟"

"تھوڑا سا بخار آجائے چھوٹا سا زخم بھی ہو جائے تو میں اس کو سیریس لیتی ہوں۔"

☆☆

ایمن رضا

تماشہ گھر

بیسویں قسط

دن شام کے قالب میں ڈھل رہا تھا اور تعبیر کو ویسا ہی بخار چڑھنے لگا تھا جو بچپن میں ایک بار چڑھا تھا۔ سارا دن وہ ٹھیک رہتی تھی اور شام ہوتے ہی اس کا جسم بخار سے تپنے لگتا تھا۔ اب بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔ لیکن تعبیر جانتی تھی کہ صبح ہونے پر بھی یہ بخار نہیں اُترے گا۔ شام کا یہ بخار ساری زندگی اس کا جسم تپاتا رہے گا۔ اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ اور یہ یقیناً پھٹ جاتا اگر اس کی سانسیں ابھی باقی نہ ہوتیں...... موت کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ ورنہ جسم سے روح تو تب ہی نکل چکی تھی جب کمال نے اس سے کہا تھا کہ وہ اس کی بیوی نہیں بلکہ رکھیل بن کر یہاں اتنے دنوں سے رہ رہی ہے۔ ایک مرد کے کے ساتھ اس نے دو ہفتے ایک چھت تلے بتا دیے تھے۔ یہ جانے بنا کہ وہ اس کے لیے غیر محرم تھا اور وہ اسے اپنا محرم مان کر پیار کرتی رہی تھی۔ چومتی رہی تھی۔ اپنا آپ اس نے اس کے حوالے کر دیا تھا۔ اب اسے خود سے اتنی گھن آ رہی تھی کہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے اوپر تیزاب پھینک کر اپنا سارا جسم جلا ڈالے۔

کمال نے فون پر اس کی بسنا می سے بات کروادی تھی۔ اور اب شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ کمال نے جو کچھ بتایا تھا سب ویسا ہی ہوا تھا۔ نکاح کے لیے گھر میں کوئی اور لڑکا موجود تھا۔ کمال دین حویلی نہیں گیا تھا۔ اور



نکاح اصل میں ہوا تھا یا نہیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ مردوں والے حصے میں تو حویلی کا کوئی فرد موجود ہی نہیں تھا جو وہاں کی بات بتاتا...... سوائے بستامی کے اور رحبانی کے...... اور کوئی بعید نہیں تھی کہ بستامی کے اس عمل میں رحبانی بھی شریک رہا ہو۔ تعبیر نے نکاح کے وقت جن کاغذات پر سائن کیے تھے ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ جب اس کا کوئی دولہا ہی نہیں تھا تو قبولیت والا صفحہ کیا معنی رکھتا تھا۔ اس کا تو خریدار تھا۔ کمال...... جواب اس



کا مالک تھا۔ تعبیر کی حیثیت سے بڑھ کر قیمت دی تھی اس نے اس کی..... اپنا سارا غصہ فون پر اس نے بستامی پر نکالا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ فوراً سے حویلیاں پہنچ کر بستامی کو جان سے مار دیتی۔

''آپ نے میرے ساتھ یہ کیا کیا ہے بستامی بابا.....'' وہ روتے ہوئے چلائی تھی۔

''کیا کیا ہے میں نے تمہارے ساتھ تعبیر.....'' تعبیر کے رونے پر بستامی کچھ ڈرا تھا۔ جان گیا تھا کہ تعبیر کو حقیقت کا علم ہو چکا ہے۔ لیکن خود کو کمزور نہیں ظاہر کرنا چاہتا تھا۔

''آپ نے میرا سودا کیا ہے۔؟''

بستامی خاموش رہا تھا۔ وہ جوڑ توڑ کر رہا تھا کہ وہ کیا کہہ کر تعبیر کو پرسکون کرے۔

''بولیے بستامی بابا..... آپ نے مجھے بیچا ہے۔؟''

''ہاں.....'' اس نے مختصر لفظ میں اعتراف کر لیا تھا۔ اور تعبیر جو کہ کسی حد تک کمال کی بات پر یقین کر چکی تھی بستامی کے اعتراف کر لینے پر ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔ جو تھوڑی بہت شک کی گنجائش تھی وہ بھی ختم ہو گئی تھی۔

''کیوں کیا آپ نے ایسا..... میرے ساتھ ایسا کیوں کیا۔'' دکھ سے بے انت ہو کر روتے ہوئے وہ بمشکل بول پا رہی تھی۔

''حویلی کے معاشی حالات خراب تھے۔ سب تجوریاں خالی ہو چکی تھیں۔ اس لیے مجھے ایسا کرنا پڑا۔''

''تو کیا میری عزت کا سودا کرنے کے بعد حویلی کے حالات بہتر ہو جائیں گے۔؟''

''مجھے جو بہتر لگا میں نے کیا۔''

''اپنے گھر کی لڑکیوں کی عزت کے سودے کون کرتا ہے بستامی بابا.....''

''کوئی ایک قربانی دے دو تو باقی سب کا بھلا ہو جاتا ہے۔ تم نے وہ قربانی دی ہے۔''

''آپ کو احساس ہے کہ آپ نے میرے ساتھ کتنی بڑی زیادتی کی ہے۔''

''کوئی زیادتی نہیں کی ہے میں نے تمہارے ساتھ..... میری جگہ پر خود کو رکھ کر دیکھو..... حویلی کے معاملات دیکھنا آسان نہیں تھا۔ تم سب کو کھلانا پلانا، ہر ضرورت کا خیال رکھنا۔ کہاں سے آتا اتنے پیسہ..... کاروبار میں لگانے کو کچھ بچا نہیں تھا۔ برتن تک بکنے پر آ گئے تھے۔ اور تم کہہ رہی ہو کہ میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے۔ میں نے باقی سب کا بھلا کیا ہے۔''

''امی کو جب پتا چلے گا کہ آپ نے میرے ساتھ یہ کیا ہے تو وہ آپ کو جان سے مار دیں گی۔''

''تمہاری ماں کو تب پتا چلے گا جب اسے کوئی بتائے گا۔''

''آپ کا کیا خیال ہے کہ میں چپ رہوں گی۔''

''تم اپنی ماں سے ملو گی تو اسے کچھ بتاؤ گی نا.....'' بستامی نے کہا تھا۔ تعبیر کا سانس اکھڑنے لگا تھا۔ ''کمال تمہیں کبھی وہاں سے نہیں جانے دے گا۔'' بستامی نے کچھ اتنے ٹھوس لہجے میں کہا تھا کہ تعبیر کو اپنے گرد شکنجہ کستا ہوا محسوس ہوا تھا۔

''میں یہاں مزید ایک لمحہ بھی نہیں رہوں گی۔ اب تو کسی صورت نہیں.....''

''کمال کی اجازت کے بنا تم وہاں سے نہیں نکل سکتی ہو۔ یہ بات ذہن سے نکال دو۔ میری مانو تو حالات کے ساتھ سمجھوتا کر لو..... کمال تمہیں کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دے گا۔ رانیوں کی طرح رکھے گا۔ رونے دھونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ جس ماحول میں ہو لڑکیاں اس کے خواب دیکھتی ہیں۔''

''میں لعنت بھیجتی ہوں اس عیش و آسائش پر.....''

''وہ تمہاری مرضی..... رو کر یا ہنس کر..... تمہیں اب وہاں ہی رہنا ہے۔ یہ بات اچھے سے سمجھ لو تم.....''

بستامی نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ اور وہ اپنا سر تھام کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اس کے اپنوں نے اس کے ساتھ وہ کھیل کھیلا تھا کہ شیطان بھی ایسا کرتے ہوئے ہزار بار سوچے۔ اس کی عزت کا سودا کر دیا گیا تھا۔ اسے نیلام کر دیا گیا تھا۔ ایسا تو شاید کوئی جانوروں کے ساتھ بھی نہیں کرتا ہوگا جیسا بستامی نے اس کے ساتھ کیا تھا۔

درد سے دکھتا اپنا سر تھامے نجانے کتنی دیر تک وہ روتی رہی تھی اور اپنے آپ کو کوستی رہی تھی کہ وہ پیدا ہی کیوں ہوئی اور اگر ہو گئی تھی تو پیدا ہوتے ہی مر کیوں نہیں گئی۔ اور خود کو کوسنے کے انہی لمحوں میں اسے افشین کا خیال آیا تھا۔

"تو کیا افشین کے ساتھ بھی وہی ہوا ہے جو میرے ساتھ ہوا ہے۔" اس نے سوچا تھا اور پھر افشین کی شادی کا منظر یاد کرتے ہوئے اسے احساس ہوا تھا کہ افشین کے ساتھ بھی وہی سب ہوا ہے جو اس کے ساتھ ہو چکا ہے۔ اور افشین بھی اس وقت لاہور کے کسی بڑے گھر میں اپنا سر پکڑ کر رو رہی ہوگی۔ اور افشین کو یاد کرتے ہوئے تعبیر کا دُکھ مزید بڑھ گیا تھا اور وہ مزید شدت سے رونے لگی تھی۔

☆☆☆

کمال غصے میں تھا اور غصے کے عالم میں ہی اس نے روشن بیگم کو فون کیا تھا۔

"آپ نے میرے ساتھ جھوٹ کیوں بولا روشن بیگم......؟"

"کون سا جھوٹ بولا ہے میں نے تمہارے ساتھ کمال......"

"آپ نے کہا تھا کہ صندل آپ کی بیٹی ہے۔"

"تو......؟"

"وہ تو دین حویلی سے ہے۔ بستامی کی رشتے دار ہے۔"

"تو اس میں کیا ہے کمال...... تمہیں اس سے کیا کہ وہ کس کی بیٹی ہے۔ میرا تو کام ہی ایسا ہے۔ سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ سو لڑکیاں میرے انڈر سے ہو کر مختلف شہروں کو گئی ہیں۔ میں سب کو اپنی بیٹیاں ہی تو کہتی تھی۔" روشن بیگم نے کہا تھا۔ کمال چپ ہوا تھا۔ واقعی ہی بھلا اسے اس بات سے کیا سروکار تھا۔

"تعبیر کا بیک گراؤنڈ کیا ہے تمہیں اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ تمہیں بس لڑکی سے مطلب ہونا چاہیے۔"

"آپ لوگوں نے مجھ سے تو چھپایا ہی تھا۔ تعبیر سے بھی سب چھپایا ہے۔ لیکن آپ کو بتا دوں کہ اسے اب سب پتا چل چکا ہے۔"

"اس سے فرق نہیں پڑتا......"

"لیکن مجھے فرق پڑتا ہے روشن بیگم...... میں گھر پر ایسی لڑکی رکھنے کا قائل نہیں جو میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتی......"

"کیا عجیب بات کر رہے ہو کمال تم...... تم تو ایسے بات کر رہے ہو جیسے تم نے اپنی والدہ کو دین حویلی بھیجا تھا۔ تعبیر کے رشتے کے لیے...... اور تمہارا تعبیر سے نکاح ہوا ہے۔ جس کے بعد تم تعبیر کی پسند ناپسند کی بات کر رہے ہو۔ تم شاید بھول رہے ہو کہ تم نے سودے بازی کی تھی۔ نکاح والی بات سے تم خود پیچھے ہوئے تھے۔ رکھیل بنا کر رکھنا چاہتے تھے تم لڑکی کو......"

"جی...... ایسا ہی ہے۔ اپنی کہی ہوئی بات یاد ہے مجھے......"

"پھر جان لو کہ رکھیل کی کوئی مرضی نہیں ہوتی ہے۔"

"لیکن میں کسی کے ساتھ زبردستی نہیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا بچوں والی باتیں کر رہے ہو کمال...... تم نہیں جانتے کہ اس دھندے میں کیا کیا ہوتا ہے۔ لڑکیوں کو

کیسے سیدھا کرنا پڑتا ہے۔ لڑکیاں مرضی سے تھوڑی نا کرتی ہیں یہ کام......راہ راست پر لانا پڑتا ہے۔" روشن بیگم نے توقف کیا تھا۔ "کیا سب جان لینے کے بعد تعبیر نخرے دکھانے لگی ہے۔؟"

"جی......"

"دو دن بھوکا رکھو......خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔"

"اور اگر نہ ہوئی تو......"

"تو اپنے آدمیوں سے کہنا کہ اسے بید کی مار ماریں۔ جس سے وہ گھوڑے کو سدھاتے ہیں۔ جب بید کی مار سے گھوڑے سیکھ جاتے ہیں تو تعبیر کیسے نہیں سیکھے گی۔"

"لیکن میں یہ سب......"

"دیکھو کمال......جو پیسہ تم نے تعبیر کے بدلے میں دیا تھا وہ اب تمہیں واپس نہیں مل سکتا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ تمہارے ساتھ دھوکا ہو گیا ہے۔ بستامی کے معاشی حالات بہت خراب ہیں۔ تب ہی تو اس نے اپنے گھر کی لڑکی کو تمہیں سونپا ہے۔ اب اس سے وہ تمام پیسے خرچ ہو چکے ہیں۔ جو کہ وہ تمہیں کسی طرح نہیں لوٹا سکتا ہے۔ حویلی بھی نہیں بک سکتی ہے۔ کیونکہ وہ بستامی کی بہن چاند کے نام بھی ہے۔ اب جو سودا ہو چکا ہے تمہیں اسی پر گزارہ کرنا ہوگا۔ اور ویسے دیکھا جائے تو تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی کمال......تم نے پیسہ دیا لڑکی تمہارے پاس پہنچا دی گی۔ کیسے پہنچائی وہ ہمارا سر درد ہے۔ اور کیسے تم نے رکھنا ہے وہ اب تمہارا سر درد ہے۔" روشن بیگم نے بات ختم کرنے کے سے انداز میں کہا تھا۔

کمال کو سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کس بات پر اعتراض کرے۔ روشن بیگم ایسی ہی تو گھاگ تھی۔ جانتی تھی کہ کس کو کس طرح اپنے دام میں لینا ہے اور کب چھوڑنا ہے۔

"پھر ابھی اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے تو میں ازالے کے لیے تیار ہوں۔ جب جب حویلیاں آیا کرو گے دل و جان سے تمہاری خدمت کروں گی۔ جس لڑکی پر ہاتھ رکھو گے وہ لڑکی تمہاری ہوگی۔ جب جب مجھے کشمیر بلاؤ گے بنا معاوضے کے مجرا کروایا کروں گی۔"

"ٹھیک ہے روشن بیگم......میں دیکھتا ہوں کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔" کمال نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

"تعبیر بی بی آپ کے کھانے کے لیے کچھ لاؤں۔؟" ملازمہ نے کمرے میں آ کر اس سے پوچھا تھا۔ آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے انکار میں سر ہلا دیا تھا۔

"آپ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہوا ہے۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"صاحب نے کہا ہے کہ آپ کو کچھ کھلا دوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ٹھہر کر بتا دوں گی کہ مجھے کیا کھانا ہے۔" ملازمہ کو ٹالنے کے لیے اس نے کہہ دیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ تب تک آپ نہا دھو کر تیار ہو جائیں۔" ملازمہ نے کہا تھا۔

تعبیر نے اچنبھے سے اس کو دیکھا تھا۔

"صاحب نے کہا ہے کہ وہ رات میں آپ سے ملیں گے۔" ملازمہ نے بتایا تھا۔

تعبیر کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ یہ ملازمہ کیا کہہ رہی تھی۔ جو وہ کہہ رہی تھی تعبیر اس کا مطلب بخوبی سمجھ رہی تھی۔ نکاح نہ ہونے والی بات تعبیر کے لیے نئی تھی۔ کمال کے لیے تو وہ اب بھی وہی حیثیت رکھتی تھی جو پہلے رکھتی تھی۔

"مجھے ان سے نہیں ملنا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں جا کر کہہ دیتی ہوں۔ لیکن ابھی مجھے وہی کرنا ہے جو انہوں نے کہا ہے۔" ملازمہ کہہ کر

بیڈ کی چادر بدلنے لگی تھی۔

"یہ کیا کر رہی ہو تم......؟"

"آپ کے اور صاحب کے لیے بیڈ تیار کر رہی ہوں۔"

"دفع ہو جاؤ یہاں سے تم......" اس نے چلا کر کہا تھا۔ ملازمہ اس کی شکل دیکھنے لگی تھی۔ یہ ایک ہی دن میں تعبیر کو کیا ہو گیا تھا۔

"میں نے کہا یہاں سے جاؤ تم......" وہ بلند آواز میں چلائی تھی۔

ملازمہ چپ چاپ کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ لاک کر لیا تھا۔ اوپر کی کنڈی بھی لگائی تھی۔ وہ کسی صورت اب کمال کو اس کمرے میں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی تسلی نہ ہوئی تو نے صوفہ کھسکا کر دروازے کے ساتھ لگا لیا تھا۔

تعبیر بے چاری نہیں جانتی تھی کہ اب وہ چاہے جو مرضی کر لے کمال کے ہاتھوں اس کی بے حرمتی لکھی جا چکی تھی۔

☆☆☆

بسطامی اپنے کمرے میں موجود تھا۔ اور حسب معمول اپنا من پسند کھیل کھیل رہا تھا۔ ٹیبل پر تاش کے پتوں کو تکون شیپ دے کر ایک دوسرے کے اوپر رکھتے ہوئے وہ اس تکون کی اونچائی بڑھاتا جا رہا تھا۔ کافی عرصے ہوا اسے یہ کھیل کھیلتے ہوئے لیکن وہ آج تک روشن بیگم جتنا ماہر نہیں ہو سکا تھا۔ آخری آنچ کی کسر رہ جاتی تھی۔ لیکن آج لگتا تھا کہ وہ یہ کھیل مکمل کر لے گا۔ اسی لیے اس نے تاش کا چوتھا پیکٹ بھی کھول لیا تھا۔

"تاش گھر" بناتے ہوئے بسطامی ایک گہری سوچ میں بھی گم تھا۔ اس سوچ کے سرے تین چار لوگوں سے ملتے تھے۔ تعبیر سے، کمال سے، زہرہ پھوپھو سے، گھر کی باقی لڑکیوں سے اور خالی ہوتی تجوریوں سے...... ذرا سی غفلت سارا بنا بنایا کھیل بگاڑ سکتی تھی۔ اور اسے یہ کھیل کسی قیمت پر نہیں خراب ہونے دینا تھا۔ وہ پتے کے اوپر پتا رکھتا جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ایسا کیا کرے کہ سارے سرے اس کے ہاتھوں میں رہیں۔ اور جب وہ آخری پتے کو سب سے اوپر رکھ رہا تھا تو جیسے اس کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا تھا۔ دو کام بیک وقت مکمل ہوئے تھے۔ ایک تاش گھر اور ایک اس کی الجھن......

فخر سے وہ بڑی دیر تک مکمل ہو چکے تاش گھر کو دیکھتا رہا تھا۔

"سلطان......سلطان......" بسطامی نے اپنے خاص ملازم کو آواز دی تھی۔ سلطان اگلے ہی لمحے وہاں آیا تھا۔

"جی مالک؟"

"گھر کا فون کٹوا دو...... نیا نمبر لینا ہے۔"

"جی بہتر...... لیکن اس میں کچھ دن لگ جائیں گے۔"

"تب تک اس نمبر کی لائن کاٹ دو...... باہر جاؤ اور فون کی تار کاٹ دو...... لیکن دھیان سے...... کسی کو خبر نہ ہو۔"

"ہرگز نہیں ہوگی۔"

"اور زہرہ پھوپھو کو میرے پاس بھیجو......"

"جی...... میں کہہ دیتا ہوں۔" سلطان کہہ کر باہر گیا تھا۔

بسطامی لفظوں کی جوڑ توڑ کرنے لگا تھا کہ اسے زہرہ پھوپھو سے کیا کہنا ہے۔ آگے کے لیے اس کی کیا پلاننگ تھی اس کو لے کر اس کا ذہن صاف تھا۔ لیکن زہرہ پھوپھو اور [illegible] رہا تھا کہ نجانے کیا ہو جائے۔ وہ سب کو قابو میں [illegible] کارڈس اسے کچھ خوف زدہ کر [illegible] رہا ہو جانتا تھا۔ لیکن اس [illegible] بات کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ بسطامی کی

بات سن لینے کے بعد وہ سب پرسکون رہیں گے۔ وہ بھڑک بھی سکتے تھے۔

چند لمحوں کے بعد زہرہ پھوپھو وہاں آئی تھیں۔

"کیا بات ہے بستامی..... کیوں بلوایا ہے۔" کمرے میں داخل ہوتے ہوئے زہرہ پھوپھو نے پوچھا تھا۔ ان کے سامنے کرسی پر بیٹھا بستامی اپنا سر تھامے ہوئے تھا۔ زہرہ پھوپھو کی آمد اور سوال پر بھی اس نے سر نہیں اٹھایا تھا۔ اگرچہ تعبیر کی شادی کے بعد سے زہرہ پھوپھو بستامی سے ناراض تھیں لیکن بستامی کی موجودہ حالت انہیں تشویش میں مبتلا کر گئی تھی اور وہ ساری ناراضی بھول گئی تھیں۔

"کیا بات ہے بستامی.....؟ تم ٹھیک تو ہو؟ کیا تمہارے سر میں درد ہو رہا ہے۔؟"

"میں تو ٹھیک ہوں پھوپھو..... لیکن جو خبر میرے پاس ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔" سر اٹھاتے ہوئے بستامی نے کچھ ہمدردی والا انداز اپناتے ہوئے کہا تھا۔ زہرہ پھوپھو کچھ سمجھی تو نہیں تھیں لیکن سہم ضرور گئی تھیں۔

"کیا بات ہے بستامی..... سب خیر تو ہے نا....."

"خیریت نہیں ہے پھوپھو..... آپ کو تحمل سے سننا ہوگا۔"

"جو بات ہے بتادو بستامی....." انہوں نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ ان کا دل ہولنے لگا تھا۔ کہیں تعبیر کو تو کچھ نہیں ہو گیا۔ بستامی اُٹھ کر ان کے پاس آیا تھا۔

"تعبیر کے شوہر کا فون آیا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ تعبیر سیڑھیوں سے گر گئی ہے۔"

"کیا....." زہرہ پھوپھو نے چیخ ماردی تھی۔

"جی..... اس کی حالت تشویش ناک ہے۔ اور وہاں کے راستے بھی بند ہیں۔ پھر بھی وہ کہہ رہا ہے کہ وہ وہاں ڈاکٹر کو بلانے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"تم ابھی چلو بستامی میرے ساتھ..... فوراً سے جانے کی تیاری کرو....."

"ہم وہاں نہیں جاسکتے ہیں زہرہ پھوپھو....."

"کیوں..... کیوں نہیں جاسکتے ہیں۔"

"راستے جگہ جگہ سے بند ہیں۔ ہمارا وہاں پہنچنا ناممکن ہے۔ ہمیں گھر پر بیٹھ کر دعا کرنی چاہیے۔"

"لیکن میں اس وقت میں اپنی بیٹی سے ملنا چاہتی ہوں۔ بستامی کچھ کرو..... نہیں تو میں مر جاؤں گی۔ میں فوراً وہاں جانا چاہتی ہوں۔" زہرہ پھوپھو تو بس بے ہوش ہو جانے کے قریب تھیں۔

"زہرہ پھوپھو..... سنبھالیں خود کو....." بستامی نے آگے بڑھ کر بے ہوش ہوتی زہرہ پھوپھو کو اپنی بانہوں کا سہارا دیا تھا۔ "چاند..... تہمینہ پھوپھو..... کہاں ہو سب....." بستامی نے باہر کو منہ کر کے آوازیں دی تھیں۔

لمحوں میں سب وہاں اکٹھے ہوئے گئے تھے۔

وہ شام حویلی والوں کے لیے بہت اذیت ناک تھی۔ تعبیر کی طرف سے ملنے والی خبر نے سب کو بے حال کیا ہوا تھا۔ پھر ستم یہ کہ وہ تعبیر سے ملنے بھی نہیں جاسکتے تھے۔ بستامی کا کہنا ٹھیک تھا۔ وہاں جانے والے راستے بند تھے۔ وہاں جانا خود کو خوار کرنے کے مترادف تھا۔ لیکن زہرہ پھوپھو یہ بات سمجھ نہیں رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر اپنی بیٹی کے پاس پہنچ جائیں۔ شام ہونے تک انہوں نے خود کو تیز بخار چڑھا لیا تھا۔ سخت سردی میں چاند ان کے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں رکھ رہی تھی۔ باقی لڑکیاں ان کے ہاتھ پاؤں دبا رہی تھیں۔ تہمینہ اور شلیلہ پھوپھو انہیں تسلیاں دے رہی تھیں۔ اور حاجی بوا، زہرہ پھوپھو کے لیے کچھ کھانے کو بنا رہی تھیں۔

"حوصلہ رکھو زہرہ..... کچھ نہیں ہوگا ہماری تعبیر کو..... اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" تہمینہ پھوپھو نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

"مجھے میری بچی کے پاس جانا ہے۔" بخار میں تپتی زہرہ پھوپھو بس یہی بات کہتی جارہی تھیں۔
"نہیں جاسکتے زہرہ...... رحبانی نے پتا کروایا ہے۔راستے بند ہیں۔پیدل تک جانے کی گنجائش نہیں ہے۔ تم اپنی بچی کے لیے دعا کرو......"

شکیلہ پھوپھو بھی پریشان تھیں۔لیکن کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔تعبیر کے پاس نہیں جایا جاسکتا تھا۔زہرہ کو صرف دلاسا ہی دیا جاسکتا تھا۔لیکن کسی دلاسے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہورہا تھا۔دعا ان سے ہو نہیں رہی تھی۔وہ تو بس بخار میں تپ رہی تھیں اور اس ٹھنڈے پانی میں جو ماتھے پر رکھی پٹی میں سے رستہ ہوا ان کے چہرے پر پھیل رہا تھا،اپنے کتنے ہی آنسو ملا رہی تھیں۔

"میں زہرہ کے لیے دلیہ بنا کر لائی ہوں۔" حاجی بوا ہاتھ میں کٹورا لیے وہاں آئی تھیں۔
"میرا کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔" زہرہ پھوپھو نے انکار میں سر ہلایا تھا۔
"بیمار رہنے سے کیا ہوگا۔تمہیں تو ہمت کرنا ہوگی اب...... آج نہ سہی،لیکن ایک دو دن میں کسی نہ کسی طرح تو وہاں جانا ہی ہوگا۔"
"کچھ تھوڑا بہت کھالے میری بچی......" حاجی بوا پیار سے منت کرنے لگی تھیں۔
"لڑکیوں...... تم ایسا کرو کہ وضو کرکے دو نفل پڑھ کر اپنی کزن کی صحت یابی کے لیے دعا کرو...... اللہ تعبیر کو شفا دے گا ان شاء اللہ......" تہمینہ پھوپھو نے سب کو کہا تھا۔
لڑکیاں فوراً سے اپنی اپنی جگہ سے اٹھیں اور وضو کرنے کے لیے کمرے سے باہر جانے لگی ہی تھیں تب ہی کمرے کے دروازے پر بستامی ظاہر ہوا تھا۔
"کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔" بستامی نے اداس صورت لیے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔
سب نے چونک کر بستامی کو دیکھا تھا۔زہرہ پھوپھو نے بھی سر اٹھا کر بستامی کو دیکھا تھا۔بستامی کے لہجے سے نجانے کیوں سب کو کچھ انہونی ہوجانے کی بو محسوس ہوئی تھی۔
"کشمیر سے فون آیا ہے۔تعبیر اب اس دنیا میں نہیں رہی......" ہچکی بھر کر روتے ہوئے بستامی نے کہا تھا۔اور حاجی بوا کے ہاتھ میں موجود دلیہ سے بھرا پیالہ چھوٹ کر فرش پر جا گرا تھا۔
اس شام کی رات کے ساتھ ایک گرہن بھی حویلی پر اتر آیا تھا۔جو کبھی تحلیل نہیں ہونے والا تھا۔

☆☆☆

"تعبیر! دروازہ کھولو......" کمال نے پہلے تو دروازے پر دستک دی تھی۔لیکن جب دروازہ نہیں کھلا تھا اور اندر سے کوئی جواب بھی نہیں آیا تھا تو وہ تعبیر کو پکارنے لگا تھا۔
"تعبیر...... تم دروازہ کیوں نہیں کھول رہی ہو۔"
"میں دروازہ نہیں کھولوں گی کمال......" اندر ہی کھڑی تعبیر نے اونچی آواز میں کہا تھا۔
"کیوں...... کیوں دروازہ نہیں کھولو گی تم......"
"آپ کا اور میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔"
تعبیر کی بات پر کمال کو غصہ تو بہت آیا تھا۔لیکن چونکہ تعبیر انہیں پہلی بار نخرہ دکھا رہی تھی تو اس لیے وہ برداشت کرگیا۔
"تم شاید بھول رہی ہو کہ میں تمہارا مالک ہوں۔خریدا ہے میں نے تمہیں......"
"مجھے میرے گھر جانا ہے۔وہاں جاکر میں آپ کو آپ کی رقم ادا کردوں گی۔"
"تمہاری حویلی بھی بک گئی،تو میری رقم ادا نہیں ہوسکتی ہے۔"

"میری والدہ کچھ بھی کر کے آپ کو رقم واپس کر دیں گی۔"

"تم یہاں سے کہیں نہیں جا سکتی ہو تعبیر......"

"پھر میں اس کمرے کے اندر ہی مرجانا پسند کروں گی۔ لیکن آپ کو اندر نہیں آنے دوں گی۔" تعبیر نے کہا تھا۔ جس سے کمال کو مزید غصہ آیا تھا۔

"آخری بار پوچھ رہا ہوں۔ تم دروازہ کھولو گی یا نہیں......"

"ہرگز نہیں......" تعبیر کا انداز اٹل تھا۔ اور کمال جانتا تھا کہ اسے کیسے ٹھیک کرنا ہے۔

"گل خان...... گل خان......" اس نے غصے سے ملازم کو آواز دے تھی۔

"جی صاحب......" ایک ہٹا کٹا ملازم وہاں آیا تھا۔

"رحمت خان کو بھی بلا لو...... اور یہ دروازہ کھولو...... چاہے اسے توڑنا ہی کیوں نہ پڑے۔" کمال نے کہا تھا اور اس کی آواز بند کمرے کے اندر کھڑی تعبیر نے بھی سن لی تھی اور کانپ کر رہ گئی تھی۔

"جی مالک......" گل خان باہر گیا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ واپس آیا تھا تو اس کے ساتھ رحمت خان تھا اور دروازہ کو کھولنے کے لیے ایک اوزار...... چند لمحے تک وہ دروازے کی تالے والی جگہ پر کچھ کرتا رہا تھا۔ تالا شاید کھل گیا تھا لیکن اندر سے لگی ہوئی اوپری چٹخنی دروازے کو کھولنے میں حائل تھی۔ ہٹے کٹے گل خان نے ایک زور دار لات دروازے کو رسید کی تھی اور دروازہ جھٹکا کھا کر کھل گیا تھا۔

سامنے تعبیر کھڑی تھی۔ ہاتھ میں دھاتی گلدان تھامے ہوئے۔ انداز ایسا تھا کہ میرے پاس کسی نے آنے کی ہمت کی تو میں اسے یہ گلدان دے ماروں گی۔

"میرے قریب مت آیئے گا کمال...... میں بتا رہی ہوں۔ میں کچھ بھی کرنے سے پہلے ایک لمحہ نہیں سوچوں گی۔"

دھاتی گلدان کو اپنے دفاع میں پکڑے تعبیر نے خوں خوار لہجے میں کہا تھا۔ لیکن چونکہ کبھی تعبیر کو ایسی صورت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا تو اسی باعث اس کی دھمکی کھوکھلی تھی۔ اس کا دفاع کافی کمزور تھا۔ کمال چاہتا تو آگے بڑھ کر فوراً سے تعبیر کو دبوچ سکتا تھا۔ اسی لیے تعبیر کی دھمکی پر وہ مسکرا کر رہ گیا تھا۔ یہ لڑکی جو اتنے دنوں کے بعد اپنا نیا روپ دکھا رہی تھی تو نجانے کیوں کمال کو یہ روپ اچھا لگا تھا۔ روشن بیگم نے ٹھیک کہا تھا کہ یہ معاملات آسان نہیں ہوتے۔ اور ان معاملات کی مشکلات ہی تو مردوں کو مزا دیتی ہیں۔

"تمہارے پاس دو اختیار ہیں۔ آج کی رات کمرے میں تم اور میں...... یا پھر دونوں ملازم اور تم......" کمال نے کہا تھا اور تعبیر نے شدید ترین حیرت سے کمال کو دیکھا تھا۔ اتنی گھٹیا بات کیسے کہہ دی تھی کمال نے......

"جلدی سے جواب دو مجھے......" وہ پوچھ رہا تھا اور تعبیر بھونچکی کھڑی اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔ دھاتی گلدان پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ کمال کی بات نے تو جیسے اس کے جسم سے روح ہی چھین لی تھی۔ اس نے کیسے سمجھ لیا تھا کہ کمال اس کے ساتھ خاندانی پن کا مظاہرہ کرے گا۔ اس نے اسے خریدا تھا۔ منہ مانگی قیمت دی تھی اس نے اس کے مالکوں کو...... وہ اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ وہ اس کی بیوی نہیں تھی جو اسے عزت دیتا، غیرت کا مسئلہ بناتا۔ تعبیر کے حصے میں صرف ہار لکھی تھی۔ اسے سمجھ جانا چاہیے تھا۔

"ٹھیک ہے۔ تم پیار کی زبان نہیں سمجھنے والیں...... گل خان اور رحمت خان...... اس لڑکی کی عقل ٹھکانے آ جائے تو بتا دینا۔ میں ساتھ والے کمرے میں ہوں۔" کمال کہہ کر کمرے سے باہر جانے لگا تھا۔

"نہیں......" تعبیر نے چیخ ماری تھی۔ کمال رُکا تھا۔ اس نے چند لمحے تک تعبیر کو دیکھا تھا۔ بے بسی سے جس کے آنسو رواں تھے اور دھاتی گلدان خود بخود اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گرا تھا۔

"تم دونوں جاؤ...... لگتا ہے کہ لڑکی کو عقل آ گئی ہے۔" کمال نے ملازموں سے کہا تو وہ باہر چلے گئے تھے۔ کمال نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ تعبیر کے لیے وہ رات قیامت کی رات ثابت ہونے والی تھی۔

☆☆☆

"کیا...... کیا سچ میں......؟" بستامی سے ساری بات سن لینے کے بعد روشن بیگم نے ایک قہقہہ بلند کیا تھا اور پھر ہنسنے لگی تھیں۔ بستامی نے اثبات میں سر ہلایا تو ان کی ہنسی مزید بڑھ گئی۔

"یہ خیال آیا کیسے تمہارے دل میں......"

"آپ کے ساتھ رہتے رہتے بہت کچھ سیکھ چکا ہوں۔"

"یہ تو ہے۔ کافی سمجھدار ہو چکے ہو تم......" روشن بیگم کی ہنسی کچھ تھمی تو انہوں نے پاس پڑے چھوٹے سے ٹیبل کو قریب سرکا لیا تھا۔ جس پر جام اور جام کا پانی دونوں ہی موجود تھے۔ وہ اپنے اور بستامی کے لیے جام بھرنے لگی تھیں۔ "ویسے مجھے تم سے اتنی سمجھداری کی اُمید نہیں تھی۔" روشن بیگم نے ایک گلاس بستامی کو دیا تھا۔ اور ایک خود ہاتھ میں پکڑے گھونٹ پر گھونٹ بھرنے لگی تھیں۔

"میں نے کمال سے کہہ دیا ہے کہ اب وہ جانے اور تعبیر جانے...... اس نے کیسے تعبیر کو ہینڈل کرنا ہے یہ اس کا مسئلہ ہے۔ تاہم یہ تاکید میں نے کر دی ہے کہ وہ مر کر بھی تعبیر کو ادھر کا رخ نہ کرنے دے۔ اور وہ کرنے دے گا بھی نہیں...... تو اب جب بھی تعبیر نے اپنی ماں سے ملنا ہی نہیں تو بہتر کیا کہ تم نے اسے مار دیا۔ اس طرح اس کی ماں کو قرار آ جائے گا۔"

"اسی لیے تو میں نے یہ سب کیا ہے۔ دوسرا تعبیر سب جان چکی تھی۔ اگر وہ حویلی واپس آ کر سب کو سچائی بتا دیتی تو میرے لیے مسئلہ ہوتا......"

"بہت روئی ہوں گی تمہاری زہرہ پھوپھو......"

"ہاں...... کافی بیمار ہو چکی ہیں وہ...... چند دنوں میں ہی انہوں نے اپنا برا حال کر لیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں...... بیٹی کی موت پر کون سی ماں نہیں روتی...... کسی کی موت پر صبر کرنا ویسے بھی آسان کام نہیں ہوتا۔ تم فکر مت کرو۔ چند دنوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کشمیر جانے کی بات تو نہیں کی انہوں نے......"

"کی تھی۔ لیکن میں نے کہا کہ راستے بند ہیں۔ جتنے دن میں ہم پہنچیں گے تب تک میت کو رکھنا ٹھیک نہیں......"

"ہمم...... میں تو کہتی ہوں کہ اب باقی لڑکیوں کو بھی جلدی ان کے گھر بھیجنے والی کرو...... اس کام میں دیر مت کرو۔"

"جی...... بالکل دیر نہیں کرنی......"

"میں چاہ رہی تھی کہ اگر تم انہیں کسی طرح میرے پاس لے آؤ تو میں ان کے حسن کو نکھار دوں۔"

"یہ ناممکن ہے۔ چاند بھی بھی لڑکیوں کو آپ کے پاس نہیں آنے دے گی۔" بستامی نے فوراً سے انکار کر دیا تھا۔ روشن بیگم کو اسی بات کی توقع تھی۔ وہ کچھ اور سوچ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ادھ بھرے جام کو انہوں نے ایک طرف رکھ دیا تھا۔ اب وہ بستامی سے بہت ہی اہم بات کرنے والی تھیں۔

"پھر ایک اور حل ہے میرے پاس......"

"کیا......؟"

"تم کومل سے شادی کر لو۔" روشن بیگم نے کچھ ناپ تول سے کام لیتے ہوئے کہا تھا۔

"اس سے کیا ہو گا۔؟"

"کومل تمہاری بیوی بن کر تمہاری حویلی میں چلی جائے گی۔ وہ ان لڑکیوں کے ساتھ رہے گی۔ ان کی تراش

خراش کرے گی۔" روشن بیگم کی بات پر بسطامی خاموش ہو گیا تھا۔ اس نے کبھی شادی کرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ شادی اس کے لیے ایک غیر اہم چیز بن چکی تھی۔ اور پھر اپنی بیوی کے روپ میں کومل کو دیکھنا اس کے لیے بالکل نئی بات تھی۔ لیکن روشن بیگم کی بات اسے بری بھی نہیں لگی تھی۔ وہ گناہ کی دلدل میں اس بری طرح سے گر گیا تھا کہ اب درست اور غلط میں فرق کرنا بھول گیا تھا۔ روشن بیگم نہ بھی کہتیں تو شادی کے متعلق وہ جب بھی سوچتا تو اس کے ذہن میں لڑکی کو لے کر کوئی سوچ نہیں تھی۔ وہ کیسی بیوی چاہتا تھا وہ نہیں جانتا تھا۔ یا شاید وہ جب بھی اپنی شریک حیات کا تصور کرتا تب تب کومل کے بارے میں ہی سوچتا۔

"اب شکیلہ پھوپھو کی بیٹی زارا کو ہی دیکھ لو...... کتنی موٹی ہے وہ...... اس پر تو بہت اچھے سے کام ہونے والا ہے۔ کرن بھی تراشی جائے گی تو زیادہ نکھر جائے گی۔ تم کومل کو اپنے گھر رکھو گے تو یہ سب وہ خود ہی دیکھ لے گی۔ لڑکیوں کی چال ڈھال سمیت ہر چیز پر محنت کرے گی۔ اور اس طرح کرے گی کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہو سکے گی۔ جو بات صندل میں تھی وہ تو کسی میں نہیں ہو سکتی...... لیکن اگر حسن کو نکھارا جائے تو اچھے دام مل سکتے ہیں۔"

"کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔"

"تمہارے ساتھ کوئی زبردستی نہیں...... تمہارے بھلے کے لیے ہی کہہ رہی ہوں۔ تم اچھے سے سوچ لو...... پھر مجھے جواب دینا......"

"سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کومل سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔" بسطامی نے رضامندی دے دی تھی۔ کومل بیگم دل سے مسکرائی تھیں۔

"جیتے رہو...... اللہ تم دونوں کو تا زندگی ساتھ رکھے اور ہزاروں خوشیاں دکھائے۔"

روشن بیگم نے جس قدر دل سے دعا دی تھی اس سے ہزار گنا زیادہ وہ خوش تھیں۔ کومل کی ساری زندگی انہوں نے محفوظ کر دی تھی۔ اب بس ایمن کی بات تھی۔ اس کی شادی بھی رحبانی سے ہو جائے تو ان کی فکریں کچھ کم ہوں۔ مناسب موقع دیکھ کر وہ رحبانی سے بھی بات کرنا چاہتی تھی۔ مرنے سے پہلے وہ یہ کام بھی کرنا چاہتی تھیں۔ زندگی دھوکے باز چیز ہے۔ اور اس سے بھی بڑی قباحت کہ یہ دھوکا دینے سے پہلے انتباہ نہیں کرتی ہے۔ وہ اب جلد سے جلد ان کاموں کو سمیٹ لینا چاہتی تھیں۔ ان کے جسم نے ان کو الارم دینا شروع کر دیا تھا کہ وہ دن بدن بڑھاپے کی طرف جا رہی ہیں۔ اور بڑھاپے کے بعد جوانی نہیں آتی ہے۔ بلکہ صرف موت آتی ہے۔

☆☆☆

صندل نے میرزاد سے کہا تھا کہ وہ اس بار شہر جائے تو اس کے لیے پازیبیں لائے۔ اس کو کسی چیز کی طلب نہیں تھی۔ لیکن پازیبیں اسے اچھی لگتی تھیں۔ چاند امی نے بتایا تھا کہ ان کے وقتوں میں ہر لڑکی شادی کے بعد پازیبیں ضرور پہنا کرتی تھی۔ اس طرح نئی نویلی دلہن کے چلتے پھرتے وقت گھر میں رونق کا احساس ہوتا تھا۔ شادی کو لے کر اس کا اور تو کوئی شوق پورا ہی نہیں ہو سکا تھا۔ بہت سے دن تو خوف اور پریشانی میں گزر گئے تھے۔ پھر گھر کو ترتیب دیتے اور چیزیں سیکھتے ہوئے کتنا بہت سا وقت گزر گیا۔ پھر ریسٹورنٹ کو کھولتے اس کام میں ماہر ہوتے میں بہت وقت لگا۔ لیکن اب حالات کچھ بہتر تھے۔ کم ہی سہی لیکن آمدن ہو رہی تھی۔ کام کی چال کو وہ دونوں سمجھ گئے تھے اور اس سیر سبز حصے میں ایک پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ اس لیے اس نے ایک عرصے کے بعد میرزاد سے کوئی فرمائش کی تھی۔

"میں تمہیں سونے کی پازیبیں لا دوں گا میری جان......" اس نے پیار سے کہا تھا۔ صندل مسکرانے لگی تھی۔

"فی الحال چاندی کی لے آنا...... جب مزید پیسہ اکٹھا ہو جائے گا تو سونے کی بھی لے لیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔"

اور اب میرزاد ایبٹ آباد کے بازار میں چاندی کی پازیبیں ہی تلاش کر رہا تھا۔ جو کہ اسے جلد ہی مل گئی تھیں۔ باقی کا سامان بھی جو جو اسے درکار تھا اس نے جلد ہی لے لیا تھا۔ صندل کی پازیبیں لینے کے بعد اس کا باقی کی خریداری میں دل ہی نہیں لگ تھا۔ جلدی جلدی اس نے باقی کی چیزیں لی تھیں اور بس میں بیٹھ گیا تھا۔ ایبٹ آباد سے ٹھنڈیانی کا سفر گھنٹے بھر سے کچھ زیادہ کا تھا۔ جلد ہی بس نے اسے اس کے مطلوبہ اسٹاپ پر اتار دیا تھا۔

"صندل...... صندل......" گھر کا دروازہ چابی سے کھولنے کے بعد وہ اندر آ گیا تھا اور صندل کو پکارنے لگا تھا۔ صندل کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

"صندل...... کہاں ہو تم......" میرزاد بیڈ روم میں آیا تھا۔ اور بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی وہ چونکا تھا۔ صندل تو وہاں نہیں تھی لیکن سارا کمرا پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ سارے فرش اور بیڈ پر پھول بکھیرے گئے تھے۔ اور سائیڈ ٹیبل پر گلدانوں میں پھول سجائے گئے تھے۔ میرزاد حیرت سے سب دیکھ رہا تھا۔

"کیسا لگا سب......؟" وہ اس کے پیچھے آ کر کھڑی ہوئی تھی۔

"تمہاری طرح حسین......" اس نے اپنی بانہوں میں بھر لینا چاہا تھا جب صندل نے اس کے ہاتھ روکے تھے۔

"تمہیں اب احتیاط کرنا ہوگی میر......" اس نے شرماتے ہوئے کہا تھا۔

"کیوں...... کیا ہوا ہے......؟" وہ کچھ نہیں سمجھا تھا۔ بتایا صندل سے بھی نہیں جا رہا تھا۔

"کیا بات ہے۔ بولو......"

صندل نے اپنا منہ میر کے کان کے قریب کیا تھا۔ اور پھر پیار بھری سرگوشی کی تھی۔

"تم باپ بننے والے ہو۔"

"کیا......" میرزاد کا چہرہ کھل اُٹھا تھا۔ وہ بے یقینی سے صندل کو دیکھ رہا تھا۔ صندل نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اور پھر اگلے ہی پل میرزاد نے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا۔ اور وہ ہنستے ہوئے اسے بس روکنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

☆☆☆

"پیاری چاند امی......

اُمید کرتی ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گی۔

آپ کو لکھے جانے والے بہت سے خطوط میں سے یہ سب سے اہم خط ہے۔ کیونکہ اس خط میں، میں آپ کو بہت ہی خاص بات بتانا چاہتی ہوں۔ کاش کہ آپ اس وقت میرے پاس ہوتیں اور میرے بتانے سے پہلے ہی سب خود سمجھ جاتیں...... لیکن جو خدا کو منظور...... آپ خود ہی تو کہتی ہیں کہ اللہ کی ترتیب پر شکوہ نہیں کرنا چاہیے۔ وقت کی یہ ترتیب یقیناً خدا کی طرف سے طے ہے۔ ہمارے درمیان رابطے کا یہ جو ذریعہ ہیں ارشادی بابا...... یہ بھی کسی نعمت سے کم نہیں ہیں۔ خیر بات کچھ یوں ہیں کہ آپ کی بیٹی صندل اُمید سے ہے۔ اور بہت جلد ہی ایک ننھی جان کو جنم دینے والی ہے۔"

"اللہ......" رقت جذبات سے مغلوب ہو کر چاند نے خط کو سینے سے لگا لیا تھا۔ خوشی کی خبر نے اسے نہال ہی تو کر دیا تھا۔ اس نے خط کو ایسے خود میں بھینچا ہوا تھا جیسے صندل کو اپنی بانہوں میں بھرا ہو۔ شکر گزاری کے آنسو اس کی آنکھوں سے چھلکنے لگے تھے۔ پھر آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے باقی کا خط پڑھنا شروع کیا تھا۔

"آپ نے میرے لیے بالکل بھی پریشان نہیں ہونا ہے۔ میرزاد میرا اس طرح ہی خیال رکھ رہا ہے جیسے آپ یہاں ہوتیں تو رکھتیں...... خود میری صحت بھی اچھی ہے۔ علاقے کی دایہ نے کہا ہے کہ کسی طرح کی کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ پیدائش تک کا وقت بہت اچھا گزر جائے گا۔ ان دنوں میر مجھے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہتا ہے۔ آپ کی یاد آنے پر اداس ہوتی ہوں تو وہ مجھے ہنسانے لگتا ہے۔ دایہ نے کچھ دیسی خوراکیں کھانے کو کہا ہے۔ جو کہ مجھے بنانی نہیں آتیں...... اگر آپ جوابی خط کے ساتھ ارشادی بابا کو وہ سب بھی دے دیں تو مہربانی ہوگی۔ اس طرح آپ سے ملاقات نہ سہی...... لیکن آپ کے ہاتھوں کی خوشبو مجھ تک پہنچ جائے گی۔ خدا نے چاہا تو جلد ہی ملاقات ہوگی۔

آپ کی پیاری بیٹی۔

"صندل"

"چاند......" بستامی نے دُور سے چاند کو پکارا تھا۔ چاند نے جلدی سے خط کو اپنے پیچھے چھپالیا تھا۔

"ہاں...... کیا بات ہے بستامی......"

"تم کیا چھپا رہی ہو......؟"

"نہیں...... کچھ بھی تو نہیں...... تم بولو......" چاند نے جلد سے اپنے چہرے کے تاثرات کو نارمل کیا تھا۔ بستامی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔

"تم سے ایک خاص بات کرنی ہے۔"

"کرو...... میں سن رہی ہوں۔"

"میں اب شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا سچ میں......؟" چاند نے خوش گوار حیرت سے کہا تھا۔

"ہاں...... مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اب مجھے شادی کر لینی چاہیے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے بستامی...... تم کہو تو تمہارے لیے کوئی رشتہ دیکھوں۔"

"نہیں...... اس کی ضرورت نہیں ہے۔ لڑکی میں تلاش کر چکا ہوں۔"

"کومل......" چاند نے کہا تھا اور کہتے ہوئے اس کا لہجہ نا چاہتے ہوئے بھی کچھ بجھا ہوا تھا۔ بستامی نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ اور بستامی کے اثبات میں سر ہلا دینے کے بعد چاند مزید بجھ گئی تھی۔

"میں جانتا ہوں کہ تمہیں کومل پسند نہیں ہے۔ لیکن عمر کا ایک لمبا عرصہ میں نے اسی کے ساتھ گزار دیا ہے۔ اب کسی اور کے ساتھ نہیں رہ پاؤں گا۔ کوئی اور لڑکی میری زندگی میں آ گئی تو میرے ساتھ ساتھ اسے بھی مشکل ہوگی۔"

"مجھے کومل پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے بستامی...... بس اس کے خاندان پر ہے۔ لیکن تم اپنی زندگی کے خود مالک ہو۔ میں تمہیں منع کرنے والی کون ہوتی ہوں۔ تم نے بھی تو مجھے رحمان سے شادی کے لیے کتنا راضی کیا تھا۔ لیکن میں نے تمہاری بات نہیں مانی تھی۔ اب تم پر اپنی مرضی کیسے مسلط کر سکتی ہوں۔ تم کومل سے شادی کرنا چاہتے ہو تو کر لو...... میں وعدہ کرتی ہوں کہ اسے بہن بنا کر رکھوں گی۔ اسے مجھ سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔"

"مجھے اندازہ تھا کہ تم ایسی ہی بات کرو گی۔"

"کب تک ہے تمہارا شادی کا ارادہ......"

"اگلے ہفتے تک......"

"کم از کم دو ہفتے تو دو بستامی...... ایک ہی تو بھائی ہو تم میرے...... بہت ارمان ہیں میرے دل میں......

پھوپھو اور لڑکیوں نے بھی تیاری کرنی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ کومل کا لباس گھر پر تیار ہو۔ بہت اچھا لباس تیار کرواؤں گی میں اس کا...... اسے بہت پسند آئے گا۔ ایک ہفتہ تو اس کے لیے بہت کم ہے۔ پھر تمہارا کمرا بھی تیار کروانا ہے۔ کم از کم دو ہفتے تو ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ دو ہفتوں کے بعد جو جمعہ آئے گا اس دن نکاح ہوگا۔"

"خدا تمہیں خوش رکھے میرے بھائی......" اور چاند نے بسطامی کا ہاتھ پکڑ کر پشت سے چوم لیا تھا۔

☆☆☆

سن ۲۰۰۱ء

سردیوں کی ہلکی دھوپ گھر کے باغ میں اتری ہوئی تھی۔ دھوپ میں شدت نہیں تھی۔ لیکن اتنی گرماہٹ تو ضرور تھی کہ اس سے لطف لیا جا سکتا۔ باریشہ دور سے چلتی ہوئی وسط کے اس ڈھکے ہوئے حصے تک آرہی تھی جہاں سانول کا والد بیٹھا ہوا تھا۔

اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی ڈاڑھی تھی۔ نجانے اس کی عمر کیا تھی۔ لیکن وہ اپنی عمر سے کافی کم کا لگتا تھا۔ اس نے سفید شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ جس کے اوپر براؤن رنگ کا ویسٹ کوٹ تھا اور وہ اس پر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بائیں کلائی میں قیمتی گھڑی تھی۔ اور وہ اس وقت کوئی مہنگا پرفیوم لگائے ہوا تھا۔ جس کی مہک باریشہ کو دور سے ہی محسوس ہو چکی تھی۔

"السلام علیکم......" اس نے قریب پہنچنے پر کہا تھا۔ اور اس کو قریب پر دیکھنے پر باریشہ کو احساس ہوا تھا کہ اس کے چہرے پر اس کی نوجوانی والی شادابی برقرار تھی۔ جو دھوپ کی چمک میں کچھ زیادہ ہی نمایاں تھی۔ لیکن چہرے کے اس پرسکون تاثر میں یہ بات بھی پوشیدہ تھی کہ اندر کہیں اس سکون میں ایک طوفان قید ہے۔ یا تو یہ طوفان آنے والا ہے یا آکر گزر چکا ہے۔

"وعلیکم السلام...... کیسی ہو باریشہ......" باریشہ کے اس تک پہنچنے تک وہ کھڑا ہو چکا تھا۔

"جی...... ٹھیک ہوں میں......"

"میں رحبانی ہوں۔ جانتی ہو مجھے......"

"آپ کے بارے میں آپ کے بیٹے سانول سے پتا چلا تھا۔ یہاں آکر......"

"کیا چاند نے تمہیں میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔"

"نہیں...... انہوں نے کبھی آپ کا ذکر نہیں کیا تھا۔" باریشہ نے سچائی بتا دی تھی۔ رحبانی کے چہرے پر ایک اداسی جھلکی تھی۔ جس میں دکھ ہی دکھ تھا۔

"تمہاری نانو کو شاید سب سے زیادہ مجھ ہی سے نفرت ہے۔"

"اس کے بارے میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں رحبانی بابا......"

"تم نے مجھے رحبانی بابا کہا۔ مجھے اچھا لگا۔" وہ مسکرایا تھا۔ "تمہاری ماں بھی مجھے اس لقب سے پکارا کرتی تھی۔ بیٹھو ادھر میرے پاس...... مل کر ماضی باتیں کرتے ہیں۔" رحبانی کے کہنے پر باریشہ اس کے پاس بیٹھ گئی تھی۔

"آپ امی کو کتنا جانتے ہیں۔؟"

"ایک دوست کی طرح جانتا تھا میں اسے...... گھر میں چاند کے بعد وہ سب سے زیادہ باتیں مجھ سے ہی کیا کرتی تھی۔"

"کیا باتیں کرتی تھیں وہ آپ سے......؟"

"میرزاد کی باتیں کیا کرتی تھی۔ جب ابھی اس کی میر زاد سے شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہر وقت اسی کا ذکر کرتی رہتی تھی۔ ستار بجانے کا شوق بھی اسے مجھے سکھ کو بجاتا دیکھنے کے بعد آیا تھا۔"

"وہ کیسا ستار بجایا کرتی تھیں۔؟"

"بہت اچھا...... اتنا اچھا کہ اس کے ستار کی گونج ٹھنڈیانی سے ہوتی ہوئی حویلیاں تک آ گئی تھی۔"

"میں کچھ بھی نہیں......"

"سب کچھ اتنی جلدی سمجھ میں نہیں آئے گا تمہیں...... بس اتنا سمجھ لو کہ اسے آرٹ میں بہت دلچسپی تھی۔ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھی۔ عام لڑکیوں کی طرح کی نہیں تھی وہ...... فارغ رہنا اسے پسند نہیں تھا۔"

"کاش میں نے اپنی ہوش میں انہیں یہ سب کرتے ہوئے دیکھا ہوتا۔"

"کس کو پتا تھا کہ اس کی قسمت میں موت اتنی جلدی لکھی ہوگی۔" رحبانی نے افسوس سے کہا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ باریشہ بھی اداس ہو جاتی اس نے بات کو بدل دیا تھا۔ "لیکن تم اپنی ماں کے ادھورے کاموں کو پورا کر سکتی ہو باریشہ......"

"وہ کیسے رحبانی بابا......"

"جو کام تمہاری ماں کرنا چاہتی تھی وہ تم کرو......"

"میں اب سنگیت میں نہیں جانا چاہتی ہوں رحبانی بابا......"

"مت جاؤ...... لیکن فارغ بھی مت رہو...... کچھ اور کرو...... اپنی ایک الگ پہچان بناؤ...... انفرادی حیثیت...... جس میں چاند کا نام نہ ہو۔ نہ میرا اور نہ ہی بسامی کا...... وہ پہچان تمہاری خود کی ہوگی۔ جسے تم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔"

"ایسا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔"

"تمہاری ماں نے کسی بھی گھر والے کی مدد کے بنا ٹھنڈیانی میں ایک ریسٹورنٹ کھولا تھا۔ اور اسے کامیابی سے چلا رہی تھی۔ تمہیں تو اپنی ماں سے ہی بہت کچھ سیکھنا چاہیے۔ تم کومل بھابھی یا ایمن سے بات کر سکتی ہو۔ وہ تمہیں بہتر گائڈ کر سکتی ہیں۔ لیکن تم چاند کے نقش قدم پر مت چلنا باریشہ......"

"ہر گز نہیں رحبانی بابا...... اسی لیے تو اس حویلی سے نکلی ہوں میں......"

"ساری زندگی چاند نے اڈے پر زردوزی کا کام کیا اور اب ہاون دستے میں دوائیاں کوٹ رہی ہے۔ کیا ملا زندگی سے...... ایک انا کی خاطر زندگی برباد کر لی اپنی بھی اور میری بھی......" رحبانی نے روانی میں کہہ دیا تھا۔

باریشہ نے کچھ اچنبھے سے اسے دیکھا تھا۔

رحبانی نے جلدی سے بات بدلی تھی۔ "تم ایسا مت کرنا باریشہ...... اپنے اندر کے ہنر کو پہچاننا...... خدا نے تمہارے اندر ہر انسان کی طرح بہت سے ہنر چھپا کر رکھے ہوں گے۔ انہیں پہچانو...... انہیں بروئے کار لاؤ...... دیکھنا تم کتنی ترقی کرو گی۔"

"کومل آنٹی سنگیت کے لیے بضد ہیں۔ لیکن اب وہ کام مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔"

"تو مت کرو...... کچھ اور کر لو۔"

"کیا میں کوئی این جی او کھول سکتی ہوں۔؟" چند لمحے سوچنے کے بعد باریشہ نے کہا تھا اور باریشہ کی بات پر رحبانی نے کوفت سے سانس بھرا تھا۔ کیا تھکی ہوئی تربیت کی تھی چاند نے اس لڑکی کی......

"یہ کام تم تب بھی کر سکتی ہو جب تمہارے جسم میں کچھ اور کرنے کی قوت نہ رہے۔ فی الحال اپنے جسم کی

قوت سے فائدے والا کام لو۔ اپنی ینگ ایج کو استعمال کرو۔" رحبانی کی بات باریشہ کو اچھی لگی تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔

"کومل بھابھی کے پاس جاؤ...... وہ تمہیں کچھ اچھا بتائے گی۔ پھر مجھ سے مشورہ کر لینا۔"

"ٹھیک ہے۔"

"اب تم جا سکتی ہوں۔" رحبانی نے کہا تھا۔ باریشہ اٹھی تھی۔ وہاں سے جانے لگی تھی۔ پھر کچھ خیال آنے پر وہ پلٹی تھی۔

"آپ بہت اچھے ہیں رحبانی بابا...... آپ سے باتیں کر کے بہت اچھا لگا۔" اس نے کہا تھا۔ رحبانی نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔

☆☆☆

سارا دن کمرے میں بند رہنے کے بعد وہ شام کو کمرے سے باہر نکلی تھی۔ لاؤنج میں کومل بیگم اپنا سر پکڑے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کو دیکھ کر باریشہ کو فکر ہوئی تھی۔

"کیا ہوا ہے کومل آنٹی......"

"نہیں...... کچھ نہیں میری جان......" اس نے ٹالنے کی غرض سے کہا تھا۔

"آپ پریشان لگ رہی ہیں۔" اور باریشہ کہاں جانتی تھی کہ پریشان کا یہ انداز سراسر بناوٹی ہے۔ اس کے قدموں کی آہٹ سنتے ہی تو کومل نے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔

"اب تم سے کیا جھوٹ بولنا...... پریشان تو ہوں میں......"

"مجھے بتائے کہ کیا ہوا ہے...؟"

"تمہیں وہ سیلون یاد ہوگا جہاں میں تمہیں لے کر گئی تھی۔ جہاں تمہارا میک اوور ہوا تھا۔ شاید تمہیں وہاں کی اونر یاد ہو۔ نبیلہ نام ہے اس کا......"

"جی...... یاد ہے مجھے...... جن سے آپ باتیں کر رہی تھیں۔"

"ہاں...... میری تو بہت اچھی دوست ہے وہ...... اس نے شیزہ کا بھی میک اوور کیا تھا۔ کہیں باتوں باتوں میں اس نے شیزہ سے کہا تھا کہ وہ ان کے سیلون کے پبلسٹی ایڈ کے لیے ماڈلنگ کرے گی۔ شیزہ نے ہاں کر دی تھی۔ لیکن شیزہ ہاں کر کے شاید خود ہی ڈیٹ بھول گئی۔ اب کل شوٹ کی ساری تیاری کر کے بیٹھی ہے اور شیزہ یہاں موجود نہیں......"

"تو آپ شیزہ کو بلوالیں۔"

"فون کیا تھا۔ مجھے لگا کہ لڑکیاں مری میں ہیں۔ لیکن وہ ڈرائیور کو ساتھ ملا کر مری سے بھی آگے راولاکوٹ چلی گئی ہیں۔ وہاں کل بہت برف باری ہو چکی ہے۔ واپسی کے راستے بند ہو چکے ہیں۔ جن کے کھلنے میں نجانے کتنا وقت لگے۔ ادھر شوٹ کے بعد نبیلہ نے نئی برانچ کی اوپننگ کرنی ہے۔ جس کے سارے کارڈ بھی تقسیم ہو چکے ہیں۔"

"تو نبیلہ میم کسی اور لڑکی کو دیکھ لیں۔"

"ظاہر ہے کہ وہ تو دیکھ ہی لے گی۔ لیکن ہمارے گھرانے کے بارے میں کیا سوچے گی نبیلہ...... کہ کیسی لڑکیاں رہ رہی ہیں ہمارے گھر...... جو اتنی غیر ذمہ داری ہیں۔"

"جی...... یہ تو ہے۔"

"ایک تو ساری لڑکیاں ہی چلی گئیں۔ ورنہ میں کسی اور کی منت کر لیتی......"

باریشہ خاموش رہی تھی۔ وہ بھلا اب اس موضوع پر مزید کیا بات کرتی......

''ایک بات کہوں باریشہ......''

''جی کہیں۔''

''کیا تم میرے کام نہیں آسکتی ہو؟''

''مطلب......؟ میں سمجھی نہیں آپ کی بات......''

''شیزہ کی جگہ تم چلی جاؤ...... تصویریں ہی تو بنوانی ہیں۔ وہ تم بنوالو۔''

''میں...... میں کیسے جاسکتی ہوں۔''

''کیوں تم کیوں نہیں جاسکتی ہو۔ شیزہ سے کم پیاری نہیں ہو تم......''

''بات یہ نہیں ہے۔ میں ماڈلنگ نہیں کرنا چاہتی ہوں۔''

یہ ماڈلنگ تھوڑی نہ ہے۔ سیلون کے اندر لگیں گی تصاویر...... تم ایسا سمجھنا جیسے تم کسی شادی کے لیے تصاویر بنوا رہی ہو۔''

باریشہ انہیں کیا بتاتی کہ وہ آج تک کسی شادی میں نہیں گئی ہے۔

''تم تو ابھی تک حویلیاں میں ہی موجود ہو۔ بس میں نے کہہ دیا ہے۔ کل تم میرے ساتھ نبیلہ کے سیلون جا رہی ہو۔ اس معاملے میں میں تمہاری ایک نہیں سنوں گی۔'' کومل بیگم نے پیار بھری دھونس جماتے ہوئے کہا تھا۔ اور باریشہ میں اتنی عقل ہوتی کہ وہ ان کی پیار بھری دھونس کے پیچھے چھپے ارادوں کو سمجھ پاتی تو چاند نانو کو چھوڑ کر حویلیاں سے بھاگتی ہی کیوں۔

☆☆☆

''میم! میری طرف دیکھیے۔'' فوٹو گرافر نے اس سے کہا تھا۔ وہ جو بت بن کر کھڑی تھی تو اس نے اپنے چہرے کا رخ اس کی طرف موڑ لیا تھا۔ لیکن فوٹو گرافر کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ کیمرا ایک طرف رکھ کر وہ اس کے پاس آیا تھا اور اس نے اس کے چہرے کی ڈائریکشن کو اپنے ہاتھوں سے درست کیا تھا۔ وہ جو پہلے سے گھبراہٹ کا شکار تھی مزید گھبرا گئی تھی۔

''اسمائل پلیز......'' وہ کیا بتاتی کہ اس سے مسکرایا نہیں جا رہا ہے۔ برائیڈل سوٹ کے نام پر جو لباس اسے پہنایا گیا تھا اس میں اس کی آدھی کمر ننگی تھی اور پیٹ بھی قدرے نظر آ رہا تھا۔ وہ ہر بار اپنے دوپٹے سے دونوں چیزوں کو ڈھانپنے کی کوشش کرتی تھی اور فوٹو گرافر کی ہیلپر لڑکی اتنی ہی بے نیازی سے اسے پرے کر دیتی تھی۔ ہیلپر لڑکی کو اس بات کی پروا نہیں تھی کہ باریشہ ایسا لباس پہن کر شرما رہی ہے۔

اس دن اس نے تین مختلف لباس پہنے تھے اور تین مختلف انداز میں اس کا میک اپ کیا گیا تھا۔ دوپہر میں ایک گھنٹے کی لنچ بریک تھی۔ اس کے علاوہ شام تک وہ مختلف بیک گراؤنڈ والے وال پیپرز کے سامنے کھڑی رہی تھی۔ یہ دن کافی تھکا دینے والا تھا۔ گھر واپس آئی تو اسے آج کے بارے میں سوچنے کا وقت ہی نہیں ملا تھا۔ وہ جلدی ہی سو گئی تھی۔

اگلے دن ثناشہ اس کے ساتھ گئی تھی۔ اس نے اسے کمفرٹیبل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہر نئے میک اپ پر وہ اس کی تعریفیں کرتی رہی تھی۔ اور ہر لباس پر کہتی رہی تھی کہ وہ اس پر بہت سوٹ کر رہا ہے۔ اگلے دن کے لباس کچھ زیادہ جدت لیے ہوئے تھے۔ وہ کہہ نہ سکی کہ اس نے آج تک کسی دلہن کو بنا آستین کے قمیص اور کمر سے اتنے بڑے گلوں کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ ثناشہ سے اس نے جھجکتے ہوئے یہ سب کہا تھا۔ اور ثناشہ نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

''ان سب لوگوں کے کام کرنے کی اپنی لوجک ہوتی ہے۔تم پلیز یہاں کچھ مت کہنا۔کہیں کوئی تم سے ناراض نہ ہو جائے۔''

اگلے دو دن تک وہ چپ رہ تھی اور وہ سب کچھ کرتی رہی تھی جو جو اسے کرنے کو کہا جا تا رہا تھا۔ان چار دنوں میں وہ بے حد تھک گئی تھی۔دل ہی دل میں اس نے شیزہ کو خوب کوسا تھا جو نبیلہ میم سے وعدہ کر کے خود گھومنے چلی گئی تھی۔چار دن بعد کام ختم ہوتو اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔تب تک لڑکیاں راولاکوٹ سے واپس آچکی تھی۔لیکن اب کیا فائدہ...... شیزہ کے حصے کا کام تو باریشہ کر ہی چکی تھی۔اسے اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ کومل آنٹی نے اسے بالکل بھی نہیں ڈانٹا تھا۔بلکہ اس موضوع پر تو بات ہی نہیں کی تھی۔اس نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لی تھی کہ شاید کومل آنٹی اس موضوع پر اکیلے میں شیزہ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔

''تم چلو گی کل کومل میم کے ساتھ......؟'' رات میں نتاشہ نے اس سے آکر پوچھا تھا۔

''کہاں......؟''

''نبیلہ میم کی نئی برانچ کی اوپننگ پر......''

''میرا کیا کام وہاں......''

''چلی جاؤ...... تم ان کی ماڈل رہ چکی ہوں۔وہاں جا کر تمہیں اچھا لگے گا۔''

''تم چلو گی......؟''

''تم کہو گی تو چلی جاؤں گی۔ویسے کومل میم تو جا رہی ہیں۔انہوں نے کہا ہے کہ تمہیں بھی تیار کرواؤں۔''

''کومل آنٹی نے کہا ہے تو چلی جاؤں گی۔''

اور اگلے دن وہ کومل بیگم کی پسند کے کپڑے پہن کر ان کے اور نتاشہ کے ساتھ سیلون کی اوپننگ پر گئی تھی۔جہاں اس نے ان لوگوں کو بھی دیکھا تھا جنہیں وہ بس ٹی۔وی پر دیکھتی تھی۔لیکن اس سے بھی حیرت کی بات کچھ اور تھی۔اس نے خود کو دیکھ لیا تھا۔اور خود کو دیکھ کر وہ ٹی۔وی پر نظر آتی ماڈل کو دیکھنے سے بھی زیادہ حیران ہوئی تھی۔

سیلون کے در و دیوار پر جگہ جگہ باریشہ کی تصاویر لگائی گئی تھیں۔اور ان سب میں وہ اس قدر پیاری لگ رہی تھی کہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ساری رات یہاں کھڑی رہ کر خود کو دیکھتی رہے۔وہاں بہت سے لوگوں نے اس کے کام کی تعریف کی تھی۔اور پہلی بار باریشہ نے دل ہی دل میں شیزہ کا شکریہ ادا کیا تھا کہ وہ راولاکوٹ چلی گئی اور اس کے حصے کا یہ حسین ترین کام اسے کرنا پڑا۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سانحہ ارتحال

آپ کی پسندیدہ مصنفہ ام طیفور کے شوہر کفیل احمد صاحب اس جہان فانی کو الوداع کہہ گئے

انا للہ وانا الیہ راجعون

ام طیفور کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ ہے۔ہم ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔اللہ تعالیٰ کفیل احمد صاحب کو جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے اور ام طیفور اور ان کے بچوں کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

لبنیٰ آصف

حسن آرا بیگم

زندگی اپنے طور پر رواں دواں ہوتی ہے لوگ ملتے ہیں اور بچھڑ جاتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ ہمیشہ یادوں میں رہتے ہیں۔ اسی طرح اماں کی دوست حسن آرا بیگم بھی تھیں۔ پرانے محلے کی یادوں کے ساتھ جڑی رہتیں۔ حسن آرا بیگم اماں کی وہ سہیلی تھیں۔ جو مشورے، ٹوٹکے اور بچت کرنے کے مختلف طریقے (دوسرے معنوں میں) بے تکے مشورے بتانے کا ٹھیکا اٹھائے ہوئے تھیں۔ مجھے اور بھائی کو اماں کی یہ دوست بالکل پسند نہ تھیں۔ اماں کی دوست محلے دار ہونے کا بھی اعزاز رکھتی تھیں۔ پسند تو ابا بھی نہیں کرتے تھے لیکن اماں کی ناراضی برداشت کرنے کا حوصلہ ابا میں نہیں تھا۔

پورا بچپن ہمارا پرانے محلے میں گزرا بلکہ جوانی بھی۔ بھائی کی شادی ہونے سے پہلے ابا نے وہ گھر بیچ کر سوسائٹی میں گھر لے لیا اور پھر کہیں جا کر جان چھوٹی اماں کی عزیز جاں دوست سے۔ اب صرف فون تک ہی محدود تھیں۔ گھنٹوں بات ہوتی فون پر۔ پرانے محلے میں تو روز کا معمول تھا۔ اماں کی دوست ناشتا کرتے ہی محلے کے ٹور پر نکل پڑتیں۔ ہمارا گھر تو سرفہرست تھا۔ چائے کے کپ سے لطف اندوز ہوتے ڈھیروں مشوروں اور ٹوٹکوں سے مستفید کرتیں۔ اور ان کی مداح دوستیں وہ مشورے اور ٹوٹکے پلو سے کس کر باندھ لیتیں۔

جمعہ بازار، اتوار بازار اماں اکثر اپنی دوست کی ہمراہی میں جاتیں اور فالتو سامان خرید لاتیں۔ ابا خوب ناراض ہوتے۔ ابا کو سخت چڑ تھی ان بازاروں سے اور مجھے بھی کیونکہ اماں ٹو پیس سوٹ لے لیتیں جس کا دوپٹا یا شلوار ڈھونڈنا میچنگ کا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

اماں کی دوست نے کہا دن مقرر کرلو کپڑے دھونے کا۔"

آندھی آئے یا طوفان اماں ضرور کپڑے دھوتیں۔

ابا نے تو اماں کی ایک نہ چلنے دی۔

"موسم خراب ہو تو مشین نہ لگایا کرو سارا دن میری بیٹی کپڑے اٹھاتی، پھیلاتی رہتی ہے۔"

☆☆☆

"بھائی! آپ ایک طرف سے ٹیڑھے ہو کر کیوں چل رہے ہیں؟"

میں اور امی صوفے پر بیٹھے تھے۔ امان بھائی سامنے سے چلتے ہوئے آرہے تھے۔

امی نے پوچھا۔ پاؤں میں چوٹ لگی ہے کیا امان؟"

"میں تو ایسے ہی چلتا ہوں!" آپ لوگوں نے آج دیکھا ہوگا۔ یہ بھی اماں کی دوست کے مشورے کا نتیجہ ہے۔ اماں کو ہمیشہ یہی سمجھایا کہ امان کا قد اور پاؤں دونوں بڑا ہے۔ امان کو لے جانے کے بجائے کاغذ پر پاؤں رکھ کر ناپ بنا کر لے جاؤ۔ ساتھ لے کر دکان پر جاؤ گی تو دکان دار سمجھے گا بڑا ہے۔ ہر دفعہ اماں ان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے میرا ناپ لے جاتیں۔ دکان دار بھی کہتا کہ بڑا ناپ ہے مگر اماں اس کو بھی ڈپٹ کر خاموش کروا دیتیں کہ بچہ ہے۔ میرا جوتا ہمیشہ چھوٹا آجاتا ہے جو بحالت مجبوری مجھے پہننا پڑتا۔ اماں سے بہت بار کہا۔ مگر ڈانٹ کر خاموش کروادیتیں۔ چھوٹا جوتا پہننے کی وجہ سے میری چال ہی بدل جاتی۔ دوست اتنا مذاق اڑاتے۔ جب

سے ایسے ہی چلتا ہوں ۔اماں کی دوست کے مشورے کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔"

میری اور اماں کی ایک ساتھ ہنسی چھوٹی۔ پھر بھائی بھی ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گئے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔اور محفل کا رنگ دوبالا ہوا۔

ایک دفعہ میری آنکھیں آ گئیں۔ ہر دوسرے شخص کی آنکھیں سرخ نظر آ رہی تھیں۔ سیزن چلا تھا آنکھوں کا۔ ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے برف سے سکائی کرنے کو کہا۔ اسی دوران اماں کی دوست کی تشریف آوری ہوئی۔



"ارے! بیٹا، بیٹنا ڈول ڈالو۔ شام تک ان شاء اللہ آرام آجائے گا۔"

"آنٹی! ڈاکٹر نے کچھ بھی ڈالنے سے منع کیا ہے۔ صرف سکائی کا کہا ہے۔ وہ بھی زیادہ کرنے سے منع کیا ہے۔"

ارے ڈاکٹروں کو کیا پتا ہر سال ہی آنکھوں کا سیزن چلتا ہے۔ ابھی گھر جا رہی ہوں، بچوں کے ہاتھ گھر کا بنا عرق گلاب بھیجتی ہوں۔ وقفے وقفے سے ڈالنا، شام تک آرام آجائے گا۔

پھر اماں نے ایک نہ سنی۔ پہلے بیٹنا ڈول ڈالی، اتنی جلن ہو رہی تھی۔ پھر سارا دن وقفے وقفے سے دوست نے جو عرق گلاب بھیجا ڈالتی رہیں۔ کہ حسن آرا ہمیشہ اچھا مشورہ دیتی ہے۔ شام تک آنکھ ٹماٹر کی طرح سرخ ہوگئی۔ ابا آفس سے آئے تو دیکھتے ہی فوراً آنکھوں کے ڈاکٹر سے ٹائم لیا۔ میں اور اماں تیار ہو کر ابا کے ساتھ، کلینک پہنچے۔ ڈاکٹر نے مشین سے آنکھ دیکھتے ہی سیریس شکل بنا کر ابا سے کہنے لگا۔

"سچ بتائیں، آنکھ میں ڈالا کیا ہے، جو اتنا سیویر انفیکشن ہوا ہے؟"

میں نے تو اماں کی گھوری کی بھی پروا نہیں کی۔ بتادیا ڈاکٹر کو کہ پہلے دوا ڈالی پھر عرق گلاب وقفے وقفے سے......

ڈاکٹر نے کہا۔

"گھر میں کچھ اور نہیں تھا۔ وہ بھی ڈال لیتیں آنکھ میں۔" پھر ابا سے کہنے لگا۔ "آنکھ بہت نازک اور گن ہوتا ہے۔ کبھی بھی آنکھ میں بغیر ڈاکٹر کی اجازت کے کچھ نہ ڈالیں۔ اللہ نہ کرے آنکھ ضائع بھی ہوسکتی ہے۔"

پھر آنکھ واش کروائی اور انفیکشن کی دوا دی اور سختی سے ہدایت دی کہ آنکھ میں کچھ بھی مت ڈالیے گا اپنی مرضی سے۔

ابا نے تو ڈاکٹر کے ہاں سے واپس آنے کے بعد اماں کی جو کلاس لی۔ اماں اور ان کی دوست کی شان میں وہ قصیدے پڑھے کہ الامان الحفیظ

ابھی میرا قصہ مکمل ہوا ہی تھا کہ بھائی کہنے لگے۔ "یاد ہے میرا دوست اپنی امی کو ملوانے لایا تھا۔ تو کیا ڈرامہ ہوا تھا۔"

مجھے سوچ کر ہی اتنی ہنسی آئی کہ آنکھوں میں پانی آگیا۔ اماں بھی مسکرانے لگیں۔

ہوا کچھ یوں کہ ہمیں شادی میں جانا تھا۔ اماں کو ساڑھی پہننی تھی میچنگ کا پیٹی کوٹ نہیں مل رہا تھا۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تھک گئی۔ ابھی ڈھونڈھ رہی ہی تھی کہ دروازے پر بیل ہوئی۔ میں تو سمجھ گئی یہ ٹائم اماں کی دوست کے ہی آنے کا ہے۔ دروازہ کھول کر سلام کیا اور اماں کے پاس لے آئی اور پھر چائے بنانے چلی گئی۔ چائے لے کر آئی تو اماں اپنے پیٹی کوٹ کے نہ ملنے کا ذکر کر رہی تھیں۔ حسن آرا بیگم کہنے لگیں۔

"ارے کیا بازار جاؤ گی لینے پیٹی کوٹ۔ گھر میں کوئی کاٹن کا انیس بیس میچنگ کا دوپٹا ہو تو سی لو۔"

اماں کو تو فوراً بات سمجھ میں آگئی۔ دوست کے جاتے ہی الماری میں گھس گئیں اور دوپٹا برآمد کر کے ہی دم لیا۔

"اماں! یہ سوٹ تو آپ گھر میں پہنتی ہیں۔ اتنا اچھا ہے۔ کیوں خراب کر رہی ہیں۔ دوپٹا کیا پہنیں گی اس کے ساتھ پیٹی کوٹ بنالیں گی تو؟"

مگر اماں نے سوٹ ڈیوائیڈر پر رکھا اور پھر قینچی اور انچی ٹیپ لے آئیں اپنی نگرانی میں پیٹی کوٹ کٹوا کر سلوالیا۔ میں نے بھی غصے میں ہی کر ازار بند ڈال کر استری کر دیا۔

دوست کوئی بھی مشورہ دے فوراً سن لیتی ہیں۔ اولاد کی نہیں سنتی ہیں۔

رات میں شادی سے گھر پہنچے تو اماں نے ڈیوائیڈر سے وہی سوٹ اٹھا کر پہن لیا جس کا دوپٹا اب پیٹی کوٹ بن گیا تھا۔

صبح ماسی جھاڑو پوچھا کر رہی تھی۔ میں اور امی رات کا سامان سمیٹ رہے تھے۔ چوڑیاں، بندے سب ڈبوں میں رکھ رہے تھے کہ بھائی بھاگتے ہوئے سامنے سے آئے۔

"امی! میرا دوست جو یونیورسٹی میں ساتھ پڑھتا ہے۔ اپنی امی کے ساتھ آیا ہے۔"

"ہاں ہاں آنے دو۔ ڈرائنگ روم کھولو۔ دونوں بہن بھائی جاؤ، بٹھاؤ۔ ڈرائنگ روم میں۔ میں آتی ہوں۔"

پھر جو اماں کی ڈرائنگ روم میں انٹری ہوئی ہے آج بھی بھلائے نہیں بھولتی اماں سر پر پیٹی کوٹ اوڑھے ڈرائنگ روم میں آگئیں۔ سائیڈ میں

ازار بند بڑی شان سے لٹکا ہوا تھا۔ مسکراتے چہرے کے ساتھ اماں بڑے پرتپاک انداز میں بھائی کے دوست کی امی سے مل رہی تھیں۔ سب حیرانی سے اماں کو دیکھ رہے تھے اور بھائی غصے سے۔

ہنسی کسی طرح کنٹرول نہ ہو رہی تھی مجھ سے، ڈرائنگ روم سے بھاگ کر باہر نکلی۔ جلدی سے دوپٹا ڈھونڈا اور ڈرائنگ روم کے باہر کھڑے ہو کر اماں کو آوازیں دینا شروع کیں۔

"اماں اماں!"

"کیا مصیبت آ گئی......" اماں آتے ہی شروع ہو گئیں۔ "بتا لو چائے۔ پوچھنے کی کیا تک بنتی ہے۔"

"اماں! آپ پیٹی کوٹ سر پر اوڑھ کر آ گئیں۔"

آئے ہائے۔" اماں کا تو خود رنگ اڑ گیا۔ "یاد ہی نہیں رہا کہ پیٹی کوٹ سی لیا ہے۔ اسی سوٹ کا دوپٹا سمجھ کر پہن لیا۔"

خیر اماں دوسرا دوپٹا اوڑھ کر ڈرائنگ میں گئیں میں نے جلدی جلدی چائے کے ساتھ زیادہ اہتمام کیا۔ بھائی کے غصے کی وجہ سے کہ کچھ تو عزت رہ جائے۔ پھر چائے پی کر بھائی کے دوست اور ان کی امی تو چلے گئے ہمارے بھائی تو کچھ سننے کو تیار نہیں۔

"اماں! اتنی شرمندگی ہو رہی تھی۔"

ارے۔ کہہ تو رہی ہوں نکل گیا دماغ سے کہ پیٹی کوٹ سی لیا ہے دوپٹے کا۔"

"کس کا مشورہ تھا یہ؟"

امی کے گھورنے کے باوجود میں نے سچ بتا دیا بھائی کو۔

"پتا تھا مجھے، یہ بے تکے مشورے اماں کی دوست کے ہی ہیں۔ اور عمل کریں۔ کرا دی ناں بے عزتی۔"

اماں کا بڑے کانفیڈنس سے سر پر پیٹی کوٹ اوڑھ کر آنا تصور میں آ گیا خوب ہنسے۔

☆☆☆

ابا کا قصہ تو سب سے منفرد اور انوکھا تھا۔ ایک دن ابا نے آس سے چھٹی کی ہوئی تھی۔ رات سے سینہ جل رہا تھا۔ اماں کبھی ٹھنڈے دودھ میں پانی ڈال کر دیتیں کبھی کچھ اور۔ ابا ڈاکٹر کے پاس جانے کا سوچ رہے تھے کیونکہ آرام نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں حسن آرا بیگم اماں کی دوست کی آمد ہوئی۔

"ارے آج بھائی صاحب گھر میں ہیں۔ خیریت!"

اماں نے بتایا "صبح سے مختلف چیزیں دے چکی ہوں۔ سینہ کی جلن کم نہیں ہو رہی۔ اب ڈاکٹر کے ہاں جا رہے ہیں۔"

اماں کی دوست کہنے لگیں۔ "لو ڈاکٹر کے ہاں جانے کی کیا ضرورت ہے، ہم تو جب بھی سینہ جلتا ہے اولوں کا پانی پی لیتے ہیں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے فوری آرام آتا ہے۔"

"اولوں کا پانی......!"

"ہاں، ایک دفعہ کراچی میں اولے پڑے بس میں نے تو بوتلوں میں بھر لیے۔ بڑے حکیم صاحب نے بتایا تھا۔ سینہ کی جلن کا اس سے بہترین کوئی علاج نہیں۔ ابھی جا رہی ہوں۔ بچے کے ہاتھ بھیجتی ہوں......" پھر ابا سے مخاطب ہوئیں۔

"ارے بھائی صاحب! پریشان نہ ہوں میں اولوں کا پانی بھیج رہی ہوں۔ پیتے ہی آرام آ جائے گا۔ کہاں ڈاکٹر کے پاس جائیں گے۔"

پھر ایک بڑی بوتل بچہ دے گیا اماں نے تو فوراً کپ میں آدھا کپ اولوں کا پانی ابا کو دیا۔ ابا برے برے منہ بناتے پی گئے۔ اماں بوتل کا ڈھکن بند کرنے لگیں تو ڈھکن نیچے گر گیا۔ ابا نے زمین سے ڈھکن اٹھا کر بوتل اماں کے ہاتھ سے لی اور ڈھکن بند کرتے بوتل کے اندر نظر گئی تو ابا فوراً اماں کو بوتل پکڑا کر باتھ روم بھاگے اور الٹیاں کرنے لگے۔ اماں نے بھی بوتل کے اندر جھانکا تو ان کی بھی ہوائیاں اڑ گئیں۔ بوتل کی تہہ میں کیڑے ہی کیڑے نظر آ رہے تھے۔

ابا تو الٹیاں کر کر کے بے حال ہو گئے ذرا جو طبیعت بہتر ہوئی تو اماں کو اتنی باتیں سنائیں کہ ہم سب بھی ابا کو چپ کروانے میں ناکام رہے۔

اماں ہر بار کی طرح اس بار بھی برا مان گئیں اور پریشانی سے کہا گئی۔

"کل ہی فون کر کے حسن آرا کی خیریت پوچھوں گی۔"

میں اور بھائی ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے۔

☆☆

منشا محسن علی

ابھی شام مت بجھانا

ناولٹ

"سانوں سپ سے داڑ نگدا، سانوں پل پل چڑھد از ہر
ساڈے اندر بیلے خوف دے، ساڈے جنگل بنڑ گئے شہر"

صبح سے شام ہو گئی تھی۔ ذکیہ عرف ذکو چولہے میں راکھ پھرولتی ہوئی وہیں کی وہیں بیٹھی رہ گئی تھی۔ نجمہ عرف نجو بھرجائی نے اشارے کر کر کے محلے والیوں کو متوجہ کیا تھا۔

"بے چاری نے بڑا انتظار جھیلا مگر پلے کچھ بھی نہیں پڑا۔ ذرا دیکھو تو اکلی چولہے کے گرد خالی ہتھ بیٹھی رہ گئی اے۔"

چولہے کے گرد چوکڑی مارے بیٹھی ذکو نے سارے صحن میں نظر پھرائی تھی۔ مٹی سے لپی ہوئی دیواروں، ڈھور ڈنگروں کی ٹلیاں، نیم کی کھڈوں کے الو اور چھجے تلے بیٹھی سرخ کھنبوں والی مرغیوں کو، یوں سمجھ لو سب کو آنکھیں لگ گئیں۔ اور سب نے رحم اور ترس بھری نظروں سے ذکو کو دیکھا تھا۔ آنے والا آ گیا تھا مگر وہ چولہے کے گرد بیٹھی بچارن کی طرف نظر ڈالنا بھول گیا تھا۔ سوالی کا سوال بھول گیا تھا۔ سارے سوالوں جوابوں کی ٹوہ ذکو کے حصے میں آ گئی تھی۔

صحن میں چھوڑی ہوئی گوشت کی ہڈیوں کا ڈھیر لگتا گیا۔ سڑک سڑک شوربہ پیا جا تا رہا تھا۔ پھپھی نے باہر آ کر صحن کے گھڑے سے پانی کا چھینٹا منہ پر مارا تھا۔

"اری ذکو! تو کیوں چولہے کی ہو کر بیٹھ گئی ہے، اندر آ کر بیٹھ۔ ذرا سکندر سے کوئی حال چال پچھ۔"

اس نے بس ایک نظر اٹھا کر دیکھا تھا۔ نجو بھرجائی بھی بس کھیر کا پتیلا اٹھا کر اندر چلی گئی تھی۔ سکندر سامنے سامان کھولے بیٹھا تھا جو وہ ولایت سے لایا تھا۔ میٹھی ٹافیاں، سینٹ کی شیشیاں، خوشبودار کریمیں جانے کیا کچھ تھا۔

چولہے میں گیلی لکڑیاں پھٹ گئی تھیں۔ کوئی انگارہ بازو پر لگا تھا۔ درد تھا کہ محسوس ہونا ہی بند ہو گیا تھا۔ بس یہیں بیٹھے بیٹھے اسے کریماں کی بات یاد آ گئی تھی۔

"نی ذکو! تو تو بھنبھیریوں کے گھر ٹوٹنے پر اتنا کر لاتی ہے کسی دن تیرا اپنا گھر ٹوٹ گیا تو کیا کرے گی؟"

تب اس نے کریماں کو تندور والی چھڑی سے پرے کر کے مغرور لہجے میں سینہ تان کر کہا تھا۔

"ذکیہ کا گھر ہے کریماں۔ بھنبھیریوں کا تھوڑی ہے۔"

آج کی رات گواہی دینے کو تیار تھی کہ......!
بھنبھیریوں کے گھر سلامت رہے۔ ذکیہ کا گھر ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔

☆☆☆

جب تک اماں ابا زندہ رہے ذکیہ کی زندگی جیسے آسمان پر رہی تھی۔ شاداں و فرحاں، ہر فکر اور ہر مسئلے سے آزاد...... مگر زندگی کبھی بھی ماں باپ کی متبادل ثابت نہیں ہوتی۔ اماں ابا کی حادثاتی موت کے بعد جیسے ایک دم سے ذکو اپنے آپ میں تن تنہا اور اکیلی بیٹھی رہ گئی تھی اور اس نے پٹر پٹر دیکھنا شروع کر دیا تھا کہ زندگی نے اس کے حصے میں اب صرف سوگ اور ماتم ہی لکھا تھا۔ وہ تو گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ سنہری دھوپ کے جیسی ذکیہ۔ سرما کی حرارت جیسی ذکو۔

سارے پنڈ میں سب کو خبر تھی کہ ذکو کا دل تو سونے کا ہے سونے کا اور وہ ایسی باتوں پر تو یوں ہی لوٹ پوٹ ہو جایا کرتی تھی۔

"بھلا میرا دل بھی کوئی کیسے دیکھ سکتا ہے۔
لاڈ لگانے کے لیے کہہ دیتے ہیں کہ......"
"تیرا دل تو سونے کا ہے۔ تمھیں پتا ہی نہیں ہوتا

بس تم تو بنتی رہو ہمیشہ۔ ورنہ ہر کوئی جانتا ہے کہ
ذکیہ سے کوئی جان بھی مانگے تو اسی وقت دے دے۔"
"جب جان کی بات آ گئی تو تب ذکو نے سوچا



کہ اگر جان دینے کی بات آ گئی تو کیا ہوگا؟"

مگر پھر خود کو تسلیاں دیں کہ بھلا آج کل کون جان لینے کی بات کرتا ہے۔ بس پنڈ والے بھی بچوں جیسی باتیں کرتے ہیں۔ مخول کرتے ہیں۔ یہی سوچ کر وہ بھول بھال گئی تھی۔

اماں کے ساتھ میلوں ٹھیلوں پر بن ٹھن کر جاتی تھی تو محلے کے ہر گھر کے لیے سوغاتیں ضرور لے کے آتی تھی۔ اگر کسی نے اس کی کلائیوں میں پہنی ہوئی ہری ہری کانچ کی چوڑیاں دیکھ لیں تو جھٹ مانگ لیتے۔

"تمہاری چوڑیاں بہت پیاری ہیں اگر تو نہ بھی پہنے تو پھر بھی تو سوہنی ہی لگے گی۔"

بس لگ گئی ذکو کے دل کو یہ بات اور چوڑیاں ایک ایک کر کے اگلی کی کلائیوں میں پہنا دیں اور خود جب خالی خولی ہو کر گھر پہنچی تو اماں نے سر پیٹ لیا۔

"تو کس مٹی کی بنی ہے ذکو؟"

"ارے اماں کانچ کی ہی تھیں ناں سونے کی تھوڑی تھیں۔"

"بات کانچ سونے کی نہیں ہے ذکو بات تو سفر کی ہے۔ چاہت کی ہے۔ اتنی لڑ بھڑ کر، بھائی اور ابے سے اجازت لے کر تو میرے ساتھ میلے گئی اور مجھے بھی اس عمر میں لور لور پھرایا تب تو نے یہ لیں۔ اور اب کسی اور کو دے کے آ گئی۔"

اور وہ شام تک اپنی خالی کلائیوں پر صرف کانچ کی ہری چوڑیوں کا رنگ لیے بیٹھی رہی تھی۔ ابا نے بھی کئی بار استفسار کیا تھا کہ دن میں وہ سارا دن اس کے کلائیوں کی چوڑیوں کی چھن چھن سنتے رہے تھے۔ اور جب رات ہوئی تھی اور ان کے دھیان میں تھا کہ ابھی بھی حقہ گڑگڑاتے ہوئے جب وہ ان کے لیے چلو بھر کر لائے گی یا ان کے لیے پانی کا مٹکا رکھے گی تو صحن ذکو کی چوڑیوں کی چھن چھن سے گونجے گا مگر وہ شام بہت اداس اور خاموش رہی......!

☆☆☆

پنڈ کی لڑکیوں کے خمیر میں ہمیشہ سے ہی باپ اور بھائی کی طرف سے دل میں ایک ان دیکھا ڈر اور جھجک ہی رہتی ہے بس وہ اپنی ماؤں کی اوڑھنیوں میں ہی چھپی رہتی ہیں۔ وہ بھی اجمل بھائی سے ذرا کم ہی واسطہ رکھتی تھی، کبھی کبھار کی بات چیت۔ یونہی کبھی روٹی پانی آگے کر دیا۔ اجمل بھی گرمیوں کی حبس زدہ راتوں میں اپنی چارپائی ان لوگوں سے کہیں دور بچھایا کرتا تھا۔ وہ اماں اور ابا کے پاس بیٹھی تاروں بھرے آسمان کو تکتے ہوئے پرکھوں کی پرانی کہانیاں قصے مسحور ہو کر سنتی رہتی تھی۔

"اچھا تو پردادا جی کے پاس بہت سے گھوڑے تھے؟" ابا حقہ گڑگڑ کرتے اپنی جھلی اولاد کو دیکھا کرتے تھے جو گھوڑے، خچر اور شکاری کتوں کی نفسیات بارے کئی کئی سوال کیا کرتی تھی۔

"میری دھی یہ لڑکیوں کی دلچسپی کی چیز نہیں ہوتی۔"

اماں ویسے ہی دونوں باپ بیٹی کے بحث مباحثے سے لاتعلق ہو کر دور لیٹے اجمل کی پشت دیکھے جاتی تھیں۔ وارث بڑے پیارے ہوتے ہیں۔ بیٹے آنکھ کے تارے ہوتے ہیں۔ اجمل کی جوانی ان کے دل میں ہڑک اور حزن لے آتی تھی۔ بے وجہ۔ کوئی سبب نہیں ہوتا تھا۔

"ارے ابا۔ بے چارے جانور چپ چپاتی مخلوق ہوتے ہیں۔ گھوڑے تو گھوڑے ہوتے ہیں اور خچر تو خچر ہوتے ہیں۔ بھوک پیاس کی بولی نہیں آتی ان کو۔"

ابا کے مونچھوں تلے ہونٹ مسکائے جاتے تھے۔ سر پر چپت لگا کر اسے ڈانٹ دیتے تھے۔

"اب تو سو جاؤ کو۔ تو نے صبح اسکول بھی جانا ہے ویسے بھی کل تیرا نتیجہ ہے۔ میں نے اور تیری ماں نے شہر برادری کی طرف شادی کے لیے جانا ہے۔ نیند کچی رہ گئی تو مصیبت ہو جائے گی۔"

وہ تو ابا کی پائنتی کی طرف پرسکون پرکھوں کی داستانیں سننے میں مگن تھی۔ یہ خبر ہی نہیں تھی کہ کل دسویں جماعت کا نتیجہ نکلنا تھا اور اب جب ابا نے یاد دلایا تھا تو توتے چڑیاں سب اڑ گئی تھیں۔ جھٹ چارپائی سے اٹھ کر اماں کی منتیں کرنے آ گئی تھی۔

"اماں پیاری اماں۔ ابھی سونا نہیں۔ میرے

لیے اپنی جماعت میں ٹاپ کرنے کی دعا کر کے ہی سونا بس۔"

اماں سے لپٹ کر ذکو ساری رات فجر کے تارے کے ابھرنے تک آیت الکرسی اور قرآنی آیات کے ورد کرتی رہی تھی۔

امتحان کا نتیجہ آ گیا تھا۔ اماں کی دعائیں کام آ گئی تھیں اور ذکیہ عرف ذکو نے ٹاپ کر لیا تھا۔ مگر واپسی کی ٹرین میں بوگیاں پٹریاں چھوڑ گئی تھیں اور پنڈ کے کئی گھروں کے بڑے واپس نہ آئے۔ جب روتا بلکتا اجمل پنڈ والوں کے ساتھ اماں ابا کی خونم خون ہوئی میت لے کر پہنچا تھا۔ ذکو وہیں اماں کا دوپٹا سر پر اوڑھے چولہے کی وارث بنی بیٹھی تھی کہ ماؤں کی عدم موجودگی میں بیٹیاں ہی تو چولہے سنبھالتی ہیں۔

نیم کا چھتنار درخت، کھڑونچی کے گھڑے، جگالی کرتی بھینسیں، ڈربے کی اوٹ سے سراسیمہ سی مرغیاں سب نے وحشت زدہ ہو کر ذکو کو دیکھا تھا۔ بھنبھیریوں کے گھر اجڑ پجڑ گئے۔ اور ذکو کا بھی......!

☆☆☆

ابا اماں کے گزر جانے کے جیسے اب شام ہوتے ہی وہ چولہے کو سنبھال لیتی تھی۔ اور پتا نہیں کیوں انگارے اور راکھ کریدتی رہتی تھی۔ اجمل کی ہمیشہ کوشش ہوتی تھی کہ ایک بھائی کا فرض نبھاتے ہوئے وہ جلد از جلد گھر لوٹ آئے اور شام ہوتے ہی وہ گھر لوٹ آیا کرتا تھا۔ نیم کے درخت تلے سے چارپائیاں اٹھا کر صحن میں ڈالنے تک، مرغیوں کے ڈربے صاف کرنے تک اور جگالی کرتی بھینسوں سے دودھ نکالنے تک وہ سارے کام چپ چاپ کیے جاتا تھا۔ وہ بیٹھی آرام سے اجمل کو ویڑے میں چلتے پھرتے دیکھا کرتی تھی۔ آخر کو وہ بہن بھائی تھے۔

معاشرے میں بہت ساری چیزیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں اکثر گرفت میں لے لیا جاتا ہے۔ بہت سارے پنڈ اور دیہات میں بھی یہی ہوتا ہے کہ بہن بھائی آپس میں ویسے بات نہیں کر سکتے جیسے باقی رشتے تو شاید ان دونوں کے درمیان بھی وہی باڑ تھی جس نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے کنارے پر کر دیا تھا۔ رات کو کسی ذمہ داری کی طرح اجمل سر اٹھا اٹھا کر اسے دیکھا کرتا تھا۔

زندگی تب تک اسی طرح ڈگر پہ چل رہی تھی اور جب اکلوتی پھوپھی نے مدعا اٹھایا کہ وہ اپنی نجمہ کی جلد از جلد شادی اجمل سے کر دیں تاکہ اجمل بھی زمینیں اور کاشتکاری اور سارا کچھ سنبھال سکے اور گھر کی طرف سے بالکل بے فکر ہو جائے۔ اپنے بھائی کے بچوں کو اس طرح دیکھنا ان کے دل میں جیسے کوئی دراڑ ڈال رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے خاندان کے کچھ بڑوں کو اپنے اعتماد میں لے کر اجمل کے رشتے کی بات چلائی تھی۔

کیونکہ وہ بڑی تھیں اور اجمل بھی اس چیز پہ انکار نہیں کر سکا تھا۔ اور نجمہ تو ویسے بھی دوسرے پنڈ سے تھی خاص آنا جانا بھی نہیں تھا بس شادی بیاہ اور کبھی کبھار کسی خاص موقع پہ آ جاتے تھے۔

نجمہ اور ذکو کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب نہیں آ سکی تھیں۔

شادی کی تیاریاں کب کیسے کس طرح ہوئیں محلے والوں نے اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا ورنہ وہ اکیلی ہانپتی پھرتی پھر بھی اس کے دل میں اس چیز کی تسلی باقی رہ گئی تھی کہ گھر سنبھالنے والی آ رہی ہے۔ کم از کم یہ تو نہیں کہ وہ اکیلی گھر میں آدم بو کرتی پھرے۔ کیوں کہ اجمل مرد تھا اور گھر کا اکلوتا اور اکیلا مرد تھا جس نے باہر جا کے فصلیں بھی دیکھنی تھیں اور گھر کی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اس پہ تھا۔

چپ چاپ اجمل کی شادی کر دی گئی تھی، وہ شاید آتی ہوئی سردیوں کے دن تھے۔ اگر کچھ تبدیلی آئی تھی تو پھوپھو نے اس کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ وہ اپنے بیٹے سکندر اور اس کا رشتہ کریں گی۔ تب اسے سمجھ میں آ گیا تھا۔ سکندر کا چوری چوری اسے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھنا اور وہ نظر انداز کرتی رہی تھی۔ مگر کب تک آخر کو وہ بھی ایک عورت تھی۔ سکندر کی موجودگی نے

اسے اپنی موجودگی سے خبردار کیا تھا اور اسے پتا چلا تھا کہ یہی زندگی کی ریت ہے تعلق، خون کے رشتے یہ ساری زندگی انسان کے ساتھ نہیں رہتے۔ باقی ساتھ ساتھ بہت ساری چیزیں بدلتی رہتی ہیں۔

اس نے بھی سکندر کی طرف متوجہ ہونا شروع کر دیا تھا۔

سکندر کسی پکے ہوئے حرارتی بھٹوں کی پکی اینٹ جیسا تھا کہ جس کا کوئی بھروسا نہیں تھا کب کیسے تڑخ جائے بس یہی ایک چیز بھی جو ذکو سے چھپی رہ گئی تھی۔ اماں ابا اور شیرو کے بعد سکندر میسر آیا تھا تو اب وہ اسی کے واری جاتی تھی۔

نجو بھرجائی اور پھوپھی تو خوش باش تھیں کہ اب سارا گھر ہی ان کی ملکیت ہونے والا تھا۔ اجمل بھرا کو بھی ذکو اور سکندر کے رشتے پر کوئی خاص اعتراض نہیں تھا کہ وہ کوئی اڑچن ڈالتا۔ بس یہی گرما کی لمبی دوپہروں میں وہ ٹھنڈے نالے میں پیر ڈالے سکندر سے باتیں کررہی ہوتی تھی۔

"پھوپھی بتارہی تھیں کہ تو ولایت جانے والا ہے۔"

"ہاں تو ولایت کون سا دور ہے آج کل؟" وہ دل کھول کر ہنسا تھا۔ اور اس کے چمکدار موتی جیسے دانت ذکو کو بہت بھلے لگے تھے۔ بھلا سارے پنڈ کے مردوں کے کہاں ایسے دانت تھے جو سامنے بیٹھے ہوئے سکندر کے تھے۔

"رضیہ کا بھائی بھی تو سعودیہ ہوتا ہے ناں، وہ بتارہی تھی ولایت تو بہت دور پڑتا ہے اور جہازوں پر جانا پڑتا ہے۔ تجھے جہاز سے ڈر نہیں لگے گا؟" وہ اس کے لیے پریشان تھی۔

سکندر نے اس سنہری لڑکی کو دیکھا تھا جس کے ماتھے پر پریشانی کی انگنت لکیریں پھیلی تھیں۔

"بھلا مردوں کو بھی ڈر لگتا ہے جھلی ذکو۔"

اور سکندر کی بات سچی کی سچی رہی کہ تا عمر وہ جھلی ہی رہی۔ وہ جو سیانی ہوا کرتی تھی اب جیسے ہولی سی ہو کر رہ گئی تھی۔

ایک شام پھوپھی روتی پیٹتی آئی تھیں۔ نجو بھرجائی نے تین گلاس لسی بنا کر پھوپھی کو پلائی تو انہیں کچھ سکون ہوا۔

"میں تو آج اجمل پتر سے ایک خاص بات کرنے آئی ہوں۔"

اجمل نے بھی حیران ہو کر انہیں دیکھا تھا۔

"لو بھلا ہزار باتیں کرو آپ۔ کوئی منع کر سکتا ہے بھلا۔"

سرگوشیوں میں باتیں ہوتی رہیں۔ چولہے والی ذکو تک مدعا ذرا تاخیر سے ہی پہنچا تھا۔

"ارے پھوپھی! کیسی غیروں جیسی بات کرتی ہیں آپ۔ آگے بھی تو سکندر اور ذکو نے ساتھ ہی زندگی گزارنی ہے۔ آج ذکو کا زیور اس کے کام آرہا ہے تو اس میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں۔ آپ کا ہے آپ لے جائیں اور سکندر کو ولایت بھیجیں۔ ذرا حالات بدلیں گے چار پیسے کمائے گا۔"

وہیں بیٹھے بیٹھے ٹرنک سے اماں کا زیور جو ذکو کے جہیز کے لیے تھا نجو اور اجمل نے اٹھا کر پھوپھی کے حوالے کردیا تھا۔ دوپٹے میں زیور چھپائے پھپھی نے ذکو کو گلے لگا کر پیار کیا تھا۔ وہ تو بس وہیں بیٹھی زمین دیکھتی رہی تھی۔ سب کچھ اب سکندر کا ہی تو تھا۔

پھوپھی نے ذرا متامل سے انداز میں اسے مخاطب کیا تھا۔

"ذکو! یہ تمہارے کانوں کی جھمکیاں بھی بہت وزنی ہیں۔ میں تو کہتی ہوں یہ بھی اتار دے۔ امانت ہے تیری، وعدہ کرتی ہوں سونے کی اینٹوں میں لادوے گا تجھے سکندر۔"

ذکو نے بس نظر اٹھا کر اجمل بھرا کو دیکھا تھا جس کی نظریں پھوپھی کی تائید میں ہی تھیں۔ اس نے چپ چاپ جھمکیاں کانوں سے اتار کر پھوپھی کی ہتھیلیوں پہ رکھ دی تھیں۔ کان خالی ہو گئے۔ اداسی کہیں کسی اوپری درز سے کھٹ دل میں جا گھسی تھی۔

کان کی جھمکیاں۔ ابا کی کمائی کی جھمکیاں۔ سونے کی اینٹیں۔ جانے والا ذکو کا سب لے گیا تھا۔

وہ پھر سے اکیلی کلم کلی ہو کر رہ گئی تھی۔

پھوپھی اور نجو کے دن پھر گئے تھے۔ نجو بھرجائی اور پھوپھی کے تن پر سونا پڑھتا گیا مگر وہ بس نظر اٹھا کر اجمل بھرا کو دیکھے جاتی تھی۔ سب بدل گیا تھا۔ ماں باپ ویہڑے چھوڑ جائیں تو دھیاں رل جاتی ہیں۔

بھرا بھرجائی کی چارپائی قدرے دور پڑی ہوتی تھیں آدھی رات تک قہقہے پھوٹتے رہتے تھے۔ اور ذکو کروٹیں بدلتی رہتی تھی۔ پنڈ والیاں میلوں ٹھیلوں کو جاتی تھیں مگر کوئی بھی ذکیہ عرف ذکو کے لیے کوئی سوغات نہ لے کر آیا تھا۔

ماسی کریماں کے تندور پہ بیٹھی وہ پنڈ والیوں کے سوالوں کا قہر مشکل سے سہہ پاتی تھی۔

"تو تو اکیلی رہ گئی ذکو۔"

"تیرے ماں پیو کے ہوتے تیرا ویہڑا بڑا رونقی اور ہرا بھرا ہوتا تھا مگر تیری بھرجائی تو کوئی رج کے بے فیض لگی ہے۔ پیسے کی ہوس ہے اس کو۔"

وہ بھی بھرا بھرجائی کی برائی نہیں کرتی تھی۔ اس کے اندر یہ وصف تھا ہی نہیں۔ اور وہ ایسا چاہتی بھی نہیں تھی۔ کیا فرق رہ جاتا پھر؟ ماسی کریماں تندور میں کیکر ڈالتی تھی تو ہواڑ سی پھیل جاتی تھی۔

"سکندر سے تیرا فون پر رابطہ ہوتا ہے ذکو؟"

"پہلے ہوتا تھا مگر اب نہیں۔ ولایت سے فون کرو تو پیسے زیادہ مانگتے ہیں ناں۔"

"کھوٹے سکے کو کیوں کھرا بنا کر پیش کرتی ہے ذکیہ؟" ماسی بھی جب چوٹ دینے پر آتی تھی تو پورا سیدھا نام لے کر وار کرتی تھی۔

"تیرے ماں پیو کا گھر تھا۔ تو راج کرتی وہاں، ملکانی بن کر رہتی۔ جدھر دل کرتا بھرا کا ویاہ کرتی۔ اور تیرے ماں پیو کی شرافت ہی اتنی تھی ذکو کہ تو اکیلی ہو کر بھی اوچی رہتی۔ تیری ماں اور پھوپھی میں اسی وجہ سے نہیں بن سکی کہ تیری ماں شان والی تھی۔ اور تیری پھوپھی بڑی حرص اور طمع والی تھی۔"

شام ڈھلتی تو وہ پنڈ کی گلیوں میں سکندر کو سوچتی گھر کا رخ کرتی تھی۔ کتنا اچھا تھا سکندر۔ ولایت سے ہر سال چکن کا بوچھن بھیجتا تھا۔ اور وہ اسی بوچھن کو اوڑھ کر پنڈ کے ہر گھر جایا کرتی تھی کہ بتائے سکندر اب بھی اس کا خیال اور لحاظ کرتا ہے۔

رضیہ نے تو ایک دن خوب ٹھٹھا لگایا تھا۔

"ارے جھلی ہے تو۔ یہ منت کی چیزیں ہیں۔ خیرات دیتا ہے تجھے۔ بانٹ ہے یہ اس کی۔ ماں اور بہن کو یہ کیوں نہیں بھیجتا؟"

وہ جھلی سمجھ نہیں پائی کہ کچی کنواریوں کو چکن کے سفید بوچھن نہیں جچتے۔ وہ تو بس اعزاز کی طرح سجا بنا کر اوڑھتی تھی۔ حقیقت کا بھی اپنا تھپڑ ہوتا ہے پڑ جائے تو سرخ کر دیتا ہے۔ بے چاری ذکیہ عرف ذکو تو نیلی اور سفید ہو گئی تھی......!

☆☆☆

سرفراز چوہدری کہیں کا نہیں رہا تھا۔ سامنے والی نے جیسے اسے ککھ جتنا ہولا کر دیا تھا۔ اور اس چناب دریا جیسی آنکھوں والی کے چہرے پر تپش اور آنکھوں میں عجیب سا قہر تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وہ ذکیہ عرف ذکو تھی بھلا اس کا کیا واسطہ تھا چہرے کی تپش سے، اور آنکھوں کے عجیب سے قہر سے؟

سارا پنڈ اس بات کو فسانہ کہتا کہ سب جھوٹ ہے، وہ کیسے کسی پر چلا چیخ سکتی ہے۔ وہ تو نمانی ہے وہ تو مٹی پڑی ہے کہ ڈھیری ہے۔ زمین کا بیج ہے۔ جس کے اندر تنے کی شاخ جیسا وصف بھی نہیں تھا۔

چوہدری سرفراز بھی تو سرو تھا۔ اتنا اونچا کہ سر اٹھا کر دیکھنا پڑتا تھا۔ یہ بھی اس کا وصف تھا کہ وہ نظر اٹھانے پر مجبور کر دیتا تھا۔ بھلا اب سارا پنڈ کیوں یقین کرتا کہ وہ ذکو کے آگے فرش ہو گیا تھا۔ جیسے بارش کے بعد مٹی کا ٹھنڈا ڈھیلا ڈھیر ہو جاتا ہے وہیں کے وہیں۔ کھڑے کا کھڑا۔ کندھے سے شال ڈھلک کر پیروں میں آ گئی تھی۔

"میں معذرت کرتا ہوں۔"

ذکو کا چناب دریا بند توڑ گیا تھا۔ وہ چیخ کر ادھ موئی ہو گئی تھی۔

"تم نے میری بکری مار دی ہے، میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔"

وہ تو سارا پنڈ دسترس میں لے کر پھرتا تھا کہ جو بھی جہاں تک بھی نظر آتا ہے سب اپنا ہوتا ہے۔ بس سمجھ کا پھیر تھا جو اسے لے ڈوبا تھا۔

"ایک ہی تو میرے دکھ سکھ کی اکلوتی ساتھی تھی مگر تم نے اسے بھی مار دیا۔ تم نے میرا بہت بڑا نقصان کر دیا بابو۔ بہت بڑا نقصان۔"

وہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے خیالوں میں مگن اس پگڈنڈی کی طرف مڑا تھا اور جانے کہاں سے وہ بکری کا بچہ سامنے آ گیا تھا۔ جیپ جھٹکے سے رکی تھی۔ مگر جیپ کے ٹائروں نے بکری کے اس سفید اور کالے دھبوں والے ذی روح کو کچل کر رکھ دیا تھا۔

وہ جیپ سے جب تک اتر کر پہنچا تھا۔ دائیں طرف سے دوپٹے سے الجھتی بھاگتی ہوئی وہ سامنے آ گئی تھی۔

"ہائے اللہ...... ذکو مر گئی۔ شیر و مر گیا۔"

سر کے بالوں کا جوڑا کھل گیا تھا۔ ہتھیلیوں پر گھاس کا رنگ تھا جیسے درانتی چلاتی رہی تھی۔ چوہدری سرفراز کے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ بکری کے بے جان وجود اور ٹوٹی ٹانگ کو وہ جوڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جیسے جوڑ لگ جائے گا۔ جیسے شیر و ابھی کے ابھی دوڑنے لگے گا۔ مگر ذکو کا راز دار آخری سہارا ابھی مر چکا تھا۔

"اللہ تمہاری آنکھیں کسی اندھے کو دے دے۔ تم نے میرے شیر و کو مار ڈالا ہے۔ ہائے۔"

یہیں ذکیہ عرف ذکو نے اوڑھنی سر پر ٹکا کر نظر اٹھائی تھی۔ اور سرفراز پورے قد سے زمین پر آ گیا تھا۔ وہ مزید چیختی چلاتی رہی تھی اور وہ نظریں جھکائے بس چپ چاپ سنتا رہا تھا کہ بند ٹوٹ گئے تھے۔ دل کو اس سے ڈر لگ گیا تھا۔ پورے گاؤں کا گبرو شیر نوجوان ذکو سے ڈر گیا تھا۔

سرفراز کا دل چاہا آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دے۔

"خدا کے واسطے چپ کر جاؤ۔ میرا دل میرے ہاتھوں سے نکلتا جا رہا ہے۔"

معذرت کے لفظ بس زبان تک رہ گئے تھے۔

وہ شیر و کے خون آلود وجود کو جوڑتی ہوئی پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ چلتی جا رہی تھی۔ بائیں ہاتھ سے آنسو صاف کرتی جا رہی تھی۔ سرما کی دھوپ جیسی...... گرما کی حرارت جیسی......!

دور دور تک دھول اڑتی رہی۔ بریم کے زعفرانی پھول کھیتوں میں کھڑے کھڑے مرجھا گئے تھے۔

شام جب رات کے ساتھ ملنے والی تھی تو گھر کے دروازے سے چار پانچ بکری کے چھوٹے چھوٹے بچے دوڑتے بھاگتے اندر داخل ہوئے تھے۔ ذکو چولہے کے پاس بیٹھی تھی۔ ہر روز کی طرح ہمیشہ کی طرح۔ نجمہ بھرجائی نے بکری کے خوب صورت پھولوں کو دیکھا تھا۔

"ارے یہ کس کے ہیں لگتا ہے غلطی سے ہمارے گھر آ گئے ہیں؟"

وہ بس انہیں آنگن میں بھاگتے دوڑتے دیکھتی رہی تھی۔ تب ہی چوہدریوں کا مزارع اندر آیا تھا۔

"یہ سرفراز بابو نے دیے ہیں کہ اجمل کے گھر دے دینا۔"

نجمہ نے پلٹ کر چولہے کی طرف نگاہ کی تھی۔ مگر وہاں جوگن جوگ لے کر بیٹھی تھی۔ شیر و مر گیا تھا اور وہ اس بکری کے بچے کو کسی میت کی طرح رو چکی تھی۔ جانے کچھ سمجھ میں آیا یا نہیں مگر پھر بھی اس نے بکری کے بچے ایک رسے کے ساتھ آنگن میں باندھ دیے تھے۔

رات کو اجمل آیا تو مدعا سامنے رکھا گیا تھا۔ اس نے یخنی کے پیالے سے منہ لگایا ہوا تھا۔

"ہاں میری بات ہوئی تھی کہ سرفراز کی جیپ سے شیر و نیچے آ گیا تھا تو اس نے اسی وجہ سے بھرپائی کے لیے یہ بھیجے ہیں۔"

نجمہ نے دور چارپائی پر بیٹھی چپ چاپ سی جوگن کو دیکھا تھا۔

"سرفراز تو پورے پنڈ کا سب سے نخریلا مرد ہے۔ آج پتا چل رہا ہے کہ اتنا خدا ترس بھی ہے۔ حیرت ہے، خیر ہمیں کیا ہمارا نقصان بھر دیا یہی کافی ہے۔"

دونوں میاں بیوی اپنی اپنی جگہ خوش باش بیٹھے تھے اور جس کا نقصان ہوا تھا۔ وہ پیٹھ موڑے کچے آنگن میں مٹی کی ڈھیری کو دیکھے جا رہی تھی جہاں اس نے شیرو کو دفن کیا تھا اور اوپر نیم کے سفید پھول ڈال دیے تھے۔

جس کا نقصان ہوا تھا وہ اب بھی نقصان میں ہی رہی تھی۔

☆☆☆

عورت ذات بھی کئی بھید ہوتے ہیں کہ یہ دنیا کو ایک ہی عینک ملی ہوئی ہے ناں کہ عورت ذات ایسی ہوتی ہے ویسی ہوتی ہے۔ کوئی ان کو جا کر یہ خبر کرے کہ ساری کی ساری ایسی نہیں ہوتیں۔ بھلا ساری سزا وار کیوں ہوں۔ یہ ذات تو بہت تنوع والی اور دلچسپ ہوتی ہے۔ بس یہ ہے کہ گفتگو کا ہمیشہ سے موضوع رہی ہے اور پنڈ کی عورت تو بہت ہی کھلی کھلی سی اور سیدھی ہوتی ہے۔ موم کی عورت جدھر موڑ لو مڑ جائے گی۔ ساری نہ بھی مڑیں تو ذکو ایسی ہی تھی۔

گھر ایک تھا۔ وہی لمبے آنگن والا، سر پھوا اڑے بوڑھا نیم کا درخت، گابھن بھینسیں، چتکبری مرغیاں اور جھاڑو دیتی، دھول اڑاتی نجمہ بھرجائی جو کھڑے کھڑے اپنی باتوں سے آسمان سے تارے توڑ کر جھولیاں بھرتی تھی۔ اور دوسری ذکو جس کو پورا چاندی کے تھال جیسا آسمان میسر بھی آجاتا تو شک کی اوٹ میں رہتی۔ بہت فرق تھا۔

وہ گرمیوں کی لمبی تپتی دوپہر تھی جب گاؤں کی ساری مٹیاریں بورنگ پر نہاتے دھوتے اور گاتے پھر رہی تھیں۔ اور سب کا موضوع گفتگو ایک ہی شخص تھا۔ چوہدری سرفراز جو بلا شرکت غیرے کئی ایکڑوں کا مالک تھا۔ ایک شاندار گبرو جوان جس کے چوڑے سینے اور مردانہ وجود کی دھاک کئی پنڈوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ عورتوں کا دلچسپ موضوع گفتگو تھا۔ جب شال مونڈھے پر ڈالے وہ زمین پر قدم رکھتا تھا تو کئی کنواریوں کے دل دھڑک دھڑک جاتے تھے۔ جس کی نظروں میں ماہتاب جیسی حدت اور تیزی تھی۔ چلتا پھرتا سورج تھا۔

رضیہ کو اکثر اس کے پیچھے آہیں بھرتے دیکھا گیا تھا۔

"ہائے نی سکھیو۔ کوئی اس تک سندیس ہی پہنچا دو کہ رضیہ کا دل اس کی پہنچ سے باہر ہو رہا ہے۔"

"دن کے اجالے میں خواب مت دیکھو رضیہ۔ وہ چوہدری ہے۔ جس کی نظر میں کوئی سماتا ہی نہیں۔ کہتے ہیں بہت مغرور اور خود دماغ بندہ ہے۔ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا دل کا بھی پاک صاف ہے۔" کسی نے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہوئے پھر بھی سرفراز کی تعریف کی تھی۔

پنڈ کی ساری لڑکیوں کے ٹولے میں واحد ذکیہ تھی جو بالکل چوہدری سرفراز نامے سے انجان ہو کر بس اپنے پراندے کے دھاگے توڑ رہی تھی۔ باقی سب کی دلچسپ اور انہماک سے بالکل الٹ تھی وہ۔ امرودوں کے باغ سے خوشبوؤں کے لپٹے آرہے تھے۔ وہ انہی کے سہارے جیسے ولایت پہنچ گئی تھی کہ جس مرد کی سوچ پر وہ حق رکھتی تھی آخر اسی کو کیوں نہ سوچ لے بجائے اس کے کہ پرائے مرد کے پیچھے اوروں کی طرح ہو کے بھرتی رہے۔

"جانے سکندر کیسا تھا اور ولایت میں اس کا کام کیسا چل رہا ہوگا؟"

نجو بھی تو بھائی سے فون پر چپ چاپ کھسر پھسر لگی رہتی تھی۔ کبھی یہ تک نہ کہا کہ دو گھڑی حال پوچھ لو۔

سکندر کے سارے بھرم ذکو نے ہی رکھنے تھے۔ اور وہ ہمیشہ سے رکھتی آ رہی تھی۔ وہ شروع کا بیج اب تناور درخت بن چکا تھا۔ گھر کی دیکھ ریکھ اور چاکری نے ذکیہ پر عجیب اثر ڈالا تھا۔ انگلیوں کی پوروں پر کھردری گھاس کی ہر نشانیاں تھیں۔ بالوں میں کہیں کہیں چاندی سی چمکنے لگی تھی۔ چپل ٹوٹ جاتے تھے تو ڈیوڑھی میں بیٹھ کر ٹانک لیتی تھی۔ کپڑوں کے شاید چار جوڑے تھے جو سالوں سال

پیے تن پر تھے۔ کہیں پھٹ بھی جاتے تو پیوند لگا لیتی تھی۔ ماسی کریماں کو ہی یاد رہ گیا تھا۔

"تو مالکن ہے ذکو۔ کیوں مٹی کی ڈھیری بنی رہتی ہے؟ تیرے بھرا بھرجائی کو تجھ پر ترس نہیں آتا۔"

"ارے ماسی! کیوں میرے دل کو وسوسے اور ٹوہ کا رستہ دکھاتی ہے۔ جیسی ہوں ٹھیک ہوں۔"

ماسی کے تندور کی آگ بھڑک جاتی تھی۔ وہ اس کے پاس زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھ جاتی تھی۔

"تجھ پر تو رشک آتا تھا۔ تیری تربیت اور اٹھان تو سارے پنڈ کی نظر میں تھی۔ تو نے کیوں خود کو رول دیا ہے کملی۔"

وہ ہر بات بھول جاتی تھی۔ چاہے کوئی کچھ بھی کہے۔ وہ ایسی ہی تھی بے ضرر۔

نجو بھرجائی شہر سے کپڑوں کے ڈھیر لاتی تھی۔ سرخی پوڈر کیے مہارانیوں کی طرح پھرتی تھی اور ذکو خوش ہو کر بس اپنی بھرجائی کو دعائیں دیتی تھی۔ دعا دینا ہی ذکیہ عرف ذکو کا وصف تھا۔

☆☆☆

بہت مدت بعد سارے پنڈ میں افواہ اڑی پھر رہی تھی کہ میلا لگنے والا ہے۔ اور دور دور سے تجارتی آ رہے تھے۔ جس میں ہر عمر کے لوگوں کی دلچسپی کا سامان ملنے والا تھا۔ پنڈ کا بچہ، جوان، بوڑھا ہر کوئی خوش باش تھا۔ سب سے زیادہ عورتیں خوش تھیں کیونکہ انہیں گھر سے باہر جانے کا مواقع کم ہی میسر آتے تھے۔ اور اب گھر گھر چولہوں اور آنگن کی کچی مٹی پر بیٹھ کر یہی موضوع چل پڑا تھا۔ سب کو ہی انتظار تھا اور ہر کوئی منتظر تھا۔

پنڈ کی ساری کنواریاں شدت سے تانگ میں تھیں کہ میلہ آئے۔ بن سنور کر مٹیاریں اپنے اپنے ویہڑوں سے نکلیں۔ بتاشے اور شیرے سے لبالب جلیبیاں کھائیں۔ کانچ کی چوڑیوں کے ڈھیر خریدیں۔ علاقائی موسیقی کا اہتمام بھی تھا۔ اور پھر یہ خبر سچ ہی نکلی تھی۔

پہلی بار ذکو کی آنکھیں بھی میلے کے لیے چمک اٹھی تھیں اور وہ بھی خوشی خوشی جانے کو تیار ہو گئی تھی۔

رضیہ، کلثوم اور فرخندہ کے گروپ میں وہ بھی چل پڑی تھی۔ دوپٹے کے پلو سے کچھ روپے بندھے تھے۔ جو انجانی خوشی میں کہاں اور کیسے گرے وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔ وہ تو کانچ کی چوڑیاں پہنتے پہنتے جب پیسے دینے کی باری آئی تو دوپٹے کی گانٹھ کھل چکی تھی۔ میلے کی زمین میں دھول ہی دھول تھی۔ چوڑیاں پہنانے والی نے اپنے سامنے کھڑی لڑکی کو منتظر نظروں سے دیکھا تھا جو سراسیمہ سی ہو کر گانٹھ کھلے دوپٹے کا پلو تھامے آنسوؤں سے لبریز آنکھیں لیے کھڑی تھی۔

"اگر دینے کو پیسے نہیں ہیں تو چوڑیاں کیوں چڑھوائیں۔ چلو ساری اتار کر ڈبے میں واپس رکھ دو۔"

وہ وہیں زمین میں دفن ہو گئی تھی۔ فرخندہ لوگ اسے اکیلا چھوڑ کر آگے نکل گئی تھیں۔ آنسو پیتی ذکو نے ایک ایک کر کے چوڑیاں اتار دی تھیں۔ سارے ہجوم میں اکیلی کھڑی ذکیہ عرف ذکو کو پہلی بار ماسی کریماں کی باتیں صحیح اور سچ لگی تھیں۔

وہ وہیں سے الٹے پاؤں واپس آ رہی تھی۔ راستے کی پگڈنڈی میں کھڑا چوہدری سرفراز کتنی ہی دیر سے پنڈ کی مٹیاروں کو اسی رستے سے ہنستا کھلکھلاتا، اٹھکیلیاں کرتے اور اس کی طرف اشارے کر کے آہیں بھرتا دیکھ چکا تھا۔ وہ ٹولیاں میٹھے شیرے کی جلیبیاں کھاتے اور نئی کانچ کی چوڑیاں چھن چھن کرتے گزر رہی تھیں۔ وہیں واپسی کے رستے کی طرف وہ ہر ہجوم سے ہٹ کر اکیلی چلی آ رہی تھی۔

کچھ تھا ایسا جو پھر سے باندھ گیا تھا۔ وہ ایسے لٹے پٹے انداز میں آ رہی تھی جیسے سب کچھ کھو چکی ہو۔ دونوں ہاتھ خالی تھے۔ کلائیاں بھی چوڑیوں سے خالی تھیں۔ وہ چوہدری سرفراز پر ایک بھی نظر ڈالے بغیر گزر رہی تھی۔ وہ بھی پیچھے پیچھے آنے لگا تھا۔ انہی نشانات پر قدم دھرتا ہوا جو ذکو اپنے پیچھے چھوڑتی ہوئی آ رہی تھی۔

"تم نے چوڑیاں نہیں پہنیں؟"

وہ جیسے ٹھٹک سی گئی تھی۔ حیران رہ گئی تھی۔

"تم میرا پیچھا کر رہے ہو؟"

"نہیں تو میری اتنی جرات کہاں میں تو صرف سفر بانٹنا چاہتا ہوں۔"

اونچا لمبا شاندار مرد کندھے سے ڈھلکتی ہوئی شال جس کو پنڈ کی کنواریاں موضوع گفتگو بنا کر وقت کاٹتی تھیں۔

"میرا سفر بہت لمبا ہے۔"

"میں تھکنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ آزما کر دیکھ لو۔"

وہ راستہ روک کر کھڑی ہو گئی تھی۔ دھوپ سمٹ کر ساری کی ساری ذکیہ کی پیشانی پر آ گئی تھی۔ سنہری سی۔ روشن سی۔

"چوہدری میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں اور یہ دل لگیاں اور سب باتیں مجھے پسند نہیں ہیں۔"

وہ برا مان گیا تھا۔ بے شک وہ مقبول تھا مگر ہر کسی کی دسترس میں تھوڑی تھا۔

"میں دل پھینک نہیں ہوں۔ چاہو تو آزما کر دیکھ لو۔"

"سچے لوگ آزمانے کی باتیں نہیں کرتے۔ میرا رستہ چھوڑ دو۔"

وہ رستہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ حکم تھا تو منظور تھا۔

جب وہ پگڈنڈی کے آخری سرے پر تھی پیچھے سے آواز آ گئی تھی۔

"بہت جلد اماں کو تمہارے گھر بھیجوں گا۔"

ذکیہ کی پیشانی سے دھوپ رخصت ہو گئی تھی۔ شام ہی شام ٹھہر گئی تھی۔ وہ بے ساختہ مڑی تھی جہاں چوہدری سرفراز کی پشت نظر آ رہی تھی اور وہ زمین پر دھمک پیدا کرتے ہوئے واپس جا رہا تھا۔

وہ جو میلے سے خالی ہاتھ لوٹی تھی تو گھر پہنچنے تک آنگن میں سات رنگی چوڑیوں کے انگنت ڈبے اور شیرے میں ڈوبی جلیبیاں پہنچ چکی تھیں۔ بات نظر نظر کی تھی۔ اور ذکو کو خبر ہی نہیں تھی کہ اس کی پہچان کی نظر دنیا میں صرف چوہدری سرفراز کے پاس تھی۔

رات کی چادر پہ سلوٹ پڑی تھی اور چاند تاروں کو لکا چھپی کھیلنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ حویلی کی اونچی چھت پر کھڑا تھا۔ ایک جملے نے اسے چھت سے زمین پر گرا دیا تھا۔

"جی وہ تو سکندر کی منگ ہے، وہی سکندر جو ولایت ہوتا ہے۔"

پچھلے چار ہفتوں سے حویلی کے سارے در و دیوار اور ہر فرد خود میں گم اور اکھڑ مزاج چوہدری کو چوری چھپے ہنستا مسکراتا دریافت کر چکا تھا۔ چوہدرانی اماں نے اپنے سپاہی چھوڑ رکھے تھے کہ پتا کیا جائے کیسے اور کیونکر کیکر پر انگور اگنے لگے ہیں۔ مگر چوہدری کا تو جیسے سارے کا سارا باغ ہی اجڑ چکا تھا۔ سب ٹھیک جا رہا تھا تو پھر یہ شریک کیسے درمیان میں آ گیا تھا۔ شادی کے موضوع پر بچتے بچانے والا اب ویاہ کی بات پر چھچھوری ہنسی ہنس دیتا تھا۔ اور چوہدرائن اماں دودھ میں شہد گھول کر لاتی تھیں تو اس کی پیشانی چوم لیتی تھیں۔ ایک اکلوتا وارث ہی تو تھا وہ اس حویلی کا اور بلا کا لاڈلا۔ جس نے حویلی کی عزت کو سلامت رکھا تھا۔ جس کی تربیت میں کوئی بھی کھوٹ نہیں تھا۔

وہ اس کا چہرہ کٹورے میں بھر کر پوچھ رہی تھیں۔

"کیا ہو گیا ہے تجھے؟"

"بس بے بے دل اٹک گیا ہے میرا۔" وہ بے بس لگ رہا تھا جیسے اونچے قد کا لمبا چوڑا مرد ابھی کے ابھی رو دے گا۔

"تو بتا صبح ہوتے ہی میں اس کا ہاتھ منگ لوں گی۔ ایک ہفتے میں تاریخ طے کر کے ملکانی لے آؤں گی۔"

"جیسا آپ سوچ رہی ہیں وہ ویسی نہیں ہے بے بے۔ مگر مجھے صرف وہی نظر آتی ہے بس۔ سامنے آتی ہے تو میرے نظر زمین میں گڑ جاتی ہے۔ وہ بہت اونچی ہے۔"

وہ کیا سمجھتا تھا کہ وہ اونچی تو صرف چوہدری سرفراز کو نظر آتی ہے ورنہ تو اب ذکیہ عرف ذکو ککھ سے بھی ہولی ہو گئی ہے۔ مٹی پڑی ذکو۔ بے قیمت سی ذکو۔

"کس خاندان سے ہے؟ کون سی حویلی میں

رہتی ہے؟"

ماں بیٹے کے راز و نیاز میں شہد گھلا دودھ وہیں پڑے کا پڑا رہ گیا تھا۔

سرفراز نے تڑپ کر بے بے کو دیکھا تھا۔ جیسے حسب نسب یہ دولت امارت دیوار کھڑی کر دے گی۔ وہ تو سب چھوڑ دینے کو راضی تھا بس اگر وہ ہاں میں فقط سر ہلا دے۔

"بے بے! وہ کسی محل ماڑی میں نہیں رہتے مگر پھر بھی آپ کا پتر ساری زندگی کا مقروض ہو گیا ہے۔"

چوہدرائن نے گبرو جوان پتر کو دیکھا تھا۔ جس کی بہادری اور شجاعت ان کا زیور تھا۔ کتنا بے بس اور لاچار دکھائی دیتا تھا۔ وہ ہنس دی تھیں۔ اٹھ کر اسے سینے سے لگایا تھا۔

"مورکھ کہیں کا۔ بے بے کا امتحان لیتا ہے۔ یہ مت بھولو کہ تمہاری بے بے نچی پارکھ ہے۔ اچھے اور برے انسان کی پہچان رکھتی ہے۔"

حویلی کے در و دیوار ہی اونچے نہیں تھے بلکہ وہاں کے مکینوں کے دل بھی بہت وسیع تھے۔ سچ کہو تو کائنات لیے پھرتے تھے۔ آنکھ رکھتے تھے۔

رات کی بات تھی اور جیسے ہی صبح ہوئی تھی مرغ بانگ سے سارا پنڈ جاگ اٹھا تھا۔ وہیں حویلی کے دروازے سے وہ اندر داخل ہوئی تھی۔ پرانی چپل جو اس کی عمر کے ساتھ ساتھ کئی سفر طے کر چکی تھی۔ سفید چکن کا بوسیدہ اوڑھے سلوٹ زدہ قمیص کے ساتھ بھی آنے والی کا بھرم بہت اونچا تھا جیسے حویلی کے مکینوں سے ٹکرانے کی ہمت رکھتا تھا۔ کاش کوئی ذکیہ عرف ذکو کو بتا دیتا کہ جس در سے وہ داخل ہوئی ہے وہاں وہ انمول ہے۔ نایاب ہے۔ در سے داخلے نے اسے ٹکے کے بھاؤ سے ہیرے کے برابر کر دیا تھا۔ اب چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے۔

وہ حویلی کے سرخ صحن میں چوہدری سرفراز کے مقابل کھڑی تھی۔

"تم مجھے خریدنا چاہتے ہو؟"

"نہیں تمہیں کوئی سنگین قسم کی غلط فہمی ہو گئی ہے میں تو خود بکنے کو تیار ہوا پھرتا ہوں۔"

وہ لہجہ وہ دلنشیں انداز ذکو کو ڈگمگا گیا تھا۔ وہ جھوٹ بولتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ سچ ماننے میں متامل نظر آتی تھی۔ وہ سامنے کھڑی انگلیاں چٹخانے لگی تھی۔

"تمہیں نہیں پتا چوہدری، آج میری طرف سب چور نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ میں اس حویلی کے راستے پر آئی ہوئی سب کو نظر آ رہی تھی۔ تمہیں کیا خبر کہ چوڑیوں کے ڈبے اور جلیبیوں کے شیرے کنواری لڑکیوں کو بدکردار ثابت کر دیتے ہیں۔ میں تو بس اتنا کہنے آئی ہوں میں پہلے ہی بہت کچھ سہہ رہی ہوں مگر اب سکت ختم ہو گئی ہے۔ مجھے اور مسکلوں کے حوالے نہ کرو۔ تمہیں اپنی یہ حویلی اور زندگی ہی زیب دیتی ہے ورنہ یہ دل لگیاں اور چدریلی کی من مرضی میں کچھ نہیں رکھا۔ ویسے بھی جب چوہدرائن کو پتا چلا ناں تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گی کہ ایک کمی کمین ان کے مقابل آ گئی ہے۔"

وہ ہاتھ جوڑ کر آنسو چھپا کر بس مڑنے والی تھی۔ دوپٹے سے منہ چھپائی وہ واپس ہونے کو تھی۔ چوہدری سرفراز تو بت بن گیا تھا۔

برآمدے کے ستونوں کی اوٹ سے چوہدرائن نے سامنے دیکھا تھا۔ پنڈ والوں کی نظر میں، بھرا بھرجائی کی نظر میں، سکندر کی نظر کا فیصلہ ابھی باقی تھا۔ کہ وہاں وہ کوئلہ تھی تو حویلی کی حدود میں وہ ہیرا تھی۔ وہ پلٹ گئی تھی۔ وہ ہنس دی تھیں۔

چوہدری سرفراز نے سناٹے کی کیفیت میں گردن پھیر کر بے بے کو دیکھا تھا۔ وہ قدم قدم چل کر اس تک آئی تھیں۔

"اسے کسی محل یا اونچی حویلی میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے پتر۔ وہ اپنے ساتھ بہت کچھ لیے پھرتی ہے۔ یہ حوالے اس کی تعریف پر مکمل نہیں اترتے۔ تو پھر بتاؤ کب جاؤں اس کے گھر؟"

وہ تھکے تھکے انداز میں رنگیل پیڑھی پر ڈھے گیا

تھا۔

"وہ مجھے دھمکا کر گئی ہے۔"

"تو تم ڈر گئے ہو کیا؟"

"بے بس ہو گیا ہوں بے بے۔"

"میں کل ہی جاتی ہوں اس کے گھر۔"

"نہیں بے بے، اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

"کیوں؟" وہ سخت حیران ہوئی تھیں۔

"وہ کسی اور کی منگ ہے۔"

چوہدرائن نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا تھا۔

"تم نے اس کی آنکھوں میں کسی اور کو دیکھا ہے کیا؟"

"وہ آنکھوں میں دیکھنے ہی کہاں دیتی ہے۔ یہ حق تو صرف وہی رکھتی ہے کہ جسے چاہے دیکھے میں کچھ نہیں کہہ پاتا۔"

☆☆☆

ذکیہ کا صبر رنگ لایا تھا۔ سننے میں آ رہا تھا کہ سکندر ولایت سے واپس آ رہا تھا۔ نجمہ بھرجائی اور پھوپھی کی تیاریوں نے اسے بھی پرجوش کر دیا تھا۔ وہ بھی جیسے آسمانوں میں اڑنے لگی تھی۔ بات بات پہ ہنستی تھی۔ ماسی کریماں کو وہ اس روپ میں بہت بھلی لگی تھی۔ تب ہی وہ بار بار اسے یاد دلا رہی تھیں۔

"ذکو اپنی نظر اتارا کر۔"

وہ چولہے کی مالک تھی۔ آگ کی تپش میں کئی نظریں اتار لیتی تھی۔

وہ صبح جب سکندر نے آنا تھا۔ چھاجوں چھاج مینہ برسا تھا اور ہر طرف جل تھل ہو گئی تھی۔ وہ بھی نجو کی مہربانی سے نئے کپڑے پہنے، آنکھوں میں کاجل کی دھار لیے تیار ہو گئی تھی۔ رضیہ سے خوشبو ادھار مانگ کر بھی لگا چکی تھی۔ مہندی سے ہاتھوں پر گل بوٹے تک بھی بنوا چکی تھی۔ جوگن کا کوئی نام تھا تو ذکیہ عرف ذکو تھا۔ روگ کا کوئی رنگ تھا تو بھی ذکو کا رنگ تھا۔

وہ صبح سے شام تک چولہے کے گرد چکراتی جانے کیا کیا پکاتی رہی تھی۔ دیسی مرغی کا سالن، کھیر، بھنے ہوئے بٹیر ہر وہ چیز جو سکندر کو پسند تھی۔ شام ہونے والی تھی۔ ذکیہ کے دل کی ٹک ٹک بڑھنے لگی تھی۔ جب گھر کے داخلی دروازے سے وہ پھوپھی کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا۔ سارے آنگن میں ولایتی سینٹ کی خوشبو پھیل گئی تھی۔ اونچا لمبا سکندر کتنا گورا چٹا اور پیارا ہو گیا تھا۔ وہ بس دیکھتی رہ گئی تھی۔ وہ چولہے سے اٹھ کر سلام کرنے ہی لگی تھی کہ وہ پھوپھی کے ساتھ ہی چولہے والی کو نظر انداز کرتا اندر چلا گیا تھا۔ وہ وہیں کھڑے کی کھڑی رہ گئی تھی۔

کیا وہ ذکو کی موجودگی سے انجان تھا؟

کیا اسے خبر نہیں تھی کہ جوگن منتظر بیٹھی ہو گی؟

کیا وہ بھول گیا تھا کہ وہ دعائیں کر کے اس کی سلامتی مانگتی تھی؟

کیا سب بھول گئے تھے کہ وہ ذکو کا گھر تھا؟

دل میں دور دور تک سیاہ اندھیرا پھیل گیا تھا۔

وہ آگ جلا رہی تھی۔ اپلوں کا دھواں آنگن میں پھیل گیا تھا۔ وہ پھونک مارنے کو جھکی تھی تو بالوں کی لٹ کو آگ نے چھوا تھا۔ بال جلنے کی بساند سے اسے رونا آ گیا تھا۔

اجمل اور سکندر کے ساتھ ساتھ نجو اور پھوپھی کے قہقہے بھی گونجتے رہے۔ نجو نے اس دن کتنے غرور سے کہا تھا۔

"سکندر کو اگر خبر ہو گئی کہ تیرے لیے غیر مرد چوڑیاں اور جلیبیاں بھیجتے ہیں تو کھڑے کھڑے رشتے سے انکار کر دے گا۔ بدکردار عورت کو کوئی قبول نہیں کرتا۔ تجھے کیا لگتا ہے چوہدری تجھے حویلی میں جگہ دے گا؟ سوچ ہے تمہاری ایسے لوگ صرف وقت گزار کر پھوک تھوک دیتے ہیں۔"

نجو بھرجائی کی آواز میں زہر اور قہر تھا۔ وہ بس ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھتی رہی تھی۔ اگر واقعی سکندر نے انکار کر دیا تو؟

صحن میں چھوڑی ہوئی ہڈیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ وہ بھوکی بیٹھی رہ گئی تھی۔ بس جب وہ واپس جانے لگا

تو چولہے کے پاس رکا تھا۔ ایک لمحے کے لیے یونہی پل بھر کے لیے۔

"نجو! تم نے اس کے لیے ابھی تک کوئی رشتہ نہیں دیکھا کیا؟"

چولہا جیسے ذکو کے سر پر الٹ گیا تھا۔ سواہ نے اس کی آنکھوں کو اندھا کر دیا تھا۔

وہ دریا چناب لیے اجمل بھرا کو دیکھتی رہی۔ اجمل نے نظر پھیر لی تھی۔ پھوپھی اور نجو سکندر کو ساتھ لیے دروازے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

"شرم کر ذکیہ۔ کچھ اماں ابا کی ہی لاج رکھ لی ہوتی۔ میں جلد ہی تمہارے لیے کوئی رشتہ دیکھتا ہوں۔ مجھے نجو نے سب بتا دیا ہے۔ وہ تو اس نے مجھے روک دیا ہے ورنہ میں کیا کچھ نہ کر گزرتا۔" وہ الفاظ کا تھپڑ رسید کر کے ڈگ بھرتا آگے بڑھ گیا تھا۔

ذکو کی سسکی نے آسمان کی طرف سفر کیا تھا۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی ساری رات روتی رہی تھی۔ اجمل نے اسے جیسے زندہ درگور کر دیا تھا۔ ٹرنک کھول کر کھڑی رہی۔ اماں کے پرانے کپڑے لتے دیکھتی رہی۔ چاندی کے پرانے برتن فرش پر ڈھیر کر دیے۔ سونی کلائیاں۔ وہ ٹوٹ ٹوٹ کر روتی تھی۔

اگلے دن وہ چادر اوڑھے پورے اہتمام سے ماسی کریماں کی طرف آئی تھی۔ جس کا تندور ٹھنڈا پڑا تھا۔

"ماسی کریماں نے اس کے سوال پر مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔ پوپلے منہ سے خوشی وہ گلے سے لگ گئی تھی۔"

"ہائے کریماں صدقے...... کریماں قربان۔"

بات خوشبو کی مانند پھیل گئی تھی۔ سکندر نے ذکو کے لیے انکار کر دیا تھا۔ پنڈ میں ایسے انکار پر لڑکیاں کھوہ کی طرف دوڑتی تھیں۔ موت کے رستے دیکھتی تھیں۔ وہ ذکیہ تھی۔ سرما کی دھوپ سی۔ گرما کی حرارت سی......!

نجو بھر جائی اور اجمل کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

جب چوہدرائن مٹھائی ٹوکروں کے اہتمام کے ساتھ داخلی دروازے سے اندر آئی تھیں۔ چوہدرائن تھبے والی اور اونچی عورت تھیں۔ ان کی شخصیت اور رعب میں سارا پنڈ گرفتار تھا۔ وہ سیدھا گنگ کھڑے اجمل کی طرف آئی تھیں۔ نجو کو انہوں نے پرے کر دیا تھا۔ ایسے جیسے چھوت کو پرے کرتے ہیں۔

"مجھے تو لگا تھا تم مرد ہو اور مردوں جیسا فیصلہ کرو گے مگر تمہارے آدھے فیصلے تو تمہاری بیوی کرتی ہے۔ ماں بہنیں سانجھ کے رشتے ہوتے ہیں۔ اگر سب گواہی دے رہے ہیں تو تم کون ہوتے ہو ذکو کو بدکردار کہنے والے۔ اوپر والے کی پکڑ سے ڈرا اجمل۔ تو نے تو چن ورگی کو رول کر رکھ دیا ہے۔"

چن ورگی پیر کے ناخن سے زمین کریدتی کھڑی رہی تھی۔

ماسی کریماں نے اپنا کام کر دیا تھا۔ ذکو کی اینٹ حویلی کی عمارت میں ہی فٹ ہوئی تھی کیونکہ وہ ویسی ہی اونچی تھی۔

☆☆☆

گلابی شام کے بھیتر کئی بھید چھپے تھے۔ پنڈ کی فصلوں کی چوٹیوں پر نارنجی رنگ گھلنے لگے تھے۔ سارے پنڈ نے طمطراق سے چوہدرائن کو اجمل کے گھر جاتے دیکھا تھا دیواروں پر کئی چہرے ٹنگے ہوئے تھے۔ کنواریوں کے دل ڈوب گئے تھے۔ بھلا جھلی اور نمانی ذکو کا کیا جوڑ تھا سرفراز سے؟ ہر طرف سرگوشیاں اور سوال بکھر گئے تھے۔

وہ دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ جب چوہدرائن نے اس کے مقابل آ کر تھوڑی اونچی کی تھی۔ اور سرگوشی میں بولی تھیں۔

"ایک بات سچ سچ بتاؤ میں صرف تمہاری بات کا یقین کروں گی۔"

وہ کھڑے کھڑے جیسے کانپ گئی تھی۔ وہ تو جیسے اب پچھتا رہی تھی کہ ماسی کے ہاتھوں پیغام ہی کیوں بھجوایا تھا کہ پگ اور پیوند کا بھلا کیا جوڑ تھا۔ وہ

بس سر ہی ہلا سکی تھی۔

"وہ گھر کے صحن میں جواب لینے کو ٹہل رہا ہوگا، میں اپنی اولاد کی بے چینی سے بخوبی واقف ہوں۔ مگر میں چاہتی ہوں تم دونوں کے بارے میں فیصلہ جو بھی ہو صاف صاف ہو۔ تو پھر مجھے بتاؤ تمہارے دل میں کیا اب بھی سکندر ہے؟"

وہ کسی کیل کی طرح ٹھونک دی گئی تھی۔ چہرے پر رنگوں کی یورش تھی۔ سامنے ایک ماں کھڑی تھی۔ منتظر، سوالیہ نشان بنی ہوئی تھی۔

اتنے پیار سے دلار سے تو ذکیہ عرف ذکو سے کسی نے پوچھا ہی نہیں تھا۔ اس نے خالی صحن میں نظر پھرائی تھی۔

اجمل بھرا اور نجو بھرجائی کی طرف بھی نگاہ کی تھی۔ دیواروں پر بھی کئی شکنے ہوئے تھے۔ ہر چہرے پر لذت تماشا کشید کرنے کی چاہ تھی۔

اتنے ہجوم میں جیسے کوئی کندھا لینے کھڑا تھا۔ وہ چناب دریا جیسی ذکو وہیں بہنے لگی تھی۔ لباب آنسوؤں سے بھری آنکھیں اوپر کو اٹھی تھیں۔

"صبح سے شام تک میں پکوانوں کی تیاری میں لگی رہی۔ میں نے آنکھوں میں کاجل بھی ڈال لیا۔ رضیہ سے سینٹ بھی مانگ لائی جو اس کے بھائی نے سعودیہ سے منگوایا تھا۔ آگ نے میری کلائی تک جلا ڈلی۔ پھپھولے بن گئے۔ سکندر نے سلامتی تک نہیں بھیجی۔ میرا دل کے انتظار کا یہ صلہ ملا مجھے۔ اجمل بھرا مجھے بدکردار کہتا تھا۔ نجو بھرجائی کو لگتا ہے حویلیوں والے دل پھینک ہوتے ہیں۔ سب کی اپنی اپنی بات ہے۔ کوئی مجھ سے پوچھتا ہی نہیں۔"

حویلی والی کی آنکھ میں پہچان کے کئی رنگ اترے تھے۔ صحیح پہچانا تھا چوہدری سرفراز نے اس کو۔

"میں پوچھ رہی ہوں تم سے۔ مجھے بتاؤ۔"

وہ اب بھی جلی ہوئی کلائی کو تھامے ہوئی تھی۔

"عورت ذات ہوں انتظار کی سولی پر کھڑی تھی۔ عورت کو تو منسوب کر دو تو دل کی بنیاد کھڑی کر کے بیٹھ جاتی ہے۔ میں بھی یہی کی۔ دیکھیں، اگر اماں ابا زندہ ہوتے تو ٹوٹی ہوئی چپل اور پھٹی ہوئی چنری اوڑھنے دیتے ذکو کو؟ نہیں ناں۔ میلے سے سوغاتیں لا لا کر بانٹیں میں نے۔ ذکو کو صلہ نہیں چاہیے۔ میں ایسے تھوڑے دل کی نہیں ہوں۔ آپ پوچھتی ہیں سکندر کے لیے میرے دل میں کچھ ہے؟"

چناب جل تھل تھا۔ سے بھیگ رہا تھا۔

"میری سونے کی جھمکیاں جو اماں نے بنوا کر دی تھیں۔ جو میری جان سے بھی زیادہ پیاری تھیں۔ وہ تک میں نے اس شخص کی ہتھیلی پر دھری دی تھیں۔ آج وہ پیسے والا ہو گیا ہے تو سب ہی کچھ تولنے لگا ہے؟ مرد کی زبان ہی اس کی پہچان ہوتی ہے۔ ادھر وہ ہے چوہدری سرفراز جس کو میری سونی کلائیاں اور ہتھیلی کی بھوک تک نظر آ گئی۔ کتنا فرق ہے کون کیا دیکھتا ہے۔ آپ ہی بتائیں ذکو کو کس کو دیکھے۔"

چوہدرائن کی پلکوں نے پانی کا بوجھ بڑی مشکل سے اٹھایا تھا۔ وہ اس کے کندھے چھوڑتے اجیل تک آ گئی تھیں۔

"تو وارث ہے ذکیہ کا۔ میں اپنے پتر سرفراز کے لیے ذکو کا ہاتھ مانگتی ہوں۔ بدلے میں جو بھی مانگ لو چاہے تو چوہدری سرفراز کی پوری جائیداد لے لو۔ تمہاری ماں جائی ہر دولت سے قیمتی ہے۔"

شال کے پلو برابر کرتے ہوئے پرحکمت چال سے چوہدرائن دیہڑا پار کر گئی تھی۔ صحن میں پھل فروٹ اور مٹھائیوں کے ٹوکرے رکھے تھے۔

☆☆☆

وہ رات سب پر بھاری رہی بس آج پہلی بار چولہے میں بیٹھی جو گن سکون میں تھی کہ صرف ایک سندیسہ بھیجا تھا اور وہ اس کی طرف لپک آیا تھا۔ محبت نے عزت کی آواز لگائی تھی۔ اس سے بڑھ کر بھلا کیا ہو سکتا تھا۔

نجو بھرجائی ساری رات بکتی جھکتی رہی تھی۔ وہ تو

ہمیشہ کی طرح خاموش تھی ہی مگر اجمل کو بھی جیسے کوئی سانپ سونگھ گیا تھا۔ زرد بلب کی گرد کے ٹکڑوں میں بٹی روشنی میں اجمل نے سر اٹھا کر چولہے کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ اماں ابا زیادہ پیار ذکو سے کرتے ہیں۔ تب اسے خار ہی محسوس ہوا کرتی تھی اور جب اماں ابا ہی گزر گئے تھے تو خار زندہ رہ گئی تھی۔ جیسا ماں ابا کی چارپائی سے کچھ پرے وہ اپنی چارپائی ڈال لیتا تھا۔ آج کل اسی جگہ پر ذکو تھی۔ ماں جائی کو دیکھنے کے لیے اجمل کو بہت مدت بعد وقت ملا تھا۔

''ذکو! ادھر آ ذرا!''

وہ چونکی تھی اس لہجے اور انداز سے تو وہ کبھی بھی آشنا نہیں رہی تھی۔ بس حکم کی تعمیل کرتی ہوئی سامنے آ گئی تھی۔

''نجو کہتی ہے وہ سکندر اور پھوپھی کو سمجھائے گی۔''

وہ جملہ جیسے ڈنک بن گیا تھا۔ ذکو ڈس گئی تھی۔ اب بھلا ایسے کیسے؟ وہ جو ایک صدا پر چلا آیا تھا اب انکار اس کا کیا حال کرے گا۔

''آپ پھوپھی کو کہیں مت آئیں۔''

''کیوں چوہدرائن کی بات مان لوں کیا؟'' لہجہ ہلکی چبھن لیے تھا۔

''ان کی بھی مات مانیں، میری مان لیں۔ چوہدرائن کو لگتا ہے میرے جانے سے ان کی حویلی کی شان بڑھے گی۔ وہ اور اونچی ہو جائیں گی۔ مجھے تو عزت سے مطلب ہے۔ وہاں کوئی الزام تو نہیں ہوگا۔'' وہ سسک پڑی تھی۔

''وہاں میری جوتیاں ٹوٹی ہوئی نہیں ہوں گی اجمل بھرا۔ میری چنی میں کوئی پیوند نہیں ہوگا۔ اب مجھے شرم آنے لگی ہے۔''

وہ پلٹ گئی۔ اجمل کی نظر پیروں پر پڑی تھی۔ ماں جائی کے پاؤں کی تین انگلیاں چپل سے باہر تھیں۔ سر پر اوڑھے دوپٹے میں عین سر کے اوپر ایک پیوند تھا۔

اجمل کو پل بھر کو لگا وہ ننگا ہو گیا ہو۔ اور اس کی ماں جائی نے ہی اسے ڈھانپ رکھا ہو۔ دل کو ایک دم دھکا لگا تھا۔ نظر قریب چارپائی پر رخ موڑے پڑی نجو کی طرف گئی تھی۔ اس کے جوتے نیچے پڑے تھے نئے نکور اور ریشم کا دوپٹا سر پر تھا۔ چولہے میں دھواں پھیل گیا۔

اگلی صبح پھوپھی اور سکندر ہانپتے کانپتے آن پہنچے تھے۔ نیم والا ویہڑا، جگالی کرتی بھینسوں کو ایک اور تماشا ملنے والا تھا۔

''آئے ہائے ایسے کیسے اپنا خون پرائے لوگوں کو دے دیں۔''

''تو سکندر رے نے کیوں انکار کیا؟'' اجمل کا ٹھنڈا لہجہ تھا۔ سکندر سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''ارے ولایت سے ہو کر آیا ہے مگر عقل نام کو نہیں۔ بس اگلے ہفتے کی تاریخ دو میں ذکو کو لے جاؤں گی۔''

آج سب مسکرا رہے تھے۔ نجو بھرجائی نے چولہا سنبھال لیا تھا۔ سکندر بار بار برآمدے کی طرف دیکھتا تھا۔

''اصل میں بات یہ ہے پھوپھی کہ ذکیہ نے اس رشتے سے انکار کر دیا ہے۔''

نجو کا ہاتھ جیسے انگارے پر جا پڑا۔ سکندر نے برآمدے کی طرف پھر دیکھا تھا۔

''وہ لڑکی ذات میں تو پہلے ہی کہ۔''

اجمل اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

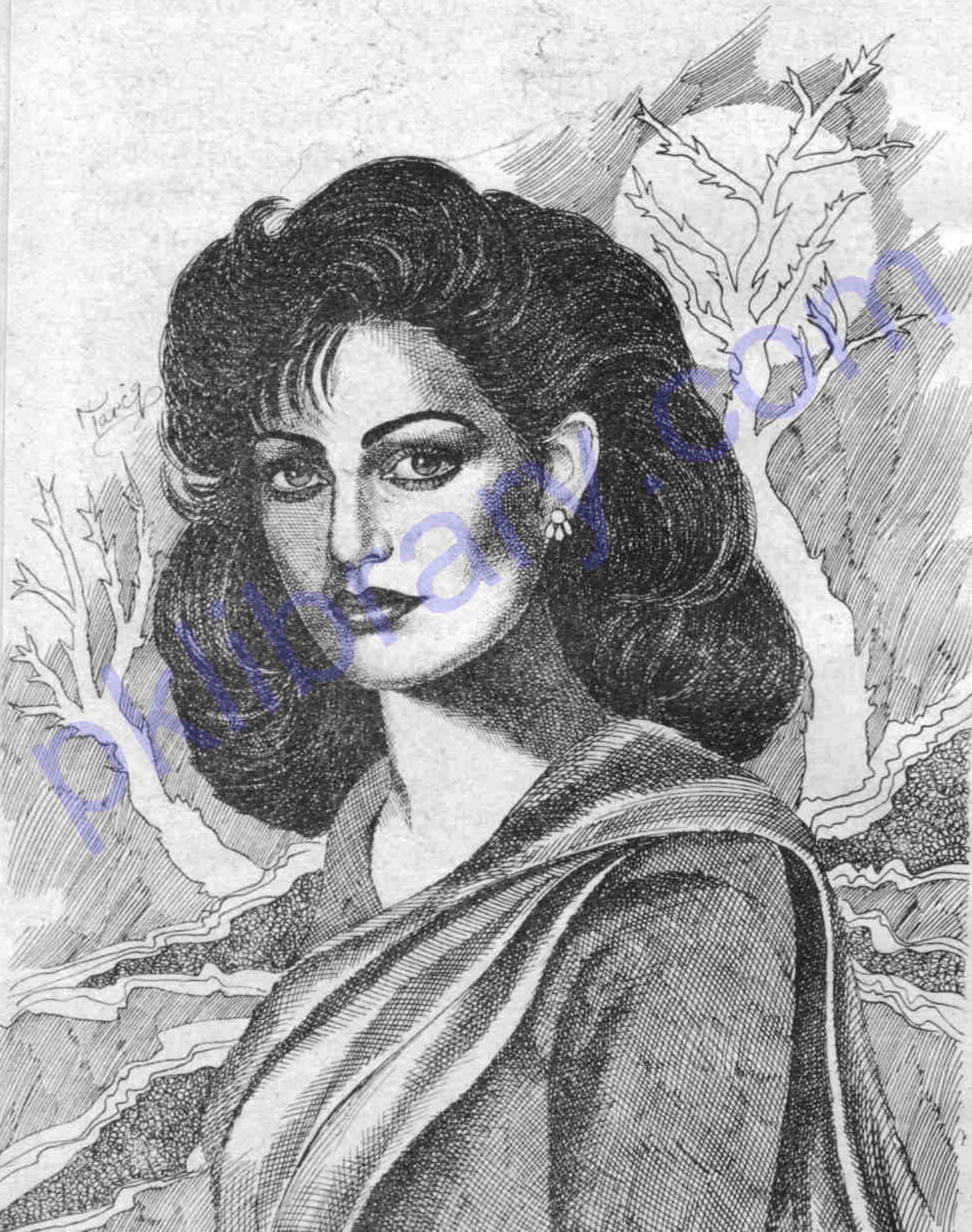
''مجھے سارا زیور واپس چاہیے جو سکندر کے وقت ہم نے دیا تھا۔ اگلے ہفتے ذکو کا نکاح ہے۔''

سب کو چپ لگ گئی تھی۔ خاموشی ٹہلنے لگی تھی۔

ذکو کو نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا تھا۔

''شکریہ میرا گھر مجھے بتا کر دینے کے لیے او رمیری دعا ہے کہ میرا اور بھبیریوں کا گھر کبھی نہ ٹوٹے۔''

☆☆


pklibrary.com

ہمارے اندر نئی خواہشوں کے انگڑائیاں لینے کا کوئی سیزن ہے نہ موقع، یہ کہیں بھی کبھی بھی وقوع پذیر ہو جاتی ہیں۔ جیسے ابھی ابھی ایک نئی نکور خواہش نے اس قاتلانہ انداز میں انگڑائی لی ہے کہ کوئی حضرت شاعر دیکھ لیں تو ایک عدد دیوان تو قلم بند کر ہی ڈالیں۔

ہوا یوں کہ کزن بھائی کی شادی کا موقع پر سارا خاندان جمع تھا اور سامعین کی خاصی تعداد دیکھ کر بڑی باجی جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھیں۔ ہم بڑے انہماک سے باجی کو زبانی پوری دیانت داری اور دل جمعی سے بیان ہوتا 'ساس نامہ' سن رہے تھے۔ وہ جھوٹ کی آمیزش کے بنا، مصلحت کے ریشم میں لپٹے بغیر جوان کے دل میں تھا اور جوان پر گزر رہا تھا حرف بہ حرف حاضرین، ناظرین وسامعین کے ذہین، بصارت وسماعت کے سپرد کر رہی تھیں۔ یہ وہی باجی ہیں جو شادی سے پہلے سابقہ منگیتر وحالیہ شوہر سے اپنا 'محبت نامہ' بیان کرتے نہ تھکتی تھیں بلکہ سننے والوں کو تھکا دیتی تھیں مگر اب ان کی باتوں میں محبت کا اتا پتا تھا نہ اس بندہ خاص کا ذکر۔ تڑا تڑ ابل رہے جملے اور جلے بھنے الفاظ ایک ہی ہستی کی شان میں تھے۔ بقول باجی ان جیسی معصوم دوشیزاؤں کو فریب دینے کی خاطر دنیا نے جسے سسرال، کا نام دے رکھا ہے وہ دراصل قید بامشقت بھگتانے والی جیل ہے اور ایک جابر صیاد کو لوگ ازراہ تفنن ساس کہنے لگے ہیں سو اب شادی سے پہلے والی داستان گل وگلزار کی جگہ داستان آہ وزاری تھی۔

اس قصہ زور وستم میں جو بات ہمارے نازک مزاج اور اس سے بھی نازک دل کو دہلا گئی وہ باجی پر لادے گئے کام کی فہرست تھی۔ اب کیا بتائیں، ہم اتنے سادہ ہیں جو کام کیے بنا گزارا ہو سکتا ہے ہم اسے کرتے ہی نہیں، جو کل پر ٹالا جا سکتا ہے اسے آج کرنے جیسے کوتاہ اندیش بھی نہیں اور کفایت شعاری کا عالم تو نہ پوچھیں محنت، وقت، پیسہ، پانی، توانائی الحمدللہ سب بچا لیتے ہیں۔ باجی کی داستان کے اسی پڑاؤ پر ان کی باتوں میں ہماری دلچسپی وفات پا گئی اور ہم اس پر فاتحہ پڑھتے اس محفل سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

بس یہی وہ پل تھا جب ایک خواہش نے انگڑائی لی کہ ہمارے حصے میں باجی جیسا شادی سے پہلے والا محبت نامہ ہو نہ ہو لیکن شادی کے بعد کا 'ساس نامہ' قطعی نہیں ہونا چاہیے۔ باجی کے بیانات کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اگلے گھر راج کرنے، یعنی واقعتاً تخت پر بیٹھ کر آرام وہ زندگی گزارنے کے لیے پیا من بھانے سے زیادہ ضروری ہے ساس من بھانا۔ یعنی ام سرتاج کی سلطنت میں رانی، ان کی ام کے دل کو جیتے بنا نہیں جا سکتا ہے۔
بس یہی وہ لمحہ جمال وکمال تھا جب ہم نے طے کیا ہماری لو اسٹوری ہو نہ ہو مدر ان لاء اسٹوری لازمی ہونی چاہیے جو دنیا کی تمام لو اسٹوریز سے میٹھی ہو بلکہ یہ منفرد لو اسٹوری ساری دنیا میں اپنی طرز کی پہلی اور آخری...... نہ نہ آخری نہیں پہلی ہی ہونی چاہیے جو دنیا میں ایک نئے رومانی جوڑے کی بنیاد ڈالے ساس اور بہو!

ہماری خوش دامن ہم سے اس قدر راضی اور خوش ہوں کہ تخت پر بٹھا کے رکھیں ہمیں، ہل کر پانی تک نہ پینے دیں، ہمارے لیے خادمائیں نہ سہی خادمہ کا انتظام تو کر ہی دیں وغیرہ وغیرہ۔ اس وغیرہ وغیرہ کی طویل فہرست کا تصور اس قدر سہانا تھا کہ اس خیال کے آتے ہی ہم نے مستقبل کی مشقتوں سے بچنے کے لیے فی الوقت مشقت کے لیے کمر کس لی۔

ہمارا ذہن اور اعضاء ہنگامہ خیزی سے پرہیز کرتے ہیں کہ اس میں وہ خطرات تھے جن کی وجہ سے 'حرکات ید وپا'، گزیر ہو جاتی ہیں لیکن اس وقت ہماری، 'کفایت شعار' طبیعت پر مستقبل کے ساس نامہ سے بچنے کا بھوت سوار تھا اور ہم پر یکا یک مثبت سوچوں کی یلغار ہونے لگی تھی اور انسان ارادہ کر لے تو پھر اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں، ساس بہو کی

لو اسٹوری بھی نہیں، جیسے زریں خیالات ذہن میں کلبلا رہے تھے۔

چوں کہ شادی کا گھر تھا تو ہماری خواہش کے لیے موزوں ومناسب ہدف کافی تعداد میں موجود تھے۔ لیکن ہماری نگاہیں ایک مغموم، شکل سے معصوم اور مزاج سے ذرا معموم سی نظر آنے والی خاتون کی تلاش میں تھیں۔ مغموم اس لیے کہ ہمیں غم دور کر کے انہیں رام کرنے کا طریقہ آسان لگ رہا تھا۔ اب آپ سے کیا چھپانا، اس سے پہلے ہم نے خاندان بھر کے لائق فائق اور قابل بیاہ عمر کو پہنچ چکے نوجوانوں کی ان کی امیوں سمیت ایک مینٹل لسٹ مرتب رکھی تھی۔ مشکل یہ تھی کہ فلمیں، ناول، ڈرامے، گانے کوئی گائیڈ نہیں کرتا کہ کسی خاتون کو دیکھ کر سسرالانہ جذبات پھڑک اور مچل جائیں تو اس خاتون پر ڈورے کیسے ڈالے جائیں۔ اب بھی دانشوروں کے لیے کتنا کام ہے اس دنیا میں کرنے کو مگر افسوس اس نازک معاملے کی جانب کسی کی توجہ ہی نہیں کہ ان معاملات میں، سیلف ہیلپ، قسم کے کتابچے مارکیٹ میں لانچ کیے جائیں تو ہاتھوں ہاتھ بک جائیں۔ خیر! اب ہمارے پاس اتنا وقت تو تھا نہیں کہ دانشوروں کے ہوش کے ناخن لینے تک انتظار کرتے اس لیے خود ہی اپنی دانش مندی پر انحصار کرنے کا ارادہ کیا۔

کچھ سوچ وچار اور ردوکد کے بعد جلد ہی ہمیں مطلوبہ خصوصیات والی آنٹی مل گئیں۔ یہ خالہ جان کی نند اور ان کی بڑی پکی سہیلی تھیں۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ اتنی نرم دل ہیں گویا سینے میں دل کی جگہ روئی رکھ دی گئی ہو۔ اور ان کی معقولیت کے لیے اکلوتا سپوت کافی تھا۔ سن رکھا تھا کہ مغموم ہونے کی وجہ بیٹی نہ ہونا ہے۔ جس کی انہیں بڑی حسرت وآرزو تھی اور ہمیں اس کمی پر کمینی سی خوشی ہو رہی تھی کہ ہم بیٹی بن کر ان کا یہ غم دور کر دیں گے۔

ہم چشم تصور میں انہیں پروانہ اور خود کو شمع کیے ان کے اردگرد منڈلاتے رہے۔ اس مہم کا درجہ اول تھا ان کی نگاہ خاص یعنی "ام فیوچر شوہر" والی نظر کا ہم پر پڑنا اور انہیں ہم میں اپنی بہو نظر آنا۔ اس کے لیے ایک طرف کھڑے ہو کر ان کی نگاہیں خود پر پڑنے کا انتظار کرنے کے بجائے لازم تھا کہ ہم خود ان کے دائرہ نگاہ میں قدم رنجہ فرماتے اور شادیوں والے گھر میں اس کا آسان طریقہ "جائے" تھا۔

چائے بنائی تو تھی بوانے تھی، لیکن اس دور پرفتن میں بنا کام کیے اس کا کریڈیٹ لینے کا ہنر آرٹ آف لیونگ کا حصہ ہے، جس میں ہم کسی قدر مشاق تھے۔ ٹرے لیے۔ نظر جھکائے ہم سب سے پہلے ان کے پاس پہنچے اور کپ اٹھا کر انہیں پیش کیا۔

"آنٹی! آپ کی چائے۔"

"بیٹا میں......"

"جی ہم جانتے ہیں آپ کے لیے الگ سے بنائی ہے بنا چینی کے۔" ہم نے مسکراہٹ کو عاجزانہ، شریفانہ اور معصومانہ رکھنے کی پوری کوشش کی تھی۔

"جیتی رہو۔" انہوں نے خوش دلی سے کہتے ہوئے کپ تھام لیا اور ہم پہلی کامیابی پر جوش کو سنبھالتے آگے بڑھ کر دوسروں کو کپ تھمانے لگے جن میں ہماری 'اصلیت' سے واقف حاضرین کی نگاہوں کی حیرت، بے یقینی، تمسخر اور معنی خیزی کو ہم نے ایسے نظر انداز کیا جیسے تازہ خون کی تاک میں بھنبھناتا مچھر، اسے بھگانے کے لیے فضا میں لہراتا آپ کا ہاتھ نظر انداز کرتا ہے اور آپ کا خون چوس کر ہی دفع ہوتا ہے۔

اس پہلے مرحلے کے بعد اب ہم ہمہ وقت ست خرامی سے قدم اٹھاتے اس سے بھی آہستگی سے گفتگو فرماتے، ہر بات کے بیچ سر جھکاتے، سر اٹھاتے تو دس فی سیکنڈ کے حساب سے پلکیں جھپکاتے، نیچرل لک کے لیے ڈھیر سارا میک اپ خرچ کرتے، بالوں سے زیادہ تعداد میں پنوں کے استعمال سے بڑا سادہ دوپٹا سر پر جماتے، مشرقی حسن اور لکھنوی تہذیب کی زندہ مثال بنے بزرگوں کی محفل میں گھسے رہتے۔ اس احتیاط کے ساتھ متوقع ساسو ماں کے رڈار سے باہر نہ ہوں۔ ہمیں اس

صوفیانہ حال میں جو انہیں سو قیانہ لگ رہا تھا دیکھ کر ہماری جنریشن کو ہمارے خلل دماغ سے لے کر خلل معدہ میں مبتلا ہونے تک کے ساتھ شکوک گھیرے تھے لیکن ہمیں پروا نہ تھی۔ ہماری سوچ اور منصوبہ بندی تک وہ کوئی پہنچ ہی نہیں سکتی تھیں۔

ہمارے ہدف کو شبہ نہ ہو کہ وہ ہمارے نشانے پر ہیں اس لیے ضروری تھا کہ ہم دیگر خواتین اور بزرگان کو بھی پروٹوکول دیتے۔ ساری ہوشیاری یہی تھی کہ ان کے گرد جال بنتے ہوئے انہیں احساس نہ ہونے دیا جائے کہ دانہ چگتے چگتے چڑیا پھنس گئی ہے۔

جلد ہی ہمیں اندازہ ہوا کہ 'جائے' کے نازک کندھے متاثر کرنے کا سارا بار نہیں اٹھا سکتے اور ہمیں انہیں مرغوب کرنے کے نت نئے حربے ڈھونڈنے پڑے۔ اس کوشش میں ایک دن ان کے دائرہ توجہ میں بیٹھ کر شوبی کے دوپٹے پر لیس ٹانکی، جب شوبی نے وہ دوپٹا دیکھا تو اسی کا پھندا بنا کر ہمیں پھانسی دینے پر مصر ہوگئی۔ ایک دن عینا باجی سے ان کا سال بھر کا بیٹا ان کی گود سے لے لیا کہ ہم اسے سلا دیتے ہیں اور یقین کریں جب متوقع ساسو ماں سامنے سے اٹھ کر گئیں تو اس بچے کو واپس ماں کی گود میں پھینکتے ہوئے ہم نے طے کیا کہ بچے پیدا ہی نہیں کریں گے بلکہ ریڈی میڈ پانچ چھ سال کے کہیں سے لے لیں گے۔

کبھی ان کے متورم پیروں پر ٹکور کے لیے نمک والا نیم گرم پانی ان تک پہنچایا۔ کبھی انہیں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں ہاتھ تھام کر لے گئے تو کبھی اسی طرح اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر کا سفر طے کروایا۔ برات اور ولیمے میں بھی ہم ان کا اور دیگر ساس کیٹگری والی خواتین کا سایہ بنا رہے تا کہ کسی کو شک نہ ہو۔ کبھی سہارا دے کر کار سے اتارا، کبھی کھانے کی میز پر ان کے لیے ویٹر سے کبھی بھیڑ سے بچا کر ان تک ڈائٹ کوک پہنچایا تو کبھی ان کا دوپٹا سیٹ کر دیا۔ کبھی آنٹی کی لپ اسٹک کو ٹچ اپ دے دیا تو کبھی ان کی ڈریسنگ کی تعریف میں قلابے ملا دیے۔ جب وہ ہر بار بڑے مشفق تبسم کے ساتھ ہمارا شکریہ ادا کرتیں اور دعائیں دیتیں تو ہمارا دل جھوم جھوم اٹھتا۔

ہمیں ایک موہوم سی امید تھی کہ شادی کے بعد گھر کی راہ لینے سے پہلے وہ ہمیں بلیغ نہ سہی خفیف سا اشارہ ضرور کریں گی مگر ایسا ہو نہ سکا یا ہم اب بھی اس قدر معصوم تھے کہ سمجھ نہ سکے اور اس متوقع اشارے کے بعد ہماری وہ گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر مناسب مقدار میں حیرت اور حیا کی آمیزش والا ردعمل دینے کی ریہرسل بے کار ہی گئی۔

شادی کے اختتام پر مستقبل میں کام سے بچنے کی سعی میں اتنے کام کر لیے تھے کہ لگا اب کچھ مہینے بستر پر ہی گزار دیں۔ چوں کہ مہمان جا چکے تھے سو ہماری ہڈحرامی بھی لوٹ آئی تھی۔ گھر والے جو ہماری حرکتیں دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے ہمیں پلنگ توڑتا دیکھ سکون کا سانس بھر اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے تھے۔

ہمیں ایک بہترین پریزینٹیشن کے بعد اب نتیجے کا انتظار تھا۔ اچھے نتیجے کی امید میں اول وقت میں نمازیں ہونے لگی تھیں اور دعاؤں کا وقفہ طویل ہو گیا تھا۔ نماز سے زیادہ وقت دعا میں لگنے پر گھر والوں کو ایک بار پھر خدشات گھیرتے اس سے پہلے اچھی خبر آ گئی۔

اس دن ہم خوب مل مل کر دعا کر رہے تھے۔

''یا اللہ! اتنا کام کر لیا ہے پچھلے دنوں میں کہ اب عمر بھر کے کاموں سے نجات دے، مشقت کا سایہ نہ پڑے ہم پر، ہماری ریاضتوں کا پھل ہمیں نندوں جٹھانیوں سے پاک سسرال کی صورت عطا کر، ان پیاری سی آنٹی کے بیٹے کا رشتہ بھیج دے......'' وہ رقت آمیز التجائیں تھیں کہ دعائیں شرف قبولیت پا کر لوٹ آئیں۔

ابھی مصلی لپیٹا بھی نہیں تھا (جو ہم ویسے بھی اگلی نماز کے لیے بچھا ہی چھوڑ دیتے ہیں) کہ بھابھی نے اسی آنٹی کے برخوردار کے رشتے کی خبر سنائی اور ہم

وہیں سجدے میں گر پڑے۔ بھابھی سمجھیں ہم شرما گئے ہیں۔ اس خبر کے سنتے ہی سارے خاندان نے دانتوں تلے انگلیاں دبالی تھیں۔ جنہیں اڑتی چڑیا کے پر گننے کا دعویٰ تھا ان کی اپنی نظر میں ہی دعوے کی صداقت مشکوک ہوگئی تھی اور ہم پہلی بار جتنے منہ اتنی باتیں انجوائے کررہے تھے۔ ایک دو کزن تھیں ہماری جنہوں نے اس رشتے کے تار شادی کے دوران ہماری پھرتیوں سے جوڑ لیے تھے اور ان کے درست اندازوں کو ہم نے اب پچھتاوے کا ہووت......" والی نظر سے دیکھنے اتنا ہی درخوراعتنا جانا۔

☆☆☆

اللہ اللہ کر کے شادی ہوئی اور ہم سسرال پدھارے۔ ہم امید کررہے تھے حجلۂ عروسی میں بھی شاید ساسو ماں پہلے آکر ہماری بلائیں لیں گی مگر خیر ان کے سپوت کو دیکھ کر بھی ہمیں مایوسی نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ہمارا گھونگٹ الٹے بنا ہی کہنا شروع کیا۔

"سعدی کی شادی میں آپ کو مما کی اتنی خدمت کرتے دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا تھا ورنہ آج کل کی لڑکیاں کہاں بزرگوں کو اتنی اہمیت دیتی ہیں۔"

"ہائے! تو ساسو ماں نے بیٹے سے بھی ہماری تعریفیں کررکھی ہیں۔" ہمیں شریری گدگدی ہونے لگی۔

"مجھے آپ جیسی حساس طبیعت اور نرم دل شخصیت کی ہی تلاش تھی جو مما کا خیال اپنی ماں کی طرح رکھے۔"

"اُفف!" ہمیں پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں والی فیلنگ آرہی تھی۔ ہم نے غائبانہ اپنی پیٹھ تھپتھپا ڈالی۔

"آپ کی انسان دوست، مستعد طبیعت اور خدمت گزاری کا جذبہ دیکھ کر ہی ہم نے مما کے سامنے آپ کا نام لیا تھا......"

"ہیں! یہ اچانک ٹریک کیوں بدل گیا؟" ہم نے سوچتے ہوئے پہلو بدلا۔

"میری آپ سے عاجزانہ گزارش ہے کہ آپ مما کا اسی طرح خیال رکھیں، ویسے ہی ان کی خدمت کریں تو جلد ہی وہ بھی آپ کو پسند کرنے لگیں گی۔"

ہم انگلی سے کان کے پردے پر دستک دی مگر یہ تو عقل سے پردہ اٹھنے کا سمے تھا۔ ہم تو خدمت کروانے کے خواب آنکھوں میں سجا کر اس گھر میں آئے تھے اور یہ شب عروسی میں ہماری آنکھوں میں دولہا میاں کون سے خواب سجا رہے تھے۔

"انہیں میرا خود سے آپ کو پسند کرلینا پسند نہیں آیا، وہ اس بات پر خفا ہیں، بڑی مشکلوں سے اس شادی پر رضامند ہوئی تھیں۔"

"ہم نے جھٹکے سے گھونگٹ سر پر پھینکا۔ ہم اماں پر نظریں ٹکائے تھے اور بیٹا ہم پر...... غلط بندہ متاثر ہوگیا، تیر نشانے سے چوک گیا۔

"مما ناراض ہوں تو بہت مشکل اور ضدی ہوجاتی ہیں، مقابل کو کوئی رعایت نہیں دیتیں۔ انہیں بدسلیقگی، بے ترتیبی، کام میں دیری بالکل نہیں پسند اس لیے مجھے یقین ہے کہ آپ ان کا دل جیت لیں گی، اس قدر سلیقہ مند اور ہنرمند جو ہیں، ہمہ وقت کام میں مصروف اور......"

منتوں مرادوں اور مشقتوں سے حاصل ہوئی خوش دامن کے بیٹے کی بات جاری تھی اور ہم ہکا بکا منہ کھولے سوچ رہے تھے۔ "یہ کیا کر بیٹھے ہم...... مدر ان لاء اسٹوری کی چاہ میں یہ تو لو اسٹوری ہی بن گئی تھی۔ اس سے تو اچھا ہوتا ہماری کوئی اسٹوری نہ ہوتی یعنی عربی والی 'لا' اسٹوری!"

"آپ کل صبح سے ہی مما کے سامنے کام شروع کردیں تو......"

ہم ہیروئنوں کی طرح کان پر ہاتھ رکھ کر آسمان لرزا دینے والی، "نہیں!" کی صدا لگانا چاہتے ہیں لیکن ہم ہلنے سے قاصر ہیں۔ کیا ہم فوت ہوگئے ہیں یا مستقبل قریب میں نظر آرہی متوقع حرکات بددعا نے ہمیں منجمد کردیا ہے؟ آپ ہی بتائیں...... پلیز فوت والا آپشن زیادہ خوش کن ہے وہ ہی کہیے گا۔

☆☆

فلک تنویر

صنم تراش

مکمل ناول

آئینے کے سامنے کھڑا وہ اپنے چہرے کو تک رہا تھا۔ ہلکی بڑھی ڈاڑھی، جس کی دو ہفتے پہلے حجامت کی تھی...... یاسیت بھری آنکھیں اور ان آنکھوں تلے گہرے حلقے...... اس کی آنکھوں میں رت جگوں کی سرخ ڈوریاں رقصاں تھیں۔ کوئی بھی اس کا یہ حالیہ حلیہ دیکھ پہچان نہ پاتا کہ وہ زرک خان تھا۔ وہ تو کوئی لٹا پٹا جوگی تھا...... جس کا کیسری لباس کئی میل سفر کی دھول سے اپنا رنگ بدل چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کشکول نہ تھا کیونکہ وہ کشکول تو وہ اسی کے در پر توڑ آیا تھا، جس کے سامنے اس نے اپنا کشکول پھیلایا تھا۔

"آج کے بعد نہ میرا تم سے کوئی تعلق ہے اور نہ میرے خاندان میں سے کسی کا...... اگر کسی نے تم سے رابطہ کیا یا بات کی تو اس سے بھی میرا کوئی تعلق نہیں......"

اس کے کانوں میں کسی ہتھوڑے کی طرح ضرب مارتی آوازیں گونج رہی تھیں اس نے گہری سانس بھر کر، تھوک نگلا اور گیلے بال ٹھیک کرتے ہوئے وہ پشاوری چپل پہن کر باہر نکلنے لگا۔ کمرے سے باہر نکل کر ایک طویل راہداری تھی، جس میں خاموشی اور ٹھنڈ بیک وقت محو استراحت تھی۔ راہداری کے پکے فرش پر ہلکی سی دھول جمی تھی، راہداری کے پار ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا اور سرخ اینٹوں سے بنا صحن...... چار دیواری کے قریب کیاریوں میں پھول تھے اور امرود اور انار کے درخت...... جو بچے کبھی کبھی کھلے دروازہ کو دیکھ کر، سارا خالی کر دیتے......

جب وہ گھر کو باہر سے تالا لگا کر نکل رہا تھا تو حسب معمول گلی میں انار کے درخت کی لٹکتی شاخوں میں اناروں کو بچے ڈنڈے سے مار گرانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ اس کو دیکھ بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ لحظے بھر کے لیے ہنسا تھا۔

اس کو قاسم کی عیادت کرنے جانا تھا۔ قاسم اس کی بڑی خالہ کا نواسا تھا۔ جب وہ یہاں منتقل ہوا تھا، تو اتمان زئی میں قاسم ہی تھا، جو اس کے برے وقت میں اس کے ساتھ تھا۔ کچھ دنوں سے وہ اپنے نئے مجسمے کی تیاری میں مگن تھا جب دو ہفتوں سے قاسم نہیں آیا تو پوچھنے پر اس کو پتا چلا کہ وہ بیمار ہے۔

"ایسا بیمار ہے کہ ڈاکٹروں کو بھی اس کی بیماری کا پتا نہیں چل رہا...... شیر پاؤ، ایل آر ایچ کی چکریں تک کاٹیں...... لیکن بیماری اس کی جان نہیں چھوڑ رہی...... لوگ تو کہہ رہے ہیں کہ جادو ٹونا ہوا ہے۔ اس کی پھوپھیاں ہیں نجھی بنگالیوں جیسی...... ایسی کالی کالی صورتیں...... استغفار...... سنا ہے وہ بابا گانوں (باباؤں) کی جھونپڑیوں میں جایا کرتی ہیں۔ اس صیاد درزی نے تو اس کو رنگے ہاتھوں پر انے قبرستان میں تعویذ دفن کرتے دیکھا تھا۔" اس کو بتانے والا قاسم کا والی بال کا دوست تھا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔

"اللہ شفا دے۔" کہہ کر وہ گھر چلا آیا تھا۔

ابھی سہ پہر کی دھوپ سمٹ کر چبوتروں اور منڈیروں پر سرک رہی تھی۔ وہ جب رخسانہ آپا کے گھر کے دروازے پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ان کے گھر کے میں پڑوس کی عورتوں کا جمگھٹا تھا۔ وہ واپس پلٹنے ہی لگا تھا جب اس کو رخسانہ (قاسم کی ماں) نے دیکھ لیا۔ وہ فوراً اس کے پاس آئیں۔

اس نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ رخسانہ آپا اس کی ماں کی عمر کی تھیں،

توان کے درمیان خالہ زاد والا رشتہ نہ تھا۔ وہ اس کو قاسم جیسا ہی سمجھتی تھیں۔

''رازہ (آؤ!)'' وہ اس کو کمرے لے گئیں۔

صحن میں عورتیں کھڑی چارپائی پر لیٹے قاسم کو دیکھ رہی تھیں اور کچھ نے پلٹ کر اس کو دیکھا۔ اس نے پل بھر کو قاسم کے سرہانے' کچی زمین پر بیٹھی اس لڑکی کو دیکھا' جس نے گھٹنوں میں سر دیا ہوا تھا ......اس کے سر پر سیاہ دوپٹا تھا' مہندی رچے پیر مٹی سے اٹے تھے......

''میں شربت لے کر آتی ہوں۔'' رخسانہ آپا اس کو کمرے میں بٹھا کر باہر چلی گئیں۔

کمرا کچا تھا اور بج بھی۔ کھڑکیاں کھلی تھیں اور کچے دیواروں پر سفید چونا تھا۔ پر چھتی پر نفاست سے رکھے برتن اور اس کے عین اوپر بڑے سے فریم میں رخسانہ آپا کے مرحوم شوہر کی تصویر۔ اس نے کھلی کھڑکی سے دیکھا تو اس لڑکی کا رخ اب اس کے



سامنے تھا۔ وہ تحیر بھری نظروں سے باہر ہجوم کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کس لیے جمع تھے اور صحن میں قاسم کی چارپائی کیوں پڑی تھی؟۔ سوالات کافی تھے لیکن اس کے جواب اگر خود کوئی دیتا تو ٹھیک ورگرنہ اس نے جوابات جاننے کی کوشش نہیں کرنا تھی۔

"یہ لو۔" آپا اس کو شربت کا جام دے کر اس کے ساتھ ہی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ ان کے چہرے پر تھکان کے آثار تھے۔ باہر بیٹے کی چارپائی کو دیکھتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو امڈنے لگے اور جب بولیں تو ان کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

"یہ دو ہفتے ایسے گزرے جیسے قیامت۔ نہ دن کی خبر' نہ رات کی۔ جانے کون سی بیماری میرے ہنستے مسکراتے ضوان (جوان) بیٹے کو چمٹ گئی کسی جن کی طرح۔ لوگوں نے کہا کہ جادو ہے تو پیروں کی درگاہوں پر بیٹھی رہی...... پھر لوگوں نے کہا کہ بیماری ہے تو اسپتالوں کے چکر کاٹے......"

"آپ نے مجھے بتایا بھی نہیں' آپا۔" وہ بھیگے لہجے میں بولتی آپا' کو بیچ میں نرمی بھرے شکوہ کناں لہجے میں بولا۔ آپا نے سر جھٹک کر اس کو دیکھا اور ہلکا سا مسکرائیں۔

"تم پہلے ہی کافی تکلیف سہہ رہے ہو' بچیا (بچے)......"

ان کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ وہ بہت خوددار عورت تھیں۔

تم سوچ رہے ہو کہ یہ خواتین کیوں جمع ہیں؟" اس کی سوالیہ نظروں میں چھپے سوال کو سمجھ کر انہوں نے پوچھا تھا۔ "دراصل...... وہ پرانے مسجد کے مولانا صیب نے کہا تھا...... کہ......"

ان کا سر جھک گیا...... وہ شرم تھی' پچھتاوا تھا' یا پھر جھجک...... وہ سمجھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ ان کے اگلے جملے نے اس کا سانس تک کھینچ لیا۔ وہ یک ٹک آپا کا چہرہ دیکھے گیا۔

"...... کہ اگر کوئی اپنی زندگی دان کر دے تو وہ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ بس چارپائی کے گرد' اگر وہ تین چکر کاٹے تو بیمار کی ساری بیماری اس کو لگ جائے گی...... ایسا کئی بار ہوا ہے اور بہت کارگر بھی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ باچا خان (مشہور سیاست دان) کی بیگم نے بھی باچا خان کے لیے اپنی زندگی قربان کی تھی (باچا کی سوانح عمری سے ماخوذ)۔ ان کے گرد چکر کاٹ کر وہ بیمار ہو بیٹھیں اور باچا خان جگ جوڑ (صحت یاب)......"

زرک کی نظریں فوراً کھڑکی کے پار گئیں۔ جہاں وہ لڑکی ہنوز اسی انداز میں بیٹھی تھی...... گھٹنوں میں سر دیے...... وہ اپنے بھائی کے سرہانے' وہ اپنی زندگی قربان کرنے بیٹھی تھی۔ کیسی روایت تھی یہ' کیسی جہالت...... اس نے گردن گھما کر پہلو میں بیٹھی آپا کے چہرے پر پچھتاوا دیکھا لیکن ان کی آنکھوں میں ٹھہرے اس لڑکی کے عکس پر' چارپائی میں بیمار لیٹے بیٹے کا دکھ بھاری تھا۔

اس نے کہنا چاہا کہ یہ کیسی جہالت ہے؟ لیکن کمرے میں اندر داخل ہوتے آپا کے دیور اور ان کے بیٹوں کو دیکھ کر آپا فوراً اٹھیں...... باہر صحن میں عورتوں نے راستہ دیا گھٹنوں میں سر دیے اس سیاہ دوپٹے والی لڑکی نے سر اٹھا کر دیکھا...... تو اس کی آنکھیں کسی بھی احساس سے عاری تھیں۔ بالکل خالی' کھوکھلی' ویراں آنکھیں۔

کچھ عورتوں نے پلو منہ پر رکھے تھے اور کچھ ایک دوسرے کے کانوں میں کھسی سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ اس آپا نے جھک کر لڑکی کے کان میں کچھ کہا تھا۔ اس نے اٹھ کر سر پر دوپٹا ٹھیک کیا اور سر جھکا کر چارپائی کے گرد چکر کاٹنے لگی۔

زرک کے سینے میں درد اٹھنے لگا' یہ کیا جہالت تھی...... کون سا علاج تھا...... سراسر بدعت...... پاس کھڑے لوگ تماش بین تھے اور تسبیح پڑھتے قاسم کے تایا اور ان کے بیٹے بھی...... وہ فوراً اٹھا اور جلدی سے باہر جانے لگا۔ آپا اس کو جاتا دیکھ کر رکیں اور اس کے پاس آئیں۔

"رک جاؤ زرک۔ چائے چڑھا دی ہے

.......رات کا کھانا......"

"نہیں آپا۔ بس میں چلتا ہوں۔" اس نے جلدی سے ان کی بات کاٹ کر کہا۔

معاً وہ لڑکی ٹھوکر کھا کر گری۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ بیٹھ کر کراہتی اپنے پاؤں کے انگوٹھے کو گھور رہی تھی۔ نظروں کی حدت پا کر اس نے سر اٹھا کر زرک کو دیکھا اور دونوں کی نظریں ملیں۔

زرک غلط تھا' اس کی آنکھیں احساسات سے عاری قطعاً نہیں تھیں......وہاں تو درد کا ایک بیکراں سمندر بہہ رہا تھا۔ زرک کو اس لڑکی کی آنکھوں سے خوف آیا اور فوراً سے بیشتر وہ پلٹا تھا، وہ وہاں ایک پل نہیں رہنا چاہ رہا تھا۔ اس کے کانوں میں وہی بازگشت گونج رہی تھی......

"میرا اس سے کوئی تعلق نہیں......"

☆☆☆

ساری رات وہ اسٹوڈیو میں بیٹھا رہا۔ اس کا مجسمہ' جس کے چہرے کے خدوخال میں اس نے محض آنکھیں بنائی تھیں۔ clay (گارا) سے بنے اس مجسمے کی خالی آنکھیں' اس کو گھورتی رہیں اور اس کے کانوں میں بہت ساری آوازیں گڈمڈ ہو رہی تھیں کئی منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ اسے گھٹن سی محسوس ہوئی تو اس نے کھڑکیاں کھولیں اور لیٹ گیا۔ کھلی کھڑکی سے چاند جھانکتا رہا اور اس کی آنکھوں میں بے خوابی کھیلتی رہی۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ لگی تھی۔ جب وہ اٹھا تو دیوار گیر گھڑی میں دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ وہ اٹھا اور باورچی خانے میں اپنے لیے چائے بنانے لگا۔ ایسے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک دینے والے ہاتھ عجلت پسند معلوم ہوتے تھے۔ وہ تیزی سے دروازہ کھولنے لگا۔ دروازہ کھولا تو سامنے آپا' سفید برقع پہنے کھڑی تھیں۔

"السلام علیکم آپا......آیے۔" اس نے آپا کو راستہ دیا۔

آپا اندر داخل ہوئیں' تو انہوں نے سر سے برقع اتارا اور گہری سانس لی۔

"اللہ بخشے برکت ماماجی (ماموں) کو۔ ساری زندگی بے اولادگی کے طعنے سنتے رہے اور آخر میں پورے خاندان کے سامنے کہہ دیا تھا تمہارے کہ میرا تعلق تو رہے گا اس کے ساتھ' میرا بیٹا ہے آج سے یہ۔ مرنے سے پہلے وہ بے اولاد نہ تھے۔ دیکھو گھر کتنا سونا سونا لگ رہا ہے۔ وہ ہوتے تو سارا دن ان کا ریڈیو ٹیپ بجتا رہتا۔" آپا اندر برآمدے میں بچھائی گئیں چارپائیوں پر بیٹھ گئیں۔ وہ خاموشی سے ان کو سنتا رہا۔

"آپا! چائے پئیں گی؟"

"ہاں' لیکن دودھ مت ڈالنا' تورے سچے (بغیر دودھ کے کالی چائے) لانا' گلا خراب ہو چکا ہے......ساری رات خوشی کے آنسو روتی رہی ہوں۔" بتانے لگیں۔

اس کے قدم وہیں تھمے تھے۔ "قاسم ٹھیک ہو گیا؟" وہ بے یقینی سے پوچھ رہا تھا۔

"تم چائے لاؤ' بتاتی ہوں سب کچھ۔" آپا مسکرائیں تو ان کی مسکراہٹ میں ان کی کافی دنوں کی تکان پنہاں تھی۔

وہ سر ہلاتا ہوا باورچی خانے چلا گیا۔ اس کی سوچوں کا محور' کچی زمین پر ننگے پیر بیٹھی اس لڑکی کے گرد گھومنے لگا۔ جس نے آپا کی فرسودہ سوچ کے زیراثر اپنی زندگی قربان کر دی تھی۔ قاسم کی صحت یابی کے پیچھے یقیناً کوئی اور بات تھی۔ وہ اس جاہلانہ بات پر یقین نہیں کر پا رہا تھا۔

جب وہ چائے بنا کر لایا تو آپا ویسے ہی بیٹھے ہوئے کیاری میں لگے امرودوں کو دیکھ رہی تھیں۔ "برکت ماماجی نے دو چیزوں سے بہت پیار کیا......ایک ان کیاری میں لگے درختوں سے اور ایک اپنے ریڈیو ٹیپ کو......ہائے اس گھر کی اینٹ اینٹ سے ماماجی کی یادیں ٹپکتی ہیں۔" چائے کی پیالی تھام کر آپا پرانے وقت کی یاد میں کھوسی گئی تھیں۔

کچھ دیر تک، وہ خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ آپا جب چائے پی چکیں، تو اس کی اور رخ کر کے کہنے لگیں۔

"تم نے پوچھا نہیں، میں کیوں آئی ہوں؟"

"میں یہ کیوں پوچھوں گا آپا...... آپ جب بھی آئیں، مجھے کوئی مسئلہ تھوڑی ہوگا آپ کے آنے سے......" اس نے نرمی سے کہا۔

"وائی زارا!" توقف کے بعد آپا گویا ہوئیں۔ "دراصل میرے آنے کا ایک بڑا مقصد ہے۔ سر سے واری گئی لڑکی کی کوئی وقعت نہیں رہتی، اس کا ہاتھ کسی کو بھی دے آؤ...... ملنگ، بدمعاش، غریب، لیونئے (پاگل)...... کیونکہ اس کے لیے کوئی اچھا رشتہ نہیں آنے والا ہوتا۔" آپا تول تول بول رہی تھیں۔ اور وہ جو بے دھیانی میں سن رہا تھا۔ ایک دم اس نے سر اٹھا کر آپا کی نظروں میں دیکھا اور اگلے ہی پل وہ ان کی بات کی تہہ تک جا پہنچا تھا۔

"نہیں...... نن...... نہیں آپا......" اس نے آپا کو ٹوکنا چاہا لیکن وہ ویسے ہی بولے جا رہی تھیں۔

"میری زرمینے کے لیے کوئی اچھا رشتہ نہیں لائے گا۔ یا تو گھر پر پڑی رہے گی یا پھر......" رک کر اس کے نفی میں ہلتے سر کو دیکھ کر انہوں نے کہا۔ "تم اس سے شادی کر لو بیٹے۔ ویسے تمہارے نام پر......"

"آپا...... اللہ کے لیے...... بس کر جائیں......" اس کی کنپٹی کی رگوں میں خون ابلنے لگا ایسا لگنے لگا کہ جیسے اس کی رگیں پھٹ جائیں گی۔

"...... تمہارے نام پر بیٹھی رہے گی۔ یہ گھر، جو ویراں پڑا ہے۔ اس کو سنوار دے گی۔ تمہاری خدمتیں کرے گی۔ میں تم سے اس کے ساتھ بیوی کے ساتھ رشتے کا تقاضا بھی نہیں کر رہی ہوں...... بس اس کو اپنے نام کر لو......"

"آپا! میں...... شادی......" اس کی سانسیں بے ربط ہونے لگیں، اس نے اٹھ کر پانی پینا چاہا لیکن اس سے اٹھا نہیں گیا۔ اس کی دل کی دھڑکنیں بے ربط ہونے لگی تھیں۔ لیکن آپا اپنی بھیگی آنکھوں کے پار، اس کی حالت نہیں دیکھ پا رہی تھیں۔

وہ جس کے آگے ہاتھ پھیلا رہی تھیں، جس سے بھیک مانگ رہی تھیں...... وہ تو خود دھتکارا گیا تھا...... اس کے در سے، جس کے در پر وہ فقیر بن کر گیا تھا اور بے مراد لوٹا تھا۔ وہ جس کا خیال کسی سوئی کی طرح اس دل میں چبھ کر اس کا دل زخمی کر دیتا تھا۔ وہ جس کی باتیں اس کے کانوں میں گونجتی ہیں اور اس کی صورت آنکھوں میں ٹھہر گئی تھی...... وہ...... جس کو آپا جانتی تھیں...... آپا سب جانتے ہوئے بھی کہہ رہی تھیں۔

"دیکھو، اس جھریوں سے بھرے میرے بوڑھے ہاتھوں کو...... تمہارے سامنے پھیلا رہی ہوں۔ وہ...... وہ گلاب خان (زرمینہ وقاسم کا تایازاد) اس کو نکاح میں لینا چاہتا ہے۔ تم جانتے ہو نا، کتنا ظالم ہے وہ۔ اس کی پچھلی بیوی سے اس کی کوئی اولاد نہیں۔ وہ اولاد کے لیے نہیں...... میری کلی کو مسلنے کے لیے یہ نکاح کرنا چاہتا ہے۔" آپا اب زار و قطار رو رہی تھیں۔

اس نے گہری سانسیں لیں اور ان کے جڑے ہاتھ تھام کر نرمی سے نیچے کیے۔

"آپا! میں نہیں کر سکتا شادی...... اس جاہلانہ سوچ کی وجہ سے نہیں...... بس میں "کسی سے بھی" شادی نہیں کرنا چاہتا۔" زرک نے نرم لہجے میں کہا اور اٹھ کر اندر کمرے میں آ گیا۔ جیسے ہی وہ کمرے میں آیا، ایک بار پھر سے اس کی حالت بگڑنے لگی۔ اس نے پانی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں، اس کے گلے میں کانٹے اگ آئے تھے۔

"میرا اس سے کوئی تعلق نہیں...... کوئی بھی اس سے تعلق نہیں رکھے گا۔" وہی اس کا پیچھا کرتی آوازیں۔

"تم اس کو نہیں چھوڑ سکتے...... تو مجھے چھوڑ دو...... میں تمہیں چھوڑ رہی ہوں...... میں تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔" کسی بریخنہ کی طرح، اس کے کانوں میں یہ دو آوازیں گونجتی رہیں......

☆☆☆

اس کی طبیعت فی الحال سنبھل گئی تھی۔ سارا دن وہ اسٹوڈیو میں بیٹھا اپنا کام کرتا رہتا۔ سارے میں تازہ گارے کی' اور ربڑ کی خوشبو چکراتی رہتی اور اس کے ہاتھ گارے سے اٹے رہتے۔ وہ گھنٹوں لگا رہتا اور اپنے تازہ مجسمے کے چہرے کے خدوخال بناتا رہتا...... اس کے سامنے رکھے کینوس پر کوئی ریفرنس تصویر بھی نہیں تھی۔ شاید وہ جس کا مجسمہ بنا رہا تھا' اس کے چہرے کو وہ بھی بھولا ہی نہیں تھا......

اس کو یہاں' اتمان زئی چارسدہ آئے چھ ماہ' ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ اس چھ ماہ میں کسی نے بھی اس سے رابطہ نہیں کیا۔ مور جانے' عباس لالہ' نبیل' طلعت جہاں' جمیلہ کسی نے بھی نہیں...... لاشعوری طور پر نہیں' وہ اپنے پورے شعور میں ان میں سے کسی کے ملنے کے انتظار میں تھا۔ برکت ماما اس کو ساری رات گلے لگا کر کہتے تھے۔

"ایک دن سب کا خون جوش مارے گا اور ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوگا۔ وہ تم سے ملنے ضرور آئیں گے۔"

وہ غلط تھے۔ کسی کے خون نے بھی جوش نہیں مارا' شاید ان کی رگوں میں خون برف ہو چکا تھا۔ پھر جب ماموں کو خود بھی لگنے لگتا کہ وہ غلط ہیں' تو وہ اس سے یہی جملہ کہتے لیکن آخر میں 'لیکن اگر' لگا کر مزید اضافہ کرتے۔

"لیکن اگر تم خود چاہو تو یہ سب چھوڑ دو جاؤ...... ان کے پاس۔"

اس کو مزید تکلیف ہونے لگتی۔ ماموں پھر سے اس کو سمجھانے لگتے۔ جب تھک ہار جاتے تو 'سردار علی ٹکر" کے ٹیپ شدہ غزلیں لگا کر باہر صحن میں چارپائی کھینچ کر' چادر ناک تک کھینچ کر سو جاتے۔ ساری رات سردار علی ٹکر کی آواز گونجتیں اور وہ خاموشی سے ایک ہی جگہ بیٹھا رہتا۔

زندہ دل قاسم' زندگی اور موت کے دوراہے پر جنگ لڑ کر واپس آ چکا تھا۔ اس کی زندگی میں اس کے صرف دو اپنے تھے۔ زرینہ اور رخسانہ آپا۔ لیکن انہوں نے اپنی زندگیوں پر اس کی زندگی کو فوقیت دی...... بدعت کر کے' گناہ کر کے...... وہ اب قاسم اور اپنا موازنہ کر رہا تھا۔ اس کو پیار کرنے والوں نے جانے نہیں دیا تھا' کس کر پکڑے رکھا...... اور اس کو دھتکار ملی...... ایک اس انسان سے...... جس سے اس نے سب سے بڑھ کر محبت کی...... نغمہ۔ اور ایک اس انسان سے...... جس کی محبت کے لیے وہ ہمیشہ ترستا رہا...... اس کا باپ۔

اس کو آپا کی منت وزاری یاد آئی اور پھر اپنی دھتکار...... آپا کے بندھے ہاتھ اور پھر بارش میں بھیگا اس کو اپنا وجود یاد آیا...... پھر اس نے خود کو اور زرینہ کو ایک ہی ترازو میں تولا...... اور دھتکار کے وزن میں اس کا وجود بھاری نکلا۔ کیا وہ اپنی بدقسمتی کی سیاہی سے زرینہ کے ماتھے کو سیاہ کرنے کی جسارت کرر کھ سکتا تھا؟

اس کے جواب میں انکار واضح تھا۔ مزید کام کرنے سے اس کا دل اچاٹ ہوا اور وہ اٹھا۔ اور وہ غسل خانے میں گھس گیا۔ اس کو قاسم کی عیادت کرنے جانا تھا۔

☆☆☆

ستمبر کی دوپہروں میں اب حدت نہ تھی۔ نہ ہی بلاوجہ پسینے کے پسینے آتے تھے۔ زرک۔ زنے بھورے رنگ کا کاٹن زیب تن کیا تھا۔ اس کے اجلے سفید چہرے میں ہلکی پیلاہٹ کا شائبہ تھا۔ آنکھوں تلے حلقے اور ان میں بے خوابی کی سرخ ڈوریوں کی مستقل مزاجی تا حال قائم تھی۔

آپا کے گھر کے سامنے بہتا نالا اور اس پر بنایا گیا چھوٹا پل پار کر کے جب وہ ان کے گھر داخل ہوا تو اتفاق سے آج پھر سے ان کے گھر میں بھیڑ تھی لیکن اس بھیڑ میں عورتوں کی تعداد کم تھی۔ کچے برآمدے میں آپا اپنے سفید دوپٹے کا پلو منہ پر رکھے بہت کرب و برداشت سے' قاسم کے سرہانے بیٹھی تھیں۔ ان کے دوسرے ہاتھ میں ہاتھ والا پنکھا'

جس کو جھلاتے وہ قاسم کو ہوا دے رہی تھیں۔ سامنے ان کے دیور، دیورانی اور ان کے بیٹے۔

"السلام علیکم!" وہ کھنکار کر آگے بڑھا اور سلام کیا، سب کی گردنیں پیچھے اور رخسانہ آپا کی اس پر نظر پڑتے ہی آنکھوں میں روشنی کے دیپ جلنے لگے۔ یوں جیسے مشکل گھڑی میں اچانک کوئی اپنا مدد کرنے آئے تو آنکھیں جھلملا اٹھتی ہیں۔

"وعلیکم السلام! رازہ ضوانہ (آؤ جوان)!" قاسم کے تایا کفایت کے ماتھے پر ابروؤں کے بیچ الف بن گیا تھا لیکن یہ اس کو دیکھ کر نہیں تھا...... ان کی کرختگی کے سبب تھا۔

وہ سب سے مل کر، پھر قاسم کے گلے لگ کر بیٹھ گیا اور اس کا حال احوال پوچھنے لگا۔

"زرمینے! زرک آیا ہے...... شربت لاؤ نیمبو (لیموں) ڈال کر......" آپا نے زرمین کو آواز دے کر کہا۔

"بھئی تو پھر کیا سوچا تم نے رخسانے؟" قاسم کی تائی نے پوچھا۔ "اب تو الحمدللہ قاسم بھی صحت یاب ہو چکا ہے۔ بس تم بتاؤ، اپنا دیکھا بھالا ہے گلاب خان......" انہوں پاس بیٹھے گلاب خان کو دیکھا۔ جس کے ہونٹ چرس پی پی کر انتہائی کالے ہو چکے تھے۔ "الحمدللہ مونز گزارہ (نماز پڑھنے والا) تبلیغی...... نظر کی حفاظت کرنے والا...... ایسا داماد کبھی نہیں ملے گا تمہیں رخسانے اور اس حالت میں تو کبھی بھی نہیں، کہ جب تم نے اس کو اپنے بیٹے کے سر وار دیا ہے۔ اور رہی بات اس کی شادی کی...... تو بھئی، دوسری شادی میں کیا حرج ہے۔ الفت سے اس کی کوئی اولاد ہے ہی نہیں، اس سے ہوگی تو رانی بنا کر رکھے گا۔"

امیر جانہ بی بی گلاب خان کی تعریف میں رطب اللسان تھیں۔

آپا نے مڑ کر دیکھا۔ "دیکھا بھالا" کو ایک بار پھر سے دیکھ کر ان کو الفت کی مار کٹائی نظر آئی۔ ایک بار بھوسے کے لیے بھوج (جس میں بھوسہ بھرا جاتا) خراب سینے پر گلاب خان نے بھوج سینے والی سوئی الفت کے ہاتھ میں گھونپ کر اور پھر بالوں سے پکڑ کر کنوئیں میں لٹکایا تھا...... بے چاری کی چیخوں سے سارا محلہ ہل چکا تھا۔

وہ خاموشی سے نچلا لب کاٹتی رہیں......

"بھئی بڑا بیٹا باپ جیسا ہوتا ہے۔ قاسمہ بچے! تم ہی بولو۔ تمہیں یہ رشتہ......" تائی اب قاسم سے پوچھ رہی تھیں۔ ان کو قاسم کے ہاں کرنے کا پورا یقین تھا۔ ایسے میں زرمینہ آنے ہی لگی تھی کہ ماں کے جملے نے اس کے قدم روک لیے۔

"نہیں......" آپا فوراً سے پیشتر بولیں۔ "نہیں امیر خورے! ایسا ممکن نہیں ہے۔ میں پہلے ہی اپنے خالہ زاد......" زرک کی اور مدد مانگتی نظروں سے دیکھا۔ "کو زرمینہ کا ہاتھ دے چکی ہوں۔ زرک زرمینہ سے نکاح کرنے والا ہے۔ بس ایک چھوٹی سی دعوت اور سادگی سے رخصتی۔"

"وائی اللہ توبہ۔ اتنا سفید جھوٹ۔ وہ بھی منہ پر ہی بول رہی ہو ہمارے رخسانے۔ کیسا رشتہ بھئی، کون سا رشتہ؟ یہ کیا آناً فاناً رشتہ طے کر دیا کہ کانوں کان خبر ہی نہ ہونے دی......"

امیر جانہ بی بی کی باریک لیکن تیز آواز میں غصہ کی وجہ سے لرزہ تھا۔ پھر انہوں نے زرک کو دیکھا اور ان کے ماتھے پر طنزیہ شکنیں ابھریں۔ "اور رشتہ دیا بھی کسے۔ اس دھتکارے گئے لڑکے کو...... جس سے اس کا باپ، پورا خاندان لاتعلق ہو چکا ہے......"

"دیکھو خورے! اب آپ حد کر رہی ہیں۔ میرے داماد کو میرے ہی گھر میں......" رخسانہ کو غصہ آیا لیکن ان کی آواز میں ابھی تک سامنے بیٹھے دیور کا خوف تھا

"ارے بس بس بس۔ بڑا آیا داماد۔ اوگورہ سڑیا (دیکھو جی)......" سپاٹ چہرہ لیے خاموش بیٹھے شوہر کو دیکھ کر انہوں نے کہا تھا۔ "آپ کو مشر (بزرگ) مانتے ہی نہیں وگرنہ رشتہ کرتے وقت تو آپ سے مشورہ کرتے ناں! نہیں بھئی دیدوں

میں حیا کا پانی ہی سوکھ گیا ہے اس پورے خاندان کا۔"

"بڑا بیٹا باپ جیسا ہوتا ہے خورے' اور جب قاسم زندہ ہے تو فیصلہ بھی یہی لے گا۔" رخسانہ کے لہجے میں اس بار تھوڑی گرج تھی۔

امیر جانہ اور کچھ بولنے ہی والی تھیں کہ تیز گمبھیر آواز میں تایا نے انہیں ٹوکا تھا۔ "بس چپ شہ۔ کہہ دیا نا صاف لہجے میں کہ یہ بی بی ہمیں کچھ نہیں سمجھتیں تو بات ختم۔ ان سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں رہے گا اب سے۔ اٹھو۔" یہ کہہ کر تایا اٹھے اور ان کے پیچھے ان کے اہل و عیال...... رخسانہ آپا اپنی جگہ بیٹھی رہیں۔ جیسے ہی وہ چلے گئے' وہ زرک کی طرف مڑیں۔

"مجھے معاف کر دینا بچے! تمہارے کندھے پر بندوق رکھ کر اپنی جنگ لڑی۔"

"بندوق اپنے کندھے پر رکھو یا دوسروں کے' معنی نہیں رکھتا۔ جنگ لڑنا معنی رکھتا ہے آپا......" اس نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ "مجھے یہ رشتہ قبول ہے لیکن......" توقف کیا۔ "لیکن یہ رشتہ محض نکاح کے دو بول تک محدود رہے گا بس۔ آپ کی عزت کی خاطر۔"

اس نے خود کو کہتے سنا تھا۔

☆☆☆

بیٹھک میں محلے دار اور قاسم کے پھپھو کے بیٹے اس کے نکاح میں شرکت کرنے کے لیے موجود تھے۔ اس نے حسب معمول سفید کاٹن کا شلوار قمیص پہنا تھا اور اس کے اوپر سیاہ واسکٹ۔ زرک کی دل کی دھڑکنیں اتھل پتھل تھیں لیکن اس کا چہرہ اس کے اندرونی کیفیات کی غمازی میں ناکام تھا۔ وہ خاموش بیٹھا تھا۔ اس سے زرمینہ ولد نجم خان کو نکاح میں قبول کرنے کے لیے پوچھا جا رہا تھا...... لیکن اس کے دماغ میں کافی شور تھا۔ کئی الفاظ' کئی جملے ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے تھے۔ کسی نے اس کے بازو کو پکڑ کر جھنجوڑا تھا۔

"بیٹے...... مولانا صیب کچھ پوچھ رہے ہیں۔"

اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ سب اس کی غائب دماغی پر اس کو حیران نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کی سانسیں چڑھنے لگیں۔ لیکن اس نے مٹھیاں بھینچیں اور اس نے پھر اس شور میں اپنی آواز سنی تھی۔

"مجھے قبول ہے۔"

☆☆☆

بارش کی گرج کھڑکیوں کے پٹ میں چھوٹے شیشوں پر پڑتیں اور آدھے ادھورے ہیولے اندر نگیں فرش پر بن کر جاتے۔ کمرے میں اس کے وجود کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ بناری جوڑے میں ملبوس لڑکی چارپائی پر بیٹھی اپنے پیروں کی حنا کو دیکھ رہی تھی۔

وہ لاشعوری طور پر اس شخص کا انتظار کر رہی تھی' جس کے نام پر وہ یہاں بیاہ کر آئی تھی۔ اگرچہ اس کو یہ معلوم تھا کہ وہ نہیں آنے والا تھا لیکن وہ دل کا کیا کرتی' جو اس کے انتظار میں تڑپ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں وہ منظر ابھی تک ٹھہرا ہوا تھا...... روشن ماتھے پر بکھرے گھنے سیاہ بال اور سفید کاٹن میں کسی ہیرے کی طرح چمکتا وہ......

زرک خان...... جس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ یہ رشتہ محض نکاح کے دو بول تک محدود رہے گا۔

گھر کی چوکھٹ میں' زرک کے پہلو میں کھڑی زرمینہ نے بھابھی (ماں' رخسانہ) کو کہتے سنا تھا' وہ اس کے گلے لگے رو رہی تھیں۔

"مجھے معاف کر دینا بچی' میں نے تم دونوں میں تفریق کی۔ بیٹے کے سر قربان کرتے وقت شاید میں نے تمہیں پرایا مان لیا تھا۔ اس وقت میرا دل پتھر ہو چکا تھا اور شاید...... شاید ہر ماں کا دل اس حالت میں پتھر ہو جایا کرتا ہوگا جب بات اس کی اولاد کی زندگی کی ہو...... بچپن میں یتیمی کا دکھ سہا اور اب جوانی میں شوہر کی چاہت کی محرومی...... مجھے معاف کر دینا...... میں مجبور تھی اور ڈر پوک بھی......"

رخسانہ نے فوراً اس کو گلے سے ہٹایا اور اس

کے سر پر قرآن رکھتے بیمار قاسم نے اس کو گاڑی تک چھوڑا تھا۔ ڈولی کا رواج حال ہی میں ختم ہوا تھا۔ گاڑی میں اس کے ساتھ کوئی نہیں بیٹھا تھا' فرنٹ سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ زرک خاک بیٹھا تھا اور پیچھے وہ...... بیک ویو مرر میں اس کو اداسی کا دیوتا بنے زرک خان دکھ رہا تھا۔

اس نے اپنی زندگی میں زرک خان کو صرف تین دفعہ دیکھا۔ پہلی بار جب وہ بچور زرک کے دونوں بھائیوں کی شادی میں گئی تھی...... دوسری بار اپنے باپ کی فوتگی میں ......اور تیسری اپنے گھر ......جب وہ اس کے عین سامنے ٹھوکر کھا کر گری تھی۔

یہ نہیں تھا کہ اس کو محبت تھی اور وہ محبت میں تڑپتی اس کا انتظار کر رہی تھی' بلکہ یہ تو برسوں اپنے دولہے کے سپنے کاڑھنے کی وجہ سے انتظار تھا۔ شادیوں میں اس کی ساری دلچسپی' شادی کے اگلی صبح دلہن کے مسکراتے' کھلکھلاتے چہرے کے پیچھے وجہ جاننے میں ہوتی۔ وہ دلہن کے گرد اس کی سہیلیوں کے جمگھٹے میں چپکے سے شامل ہو جاتی اور ان کی سن گن لینا چاہتی لیکن پکڑی جاتی اور بھگا دی جاتی...... شعور کی دہلیز پار کرتے ہوئے اس کو بھی اپنے دولہے کے سپنے کاڑھنے کا طویل اور نہ تھکا دینے والا مشغلہ ہاتھ لگا تھا۔

"میرا دولہا گھوڑے پر چڑھ کر آئے گا۔" وہ سر اٹھا کر تفاخر سے کہتی۔

" وائی توبہ، اللہ توبہ۔ تم نے پھر سے منگ جانے ترور کے گھر وی سی آر پر ہندوؤں (انڈین) کی فلمیں دیکھی ہیں کیا؟" اس کی سہیلی کی آنکھیں حیرت سے پھیل جاتیں۔

"تم مدرسے کی باجی کو شکایت لگا بھی دو تب بھی فرق نہیں پڑتا...... ہاں دیکھی ہیں۔" وہ شرارت سے مسکرا کر کہتی۔ اس کی سہیلی شہلا اس کی چٹکی کاٹتی۔

"میسنی!"

میسنی مسکرا دیتی یا پھر ہنس دیا کرتی۔

معاً بادل گرجے وہ عالم تنویم سے نکل آئی۔ تیز ہواؤں کی وجہ سے کھڑکیوں کے پٹ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ بارش کے ساتھ ہوا بھی مست ہوئی تھی۔ وہ جو تکیے پر سر ٹکائے لیٹی تھی۔ معاً اٹھی' دروازے کے ساتھ دیوار میں لٹکی لالٹین کو اٹھایا۔ اس نے کھڑکیاں بند کیں اور باہر نکل کر زرک کو ڈھونڈنے نکلی۔ نا چاہتے ہوئے بھی زرینہ کو اس نئی جگہ پر خوف آنے لگا تھا۔

آخری سیڑھی پر اس کے قدم جامد ہوئے تھے۔ وہ جس کے انتظار میں وہ کئی گھنٹوں سے بیٹھی تھی' وہ برآمدے کے سنگی فرش پر سویا پڑا تھا۔ اس کے پیچھے اسٹور کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کو اٹھانا چاہا۔ اگلے ہی پل اس کا چہرہ فق ہوا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں روشن اس کا چہرہ آنسوؤں سے لبریز تھا اور لبوں پر مچلتی سرگوشیاں...... وہ سو نہیں رہا تھا' وہ بے ہوش پڑا تھا۔ اس نے قریب جا کر اس کی سرگوشیاں سننا چاہیں۔

"تم تو مجھ سے محبت کرتی ہو نا؟" وہ یہی جملہ بار بار دہرا رہا تھا۔

کوئی اور وقت ہوتا' تو وہ اس بات پر خفا ہوتی۔ لیکن اب وہ یہ نہیں سوچ رہی تھی۔ زرینہ نے زرک کے ماتھے پر ہاتھ رکھنا چاہا۔ لیکن جھجک کی وجہ سے وہ رکی۔ ان کا رشتہ محض دو بول تک محدود تھا۔ چھونے کا اختیار اس نے نہیں دیا تھا۔ لیکن جانے کیوں اس کو اپنے دل میں لگی یہ عدالت مکروہ لگی اور اگلے ہی پل اس نے زرک کے ماتھے پر ہاتھ رکھا وہ تیز بخار میں جل رہا تھا۔

وہ تیزی سے لالٹین اٹھا کر اندر گئی' کمبل اور تورشکئی (میٹرس) اٹھا کر یہیں برآمدے میں بچھا دیا پھر اس کو دھکا دے کر تورشکئی پر دھکیلا اور اس کو کمبل اوڑھا دیا۔ گرم کمبل میں اس کا پسینہ نکلے گا تو بخار خود ہی اتر جائے گا۔ ماں کہتی تھی یہ۔ وہ اس سے فاصلے پر خود فرش پر تکیہ رکھ کر لیٹ گئی۔

اس کی شادی کی پہلی رات کتنی انوکھی اور کتنی

عجیب تھی۔

☆☆☆

تیز چبھتی ہوئی روشنی اس کے آنکھوں پر پڑ رہی تھیں اور وہ ہاتھ کا چھجا آنکھوں کے سامنے کیے پکے گندموں کے کھیت میں پگڈنڈی پر بھاگ رہا تھا دس سالہ زرک خان۔ اور وہ چلا کر اس کا نام لے رہا تھا' جو اس سے آگے بھاگ رہی تھی......

سرخ خمیر کی طرح پھولے گال' دائیں گال میں پڑتا گڑھا اور سبز شلوار کے اوپر سرخ چھوٹے چھوٹے شیشوں سے بھری قمیص پہنے ہوئے اس کی ہم عمر معلوم ہوتی تھی۔ معاً وہ کھلکھلاتی' چڑاتی بچی نے ٹھوکر کھائی اور اگلے ہی پل وہ چلایا تھا۔

"ننھو!"

ایک چیخ کے ساتھ وہ فوراً اٹھ بیٹھا تھا۔ سورج کی تیز چبھتی روشنی اس کی آنکھوں کو بند کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس نے آنکھیں مسل کر دیکھا۔ بارش میں بھیگے درخت اور دیوار۔ یقیناً ساری رات بارش برستی رہی تھی۔ پھر اس کی نظر خود پر پڑی۔ جسم پسینے میں بھیگا ہوا اور جسم پر کمبل۔ اس کے دوسری جانب زرمینہ سر کے نیچے ہاتھ رکھے اور پاؤں سمیٹے سو رہی تھی۔ اس نے اپنا بناری جوڑا نہیں اتارا تھا۔ اس کے دودھیا پاؤں تازہ مہندی میں رچے ہوئے تھے۔

وہ شرمندہ ہوتا اٹھا تھا۔ کل رات اس کی حالت ابتر تھی۔ ماضی کے کوڑے اس کے روح پر ساری رات برستے رہے تھے۔ وہ رخصتی کے بعد اسٹوڈیو میں گھسا دیوانہ وار اپنا مجسمہ مکمل کر رہا تھا۔ اسٹوڈیو سے نکلتے وقت شاید وہ یہیں برآمدے میں بے ہوش ہوا تھا۔

"اے۔" زرک نے زرمینہ کو مخاطب کرنا چاہا۔ اس کی پہلی پکار پر ہی وہ فوراً اٹھی۔ جلدی سے کمبل سمیٹا اور شرمندہ ہوتے کہنے لگی۔

"وہ آپ رات......" زرمینہ کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے کہے' کہ وہ رات کو بے ہوش ہوا تھا۔

"تم چائے پیوگی؟" زرک نے اس کی ہچکچاہٹ کے پیش نظر کہا تھا۔

"میں بناتی ہوں۔" وہ فوراً سے کھڑی ہوئی۔ وہ جانے کیوں زرک کی موجودگی کے احساس سے شرما رہی تھی۔ حالانکہ دل نے یہ یاد بھی کروایا کہ وہ شخص اس کی بیوی ہے...... صرف نام کی......

"نہیں رکو...... تم بیٹھو میں بناتا ہوں۔ تم تھک چکی ہوگی۔"

"آپ ساری رات بخار میں تپتے رہے ہیں۔"

"سو؟...... رات گئی' بات گئی......"

زرک نے اس کو دیکھ کر کندھے اچکائے۔ دونوں کی نظریں ملیں اور اگلے ہی پل اس کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے زرمینہ نے سر جھکایا۔ اتنا کہہ کر زرک ہال و طویل راہداری عبور کرتا دروازے کی طرف کچن میں جا گھسا اور اس کے لیے چائے بنانے لگا۔ جب چائے و پراٹھے بنا کر وہ اندر کمرے میں آیا تو اس نے دیکھا کہ کمرے کی حالت یکسر مختلف تھی۔ خالی چارپائیوں پر چادریں بچھی تھیں اور دونوں چارپائیاں دروازے کے عین سامنے رکھی گئی تھیں' جن کو بیچ میں دیوار کے ساتھ رکھی گئی میز جدا کرتی تھی۔ اس کی کتابوں کا بے ترتیب انبار ترتیب سے بانس کی الماری میں رکھا گیا تھا۔ تکیوں پر نئے نکور غلاف چڑھے تھے اور فرش صاف' چمک رہا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی جادو کی چھڑی تھی' جو اس نے اتنے کم وقت میں اتنا سب کچھ کرلیا تھا۔

"تمہیں اتنا تردد کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔" وہ چائے رکھتا' الماری میں گھسی زرمینہ سے کہہ رہا تھا۔

زرمینہ نے مڑ کر دیکھا۔ وہ عروسی لباس بدل چکی تھی اور تیز گلابی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ نیٹ کے دوپٹے میں اس کے گھنے بال کھلے اور بکھرے ہوئے دکھ رہے تھے۔ وہ پلٹی تو اس کے ہاتھ میں آسمانی رنگ کے کاٹن کے کپڑے تھے۔ اس نے کپڑے زرک کو دینے چاہے۔ زرک کی نظریں اس

کی نظروں کی تقلید میں اپنے کپڑوں پر گئیں اور وہ شرمندہ ہو گیا۔ اس کے سفید کپڑے مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔

"تردد کی کیوں ضرورت نہیں...... یہ میرا ابھی کمرا ہے۔"

"بالکل۔ بالکل یہ تمہارا کمرا ہے۔ لیکن......" توقف کر کے نرمی سے کہا۔ "یہ میرا کمرا نہیں ہوگا اگر تم اس میں رہنا چاہتی ہو میں اپنا سامان لے کر......"

"نہیں...... نہیں آپ یہیں رہیں۔ میں کوئی دوسرا کمرا اپنا کر لوں گی اپنے لیے۔"

زرمینہ تیزی سے مڑی اور چائے کی پیالی اٹھا کر کمرے سے باہر نکلی۔

جاتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی جھلملا رہے تھے۔ اس کی خوش فہمیوں کا محل دھڑام سے چکنا چور ہوا تھا۔ کانچ کا جو تھا۔ ٹوٹ کر کرچیاں چبھنا تو فرض تھا۔

☆☆☆

زرمینہ نے اپنا کمرا الگ کر لیا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں بیٹھی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ اپنی قسمت کا ماتم کر رہی تھی۔

شروع میں جب باپ کے مہرباں لفظ سے آشنا ہوئی تو باپ اچھا بھلا رات کو سویا تو صبح ہوتے ہی اس کا باپ ہمیشہ کے لیے جا چکا تھا۔ شریک گھرانے میں کوئی مظلوم، یتیم نہیں ہوتا۔ ایسا کفایت کا کا سمجھتے تھے کیونکہ داجی کے چالیسویں کے فوراً بعد انہوں نابالغ قاسم کو تانگا چلانے پر لگا دیا۔ تانگے بان تبدیل ہوا اور قاسم اپنے باپ کی طرح شام کی نیلگوں چادر دھرتی پر چھاتے ہی اپنے دن کی ساری مزدوری کا کا کے ہاتھ پر دھر دیتا تھا۔ لیکن کفایت کا کا کی آنکھوں میں حرص کی روشنی کبھی ماند نہ ہوئی۔ انہوں نے بچپن کیسا محرومیوں میں گزارا، اس کا صرف انہیں پتا تھا۔ آپا گھر کے سارے کام کرتیں، جیٹھانی کے طعنے تشنے سہتیں، لیکن کبھی جیٹھ کے ڈر سے آواز نہیں اٹھائی

پھر قاسم بڑا ہوا اور کفایت کا کا کے بیٹوں کی شادیاں ہوئیں، تو ان لوگوں کو علیحدہ ہونا پڑا۔ ان کی زندگی تھوڑی سہل ہونا شروع ہوئی۔ لیکن اس کا دور انیہ بھی کم رہا، جب قاسم کو اس کی بے نام بیماری نے جکڑ لیا۔ کسی نے اس کو جادو کہا تو کسی نے لاعلاج بیماری۔

زرمینہ سارا وقت سارا روتی تھی اس سے بھائی کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ پھر اس رات بھابھی (ماں) اس سے مولانا صیبر کی بات کہہ رہی تھیں اور وہ سن یک ٹک آسماں کو دیکھتی سوچ رہی تھی۔

اپنوں کی محبت اتنی اندھی کیوں ہوتی ہے؟ آپ صحیح اور غلط میں تفریق ہی کرنا بھول جاتے ہیں۔ یا پھر صحیح اور غلط معنی ہی نہیں رکھتے......

لوگ کہتے تھے کہ قاسم کے سر وار جاتے ہی وہ بیمار ہو جائے گی اور مر جائے گی۔ وہ بیمار ہوئی نہ مری البتہ قاسم ضرور ٹھیک ہو گیا کچھ دنوں بعد۔ اماں نے کچھ اس ڈر سے، کہ کوئی کسی کے سرواری گئی لڑکی کو اپنائے گا نہیں اور کچھ اس ڈر کہ ظالم گلاب خان کو وہ انکار نہ کر پائے گی۔ اس کا ہاتھ زرک کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جس نے اس کا ہاتھ صرف آپا کے عزت رکھنے کے خاطر تھاما تھا۔

☆☆☆

باورچی خانے میں صبح کے وقت پراٹھے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ زرمینہ سفید شلوار، سادہ فیروزی قمیص پہنے ہوئے تھی۔ جارجٹ کا دوپٹا اس کے سر پر سے بار بار سرک رہا تھا۔ زرک اندر جاتا رک گیا اور اس کے پشت کو تکتا گیا۔

پشت پر تکی نگاہوں کی حدت پا کر، زرمینہ نے پلٹ کر دیکھا تھا۔

"آپ چائے پئیں گے؟" زرمینہ اس سے پوچھا۔

"نہیں۔ تم اپنی چائے بناؤ...... میں خود......" وہ زرمینہ کی نظروں کو نظر انداز کرتا، مڑ کر دوسر

بے چولہے پر چائے کے لیے پانی رکھنے لگا۔ زرینہ اٹھی اور اس سے چھین لیا۔

"نہیں ...... میں بناتی ہوں ...... آپ جایے ......" اس کے لہجے میں ناراضی اور سختی تھی ......

وہ کشش و پنج میں کچھ دیر کھڑا رہا پھر باہر نکل گیا۔ داخلی دروازے کے سامنے برآمدے میں رکھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد زرینہ اس کے سامنے چائے رکھ واپس باورچی خانے میں جانے لگی تھی زرک نے اسے پکارا۔

"سنو......"

زرینہ کے قدم تھمے تھے۔ وہ رکی لیکن مڑی نہیں۔

"اگر تمہیں کچھ چاہیے تو مجھے......"

زرینہ نے یک دم پلٹ کر اس کو دیکھا۔ اس کی نظروں میں حیرت تھی۔ رمی بات چیت کے علاوہ اسے پہلی بار زرینہ کا خیال آیا تھا۔ اس کا دل خوش فہمیوں میں گھر گیا۔ ایک مسکان اس کے چہرے پر چھانے لگی۔

"نہیں ...... فی الحال نہیں چاہیے......"

"ہوں۔" وہ ہنکارا بھر کر اپنی چائے پینے لگا۔

ان دونوں کی ملاقات بس ناشتے، دوپہر اور رات کے کھانے پر ہوتی تھی۔ اس کا سارا دن اپنے اسٹوڈیو میں گزرتا تھا۔ اس دن کے بعد زرینہ نے ہال کے دوسری جانب والی جگہ پر قدم تک نہیں رکھا تھا۔ اس کو نہیں پتا تھا کہ وہ سارا دن اس جگہ کیا کرتا تھا۔

کچھ دیر تک وہ وہیں کھڑی رہی، اس کو دیکھتی رہی لیکن وہ اس کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ مایوس ہو کر وہ واپس پلٹ گئی۔ باورچی خانے میں آ کر جب وہ چوکی پر بیٹھی تو اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس نے دل ٹٹولا۔ کیا یہ زرک کے لیے دھڑک رہا تھا؟ ...... کیا وہ اس کی محبت کی شکنجے میں آ چکی تھی؟۔ اس کا جواب واضح تھا اور مبہم بھی ...... وہ اس سے منکر ہونا بھی چاہ رہی تھی اور اس کا اقرار بھی کرنا چاہتی تھی۔

وہ فوراً اپنے کمرے آ گئی۔ کھڑکی کے کھلے جھروکے سے اس کوراہداری میں گزرتا زرک دکھائی دیا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا اور آنکھیں اداس ...... اس کی آنکھیں تو ایسی نہیں تھیں۔ وہ چمکتی تھیں ستاروں کی مانند۔ کیا وہ اس نغمہ کو ابھی تک بھول نہیں پایا تھا؟۔

اس کی آنکھوں میں منظر بدلا تھا۔ وہ دس سال پیچھے اس مہندی کی رات میں تھی۔

☆☆☆

زرک کے بڑے بھائی کی مہندی تھی۔ جمعے کے روز آسمان بالکل صاف اور ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ سلمی ستاروں کے لہراتے دوپٹوں سے بھری شب میں کھلے وسیع صحن میں، بزرگ عورتیں ٹپے گا رہی تھیں اور جوان لڑکیاں رقص کر رہی تھیں۔ پاس کھڑی عورتیں ٹمبل اور ڈھولکی بجا رہی تھیں۔ ایسے میں عورتوں کی جھرمٹ میں دولہے کو اندر لایا گیا مہندی لگانے کے لیے۔ جب مہندی لگ چکی، تو زرک کی بہنوں اور کزنز نے لڑکوں کو زبردستی پکڑ کر عورتوں کے دائرے میں گھسیٹنا شروع کیا۔ کسی نے دائرے میں زرک کو دھکیلا اور پھر ابھی ہی سے کسی نے نغمہ کو بھی دھکیلا۔ نغمہ کا چہرہ اسی وقت، اپنے منگیتر کو اپنے سامنے پاکر ...... اور سب لوگوں کی لطف اٹھاتیں نظروں کی حدت سے سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے نکلنا چاہا لیکن اس کی شرارتی سہیلیوں نے راستہ نہیں دیا چونکہ گھر میں کوئی بزرگ مرد نہیں تھا تو عورتوں کو کھلی چھوٹ تھی شرارت کی......

زرینہ اس کو دیکھ رہی تھی ...... چترالی ٹوپی سر پر رکھے اور سیاہ شال کندھے پر ...... جس کا ماتھا ویسے ہی روشن تھا اور اس کی آنکھیں ہیروں کی مانند چمک رہی تھیں کیونکہ اس سے اس کی نظروں کا محور، نغمہ تھی ...... اس کی نغمہ......

نازبینے نے ٹمبل بجانا تیز کیا، لڑکیاں تالیاں پیٹنا شروع ہوئیں اور شازیہ باجی نے گانا شروع کیا ......

وہ مازیگر بہ شی پہ نجلہ

بسم اللہ خورے والے

وہ چناروں نہ سر تہ مہ نچہ مائینہ

زرک کے قدم تھرکنے لگے تھے۔ نغمہ ویسے ہی شرماتی دائرے سے نکلنا چاہ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اناری ہو رہا تھا۔ روخانے نے نغمہ کو دھکا دیا اور نغمہ عین زرک کے سامنے آگئی۔ دونوں کی نظریں ملیں اور زرینہ مسکراتے زرک سے نظریں نہیں ہٹا پا رہی تھی۔

ھلک تارے چنار دے

جینئی دہ گلوں ونہ

اس مصرعے پر سب عورتوں نے فلک شگاف "اوووو" کی چیخ لگائیں اور تالیاں پیٹیں۔ نغمہ مڑی اور تیزی سے دائرے میں جگہ بناتی بھاگ گئی۔ زرینہ زرک کو دیکھے جا رہی تھی جو مسکراتا لطف اندوز ہوتا ناچ رہا تھا۔ گیت کے بول اور زرک کا مسکرانا اس کے حافظے میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

"مجھے میکے چھوڑ آیے۔" یہ اس کی زرک کے ساتھ اس مہینے پہلی باضابطہ بات تھی۔ زرک چھت پر بیٹھا خاموشی سے کھیتوں پر چھائی سرما کے اوائل کی سہ پہر کو دیکھ رہا تھا۔ گنے ابھی چھوٹے تھے اور اس پر بجھتے شعلوں سی روشنیوں کی چادر تن رہی تھی۔

"تم خود چلی جاؤ۔" زرک نے آہستہ سے نظر نہ ملاتے ہوئے کہا۔

"اس پورے دو مہینوں میں صرف در پے پڑ گئی تھی۔ اس میں بھی آپ جلدی آ گئے تھے دعوت سے پہلے۔ اب بھی اگر میں اتنے عرصے بعد اکیلی جاؤں گی تو بھابھی کو برا لگے گا......" توقف کر کے اس نے زرک کی اداس آنکھوں میں دیکھا تھا۔ "اور مجھے بھی......نام کا رشتہ ہی سہی، لیکن یہ حق تو ابھی میں رکھتی ہوں۔"

وہ خاموشی سے ڈھلتے سورج پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اس وقت وہاں موجود ہی نہ تھا۔ زرینہ کو رونا آنے لگا۔ وہ اتنا بے حس کیوں تھا۔

"آپ میری بات سن رہے ہیں؟" وہ قدرے تیز لہجے میں بولی تھی۔ اس کی تیز آواز پر زرک نے مڑ کر اس کو دیکھا۔ زرینہ نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں انتہائی سرخ تھیں ایسے جیسے وہ روتا رہا ہو۔ اگلے ہی پل وہ اٹھا اور نیچے جانے لگا۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے زرینہ نے اس کے لرزتے ہاتھ دیکھے تھے۔

اس کا دل چاہا کہ وہ پوچھے لیکن اس نے خود کو روک دیا، اس کو کیا ضرورت تھی پوچھنے کی۔ جب اس کو زرینہ کی پروا نہ تھی تو وہ کیوں کرتی بھلا۔ وہ غصے اور دکھ سے وہیں بیٹھ کر رونے لگی۔ وہ اس کے قریب جانا چاہتی تھی لیکن وہ ہمیشہ اس کو یا نظر انداز کر دیتا یا پھر یا اس کو دور ہونے کا کہتا...... اس نے طے کر لیا کہ وہ اس سے اس کی قربت کی بھیک نہیں مانگے گی۔ وہ لاتعلق رہنا چاہتا ہے، اس کو قبول ہے۔ لیکن وہ یہ بھول رہی تھی کہ محبت جب دل کی سرزمین میں جڑیں ڈال دے تو ان جڑوں کو اکھاڑا نہیں جاتا اور نہ ہی وہ کاٹی جاتی ہیں...... دونوں صورتوں میں ہاتھ دل کے خون سے رنگے ہوتے ہیں......

شام کو وہ کھانا بنا کر لاشعوری طور پر اس کا انتظار کرتی رہی۔ شاید وہ کھانا کھانے آ جائے۔ لیکن وہ نہیں آیا۔ دوپہر کے وقت بھی اس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ لیکن وہ اس کے اسٹور جانا نہیں چاہتی تھی۔ جس میں وہ سارا دن تالا لگائے گھسا رہتا ہے۔

جب سورج مکانوں کے عین اوپر سرک گیا اور وہ دوپہر کے کھانے کے لیے بھی اپنے اسٹور سے نہ نکلا تو اس کو تشویش ہونے لگی۔ وہ چنگیر اور کاسہ اٹھائے اس کے اسٹور جانے لگی۔ اگرچہ اس کو یقین تھا کہ آگے سے دھتکار اس کا مقسوم تھا لیکن پھر بھی وہ گئی۔ دروازہ ادھ کھلا تھا۔ اس نے پاؤں سے دروازہ دھکیلا اور اندر چلی گئی۔ اندر پہلا قدم رکھتے ہی اس کے قدم جم گئے تھے......

ایک بڑا سا خالی کینوس۔ ایک بڑی سی میز،

جس پر ایک خالی اسٹینڈ تھا اور میز پر گارا' سیلی کاین' ربڑ' گلو' برش اور باقی چیزیں جنہیں وہ جانتی تک نہ تھی ۔لیکن یہ چیزیں اس کے تحیر اور جمود کا باعث تھیں۔

وہ یک ٹک ان مجسموں کو دیکھ رہی تھی......ایک' دو تین' چار' پانچ' چھ......اس کی نظریں مجسموں کو گنتے ہوئے گھوم رہی تھیں۔ پورا کمرا مجسموں سے بھرا ہوا تھا۔ سفید مجسمے۔ جس میں روح نہیں تھی لیکن اس کی ہیئت مکمل بشری تھی۔ وہ آگے بڑھی۔ آنکھوں میں آنسو چمکے۔

اس نے مجسمے کو دیکھا۔ مسکراتا چہرہ' بڑی آنکھیں' کتابی چہرہ اور خوب صورت لب۔ وہ اس مجسمے کو جانتی تھی۔ اس پتھر سے بنے انسان کو جانتی تھی۔

وہ نغمہ تھی۔ نغمہ حبیب اللہ۔ لیکن اس کمرے میں ایک نغمہ نہ تھی۔ کئی نغمہ تھیں......مختلف انداز میں۔ کبھی ہنستی' کبھی روتی' کبھی اداس' کبھی غصہ۔ اس پورے کمرے میں صرف نغمہ کے مجسمے تھے۔

اس کی نغمہ' جس کے لیے وہ نیچے فرش پر لیٹا سر گوشیاں کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ آنسو کی ایک لمبی لکیر اس کے چہرے پر بہہ رہی تھی۔

اس پورے عرصے' زرمینہ اس سے محبت کی امید لگائے بیٹھی تھی جو محبت میں مجنوں تھا۔ غافل تھا۔ اس کے دل میں چبھتا ہوا درد کسی زہر کی طرح پھیلنے لگا۔ اس کا دل دو حصوں میں بٹنے لگا۔ ایک حصہ زرک کے لیے تڑپ رہا تھا اور ایک حصہ اپنے لیے۔ ایک آخری امید جو بچی تھی وہ ان مجسموں کے ساتھ ہی پتھر ہوئی۔ محبت درد نہیں دیتی......محبوب کا کسی اور کو یوں چاہنا درد دیتا ہے۔

وہ کس کرب سے گزر رہا تھا۔ اس کمرے کی ہر ایک چیز اس کی گواہ تھی۔ وہ فوراً اس کو اٹھانے جھکی۔

"تم تو مجھ سے محبت کرتی ہو نا؟"

"میں تم سے محبت کرتا ہوں نغمہ!"

زرک کی آنکھوں کے سامنے جھکی' اس کو آوازیں دیتی زرمینہ نہیں دکھائی دے رہی تھی......وہاں کوئی اور مناظر تھے۔ اس کے......اس کی نغمہ کے......اور

☆☆☆

پچاس سال پہلے:

دروازے پر دستک ہو رہی تھی اور مشتری بی بی دستک دینے والے کو پہچان گئی تھیں۔ وہ باچا خان تھے۔ وہ چپل پہنتے' لالٹین اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھیں۔

ان کے شوہر باچا خان تین دن پہلے صوابی اپنی خالہ زاد بیٹی سلطانہ بی بی کے ہاں جرگے میں گئے تھے۔ سلطانہ بی بی کے خاوند کو فوت ہوئے چھ ماہ ہو چکے تھے اور دونوں کی شادیاں ایک ساتھ ہی ہوئی تھیں۔ پورے خاندان میں مشہور تھا کہ باچا خان سلطانہ بی بی کے لیے انس رکھتے تھے۔ جرگہ اس لیے بٹھایا گیا تھا کہ سلطانہ کے دیور نے ان پر ہاتھ اٹھایا تھا۔

مشتری نے جیسے دروازہ کھولا۔ ان کے سامنے دراز قد باچا خان' دستار باندھے اور کندھے پر چادر رکھے ہوئے کھڑے تھے۔ وہ مسکرائی تھیں لیکن اگلے ہی لمحے ان کی مسکراہٹ کٹی کیونکہ ان کے چوڑے شانوں کے پیچھے تین ہیولے نمودار ہوئے اور ان کے چہرے لالٹین کی مدھم زرد روشنیوں میں واضح ہوئے۔

سلطانہ اور ان کے بچے......دو بالغ بیٹے......

مشتری نے راستہ دیا اور وہ اندر چلے آئے۔

"ان کے لیے چارپائیاں رکھوا دو کمرے میں۔" باچا خان نے بس اتنا ہی کہا اور خود مٹکے سے پانی پی کر کھلے آسماں تلے سو گئے۔

اگلی صبح باچا خان نے اپنی بہنوں اور بھائیوں کو اکٹھا کیا۔ اس کچے کمرے میں پورے خاندان کے بڑے موجود تھے۔ عورتوں سمیت۔

"اس بے غیرت لال محمد نے سلطانہ پر ہاتھ اٹھایا اتنا مارا کہ وہ آدھا دن بے ہوش رہی۔ وہ کہتے تھے کہ وہ اس نافرمان کو گھر میں نہیں رکھ سکتے۔ اور

سلطانہ کے بھائی بھی کہہ رہے تھے کہ اب اس کا اصل گھر اس کے مرحوم شوہر کا گھر ہے۔ وہ اس گھر سے اب میت کی صورت ہی نکلے گی۔

"میں نے سمجھانا چاہا۔ لیکن اس کے بھائی نہ مانے۔ پھر لال محمد نے مجھے طعنہ دیا کہ اتنی ہی پروا ہے تو تم اس سے شادی کر لو اور لے جاؤ، اس کا بوجھ اٹھاؤ اور اس کے بیٹوں کا بھی ......" اس سے آگے باچا خان خاموش ہو گئے کیونکہ آگے کی ان کہی بات کا مفہوم سب سمجھ گئے۔

مشتری یک ٹک باچا خان کو دیکھ رہی تھیں۔ ایسے جیسے کسی نے ان کو مجسمہ بنا دیا ہو۔ وہ بیٹھی رہیں۔ ان کی نندیں ان کو تسلیاں دیتی رہیں' لیکن وہ خاموش تھیں۔

رات کو جب باچا خان اپنا واسکٹ اٹھانے کمرے میں آئے تو ان کے پہلو میں بیٹھ کر بولے۔

"میں تم سے بس ...... بس عدل کی درخواست کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ انصاف کرنا۔ دل بڑا کرنا۔"

وہ سر جھکائے خاموشی سے بیٹھی رہیں پھر انہوں نے اپنی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اٹھائیں۔ "قبول بھی کر لیا اسے' انصاف بھی کر لوں گی۔ لیکن دل بڑا نہیں کر سکتی ...... اس کو تو آپ نے نچوڑ کر رکھ دیا۔"

پھر سب نے دیکھا۔ مشتری بی بی نے سلطانہ کے ساتھ کبھی زیادتی نہ کی۔ نہ ہی کبھی روایتی سوتنوں والے جھگڑے اور سیاست۔ انہوں نے سلطانہ کو قبول کیا۔ سلطانہ مشتری بی بی کی بہت عزت کرتی تھیں۔ لیکن اس سب احسانات' کو وہ نہیں دیکھ رہے تھے۔ حبیب الرحمٰن اور بخت الرحمٰن۔ سلطانہ کے بیٹے۔ انہوں نے کبھی مشتری کو غٹہ مور (بڑی ماں) نہ سمجھا اور نہ ہی باچا خان کو' داجی' ...... ان کا اپنی ماں کے ساتھ بھی اچھا تعلق نہ رہا۔ وہ اپنے خاندان' اپنے گاؤں میں رہنا چاہتے تھے۔ اور ان کے اندر زہر بھرنے کا فریضہ گاؤں والوں نے نبھایا تھا اور کچھ رشتے داروں نے ......

"سلطانہ اور باچا خان پہلے ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔"

"سلطانہ مشتری سے جلتی تھی کہ بھئی ساری جائیداد پر ناگن بن کر بیٹھی عیش کر رہی ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنے پہلے شوہر کو مارا۔ یہ سانپ کے زہر سے مرنے کا تو بس بہانہ تھا۔ اس کو تو بس اپنے یار سے ملنے آنا تھا۔"

"سلطانہ کے شادی کے بعد بھی باچا خان سے مراسم تھے۔"

"بے حیا عورت ...... بے چاری مشتری ......"

ہر زبان پر نیا طنز' نئی گالی اور نئی تہمت تھی۔ رفتہ رفتہ ان کو باچا خان اور ان کے بچوں سے نفرت ہونے لگی۔

باچا خان کے اپنے تین بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ رستم خان' ہاشم خان' بابر خان اور گلنار' شہناز' نسرینہ اور عذرا۔ باچا خان نے انہیں مدرسے میں داخل کروایا اور وہ وہاں دین و اسلام کے اسباق سیکھنے لگے لیکن ان کے اندر کا بغض اور عناد کم نہ ہوا اور مزید جڑیں پکڑنے لگا۔ باچا خان نے انہیں اپنی اولاد ہی سمجھا۔ سلطانہ کے لیے الگ حصہ تعمیر کروایا اپنے گھر میں اور جائیداد میں سے بھی برابر کا حصہ دیا۔

باچا خان اور مشتری جب تک زندہ رہے انہوں نے اپنی طرف سے ہر قسم کی میانہ روی' عدل و انصاف کیا لیکن تب بھی حبیب الرحمٰن اور بخت الرحمٰن ان کو اچھی نظروں سے نہ دیکھتے۔ یہ ان دو بھائیوں کی کم ظرفی بھی شاید۔ پھر وہ بچے بڑے ہو گئے۔ ان کی شادیاں ہوئیں۔ باچا خان کے پوتے' پوتیاں ہوئیں۔ اور اب سگے سوتیلے بھائیوں میں ان کی بیویوں کے باعث تھوڑا بدلاؤ آیا تھا۔

☆☆☆

اس بڑے سے لکڑی کے دروازے کے پاس بیل گاڑیاں رکیں اور اندر سے کسی خاتون نے

دروازہ کھولا۔ اب بیل گاڑیاں اندر داخل ہو رہی تھیں۔ بیل گاڑیاں گندم کی بوریوں سے لدی تھیں اور اندر گھر میں افراتفری سی مچی تھی۔ کھیتوں میں کام کرتے مردوں کے لیے چائے بنائی جا رہی تھی۔ اور بچے بیل گاڑیوں کے خالی ہونے کے انتظار میں اچھلتے کودتے جا رہے تھے۔ جیسے ہی بوریاں اٹھا کر گودام میں رکھوا دی گئیں تو سارے بچے بیل گاڑیوں پر ہلا بول کر بیٹھ گئے۔

سرکاری اسکول کے سیاہ کپڑے پہنے زرک خان جیسے ہی بیٹھا' تو اس نے مڑ کر پہلے اپنی بیل گاڑی میں دیکھا اور پھر باقی سب میں نغمہ ان میں کسی سے میں بھی نہیں تھی...... اگلے ہی پل وہ کودا تھا۔ اس کے بھائی نے اس کو پکارا لیکن وہ رکا نہیں اور تیز ی سے بھاگتا ہوا نغمہ کو ڈھونڈنے گھر چلا گیا۔ جیسے ہی گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وسیع صحن میں نغمہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی' روئے جا رہی تھی۔ اس کے پاس سلطانہ دادی کھڑی اس کو دلاسے دے رہی تھیں۔

"دیکھو ...... زرک خان بچے می راغو درلہ (تمہارے لیے میرا زرک خان بچہ آگیا)......"

ان کی بات پر نغمہ نے اپنی آنسوؤں سے تر آنکھیں اٹھائیں اور اس کو دیکھا تو مسکرائی۔ زرک نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دونوں باہر کی اور پچھلے راستے نکل کر کھیتوں میں داخل ہوئے تھے۔

سورج کی سنہری روشنی' گندم کے سنہرے خوشوں پر پڑتی' منظر کو مزید روشن کر رہی تھی۔ نغمہ اس سے آگے پگڈنڈی پر بھاگ رہی تھی اور وہ اس کے پیچھے......معاً وہ ٹھوکر کھا کر گری۔

"نغمہ!"

زرک خان نے اس کو پکارا جو تکلیف سے اپنے پیروں کی انگلیوں کو دیکھنے لگی تھی۔ لیکن اس سے زیادہ تکلیف میں وہ تھا۔ وہ تشویش سے اس کے پیروں کو دیکھتا جا رہا تھا۔

"ہم سے گندم رہ جائے گی ...... باقی سب گندم بیچ کر اپنے لیے پیپسی' چپس سب لے لیں گے

۔" وہ مایوسی سے زرک سے کہہ رہی تھی۔ زرک کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اس کو باقی بچوں کے ساتھ نہ جانے کا دکھ تھا۔

زرک نے ارد گرد دیکھا۔ اس کو دور چکنی مٹی نظر آئی۔ اس نے اٹھ کر ڈھیر ساری مٹی اٹھا کر وہاں پگڈنڈی پر رکھی۔ نغمہ اس کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہاں بیٹھ کر اس نے چکنی مٹی سے چڑیا بنانی شروع کی۔ نغمہ اپنا درد بھولے' اشتیاق سے مٹی کی ہیئت بدلتے دیکھ رہی تھی۔

"تم کیا بنا رہے ہو؟"

"چڑیا۔"

"چڑیا...... یہ چڑیا ہے؟" اس نے اس کے ہاتھ میں مٹی کو دیکھا اور پھر اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنس پڑی اور ہنستی چلی گئی لیکن وہ مسکراہٹ دبائے لگا رہا۔

کچھ دیر بعد وہ جب وہ چڑیا بنا چکا تو وہاں درخت کا باریک کانٹا اٹھا کر اس کے پروں میں پنکھ بنانے لگا اور باقی خدوخال...... جب بنا چکا تو اس نے نغمہ کے سامنے رکھا۔ اس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ چکا تھا۔

"یہ کیسے؟" وہ مٹی سے بنی اس چڑیا کو دیکھتی متحیر تھی۔ "اور بھی بناتے ہیں زرک!"

زرک نے مسکرا کر اور سر اثبات میں ہلایا۔ پھر وہ دونوں دوپہر کا کھانا بھولے سہ پہر کی اذان تک وہیں بیٹھے کھلونے بناتے رہے۔ تب تک جب تک ان کو کوئی ڈھونڈنے وہاں نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

نغمہ حبیب الرحمٰن کی بیٹی تھی اور زرک رستم خان کا بیٹا...... اس بڑے گھر میں بچوں کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہوتا تھا۔ زرک کے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ زرک سب سے چھوٹا تھا۔ نغمہ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ زرک سارا دن نغمہ کے گھر ہوتا یا نغمہ پورا دن زرک کے حصے میں ہوتی۔ نغمہ صرف مدرسے جاتی تھی بھائیوں کے ساتھ' جبکہ زرک اسکول بھی جاتا تھا......

اس دن کے بعد، نغمہ ہمیشہ اس کو کھلونے بنانے کی فرمائش کیا کرتی تھی۔ زرک کے ہاتھوں میں قدرتی صلاحیت تھی۔ وہ کسی چیز کو دیکھ لیتا، تو من وعن اس کو ویسا بنا دیا کرتا تھا۔ دوپہر کو وہ دونوں گھر کے پیچھے والے حصے میں بڑ کے نیچے بیٹھے کھیلتے، زرک صاف کورے صفحات پر پنسل سے تصاویر بنایا کرتا اور نغمہ اس کو شوق سے دیکھا کرتی۔

یہ تیز دھوپ سے بھری دوپہر کا قصہ تھا۔ زمین تانبے جیسی چمک رہی تھی اور وہ دونوں اپنی پسندیدہ جگہ پر بیٹھے تھے۔ ایسے میں نغمہ کو ڈھونڈتا اس کا بھائی نیک احمد اس جانب آیا تھا۔ زرک کے ساتھ بیٹھی نغمہ ٹھوڑی تلے، ہتھیلی رکھے اشتیاق سے زرک کو کورے صفحے پر پنسل سے تصویر بناتے دیکھ رہی تھی۔ نیک احمد قریب گیا۔

"نغمے...... بے بے بلا رہی ہیں......"

نغمہ بیٹھی رہی، نیک احمد اس کے قریب جھکا۔

"یہ تم کیا بنا رہے ہو؟"

"یہ رستم کا کا ہے۔" نغمہ جوش سے بتا رہی تھی۔ زرک انہماک سے تصویر بنا رہا تھا اور اس کی تصویر ہو بہو رستم کا کا جیسی تھی۔

نغمہ کو یونہی بیٹھا دیکھ کر نیک احمد غصہ ہوا اور اس کو بازو سے پکڑ کر کھینچا تھا۔ "تم ابھی تک بیٹھی ہو اٹھو......"

"بس کچھ دیر......" نغمہ منمنائی لیکن نیک احمد اس کو گھسیٹتا لے گیا۔ زرک کا دل اچاٹ گیا۔

نیک احمد ہمیشہ زرک سے جلتا تھا۔ اس کی مثالیں دی جاتی تھیں ہر جگہ۔ اسکول کا کے ماسٹر صاحب، یا مدرسے کے قاری صاحب۔ سب اس کی تعریفیں کرتے تھے۔ وہ اتنا ذہین تھا۔

نیک احمد صرف نام کی حد تک نیک تھا ورنہ اتنا شرراتی لڑکا پورے گاؤں میں نہ تھا کوئی۔ سب اس سے عاجز تھے۔

مدرسے کے اس پرانے طرز تعمیر کے ہال میں بچے قطاروں میں آمنے سامنے بیٹھے، رحل پر جھکے سبق ہل ہل کر پڑھ رہے تھے۔ نیک احمد اپنی قطار میں بیٹھا، جیب میں رکھے چھوٹے چھوٹے تخم بکائن سے ایک ایک لڑکے کا نشانہ بنا کر ان کو مار رہا تھا۔ ایسے میں ایک بچے نے اس کو دیکھ لیا اور اٹھ کر قاری صاحب سے شکایت لگانے لگا۔

"قاری صیب۔ یہ تخم بکائن سے ہمیں مار رہا ہے......"

قاری صاحب اشتعال میں اس کو بلانے لگے۔ نیک احمد جیسے ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے نیک احمد کی جیب ٹٹولی۔ اس میں تخم بکائن بھی تھے اور ایک سفید مروڑا ہوا کاغذ...... جو اس نے کل دوپہر زرک کے صفحات سے چرایا تھا۔ انہوں نے جیسے ہی صفحے پر بنی تصویر دیکھی تو غصہ ہو کر پوچھنے لگے......

"یہ کس کی تصویر ہے؟"

ان کی آواز میں دھاڑ تھی۔ نیک احمد اب صحیح معنوں میں ڈر گیا۔

"یہ رستم کا کا کی......"

"کس نے بنائی تھی؟ تم نے؟"

"نن...... نن...... نہیں...... یہ تو...... زرک نے بنائی ہے۔ وہ تصویر بناتا ہے۔ اس کے پاس اتنے سارے صفحوں پر بہت ساری تصویریں ہیں۔ آدے کی، رستم کا کا...... اور......"

قاری صاحب نے اس کو بیچ میں ٹوک کر غصے سے زرک کو بلایا تھا۔ زرک نچلا لب کاٹتا ان کی جانب جا رہا تھا اور نغمہ یک ٹک خوف سے زرک کو دیکھ رہی تھی۔ کیا قاری صیب اس کو مارنے والے تھے؟۔

"ادھر بیٹھو۔" انہوں نے زرک کو اپنے سامنے بیٹھنے کا کہا اور پہلو میں رکھا ڈنڈا ابھی اپنے عین سامنے رکھا۔

"یہ تم نے بنائی ہے؟"

"جی۔" تھوک نگل کر اس نے کہا تھا۔ تڑاخ سے ایک ڈنڈا اس کے بازو پر مارا گیا اور اس کے فوراً بعد قاری صاحب نے اس پر ڈنڈوں کی برسات کر

دی۔ زرک کی چیخیں آسماں کو چھونے لگیں۔

"ملعون انسان۔ تم اب تصویریں بناؤ گے۔ خدا کے عذاب میں جلو گے۔ جہنمی! یہ خدائی وصف ہے۔ انسان کے چہرے نہیں بناتے...... آخرت میں روح ڈالو گے اس میں...... ہے روح ڈالنے والی قوت تم میں؟" قاری صاحب اس پر جھکے پوچھ رہے تھے۔ بھری بھری آنکھوں سے اس نے سرنفی میں ہلایا تھا۔ "پھر بناؤ گے؟ بولو؟"

اس کا سرنفی میں بار بار ہل رہا تھا۔ جب اس کو مارتے مارتے وہ تھک چکے تو انہوں نے بس کردی۔ چھٹی تک وہ رحل پر جھکا ہچکیوں سے روتا رہا تھا۔

مغرب کی نماز کے بعد، سلام پھیرنے کے بعد قاری صاحب نے رستم کاکا کو سب کے سامنے اس بات کی تاکید کی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو اس راستے سے ہٹائیں، ورنہ اللہ کی پھٹکار پڑے گی۔ پہلی صف میں بیٹھے رستم کا سر شرم سے جھک گیا۔

رات کو جب مور جانہ زرک کے زخموں پر تیل لگا رہی تھیں تو بار بار قاری صاحب کو بد دعائیں دے رہی تھیں۔

"اللہ اس کے ہاتھ توڑ دے جو میرے معصوم بچے کو ایسے ظالموں کی طرح کوٹا۔ ایک تصویر ہی تو تھی، نرمی سے سمجھا دیتے، نہ بناتا وہ آگے سے۔"

"تمہاری دی گئی شہ ہے، جو یہ اس طرح کے لعنت و کفر کے کام کرتا ہے۔" ان کے پیچھے رستم خان کی آواز آئی تھی۔ مور جانہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ "کہاں ہیں؟ وہ باقی تصویریں؟ اٹھو لاؤ۔" وہ آگے بڑھ کر زرک کو بازو سے پکڑ کر اٹھانے لگے۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ وہ اتنا......"

"تم چپ...... بالکل چپ...... اٹھو......"

زرک روتا بلکتا اٹھا اور اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ باہر آیا تو گھر کے صحن میں سبھی موجود تھے اور رستم کاکا کے اشتعال پر دم سادھے ہوئے تھے۔ سلطانہ آدے اس سے استفسار کر رہی تھیں لیکن وہ جواب نہیں دے رہے تھے۔ ایسے میں زرک نکلا تو اس کے ہاتھ میں صفحات کا پلندہ تھا۔

رستم خان نے اس کے ہاتھ سے صفحات چھینے۔ اور ایک ایک کر کے سب دیکھنے لگے۔ ان تصویروں میں زیادہ تصویریں رستم خان کی تھیں۔ لیکن وہ یہ نہیں دیکھ رہے تھے کہ زرک ان سے کتنی محبت کرتا تھا کہ ساری تصویریں ہی ان کی اور نغمہ کی تھیں۔ وہ آگے بڑھ کر جارگئی میں جلتی آگ میں وہ سارے کاغذات ڈال کر اس کی طرف مڑے۔

"تم آئندہ بناؤ گے؟" وہ یقیناً اس کو مارنے جا رہے تھے۔ وہ بھاگ کر سلطانہ آدے کی آغوش میں جا چھپا۔

"غضب خدا کا۔ پہلے اس ظالم نے مارا اور اب تم مار رہے ہو۔ کوئی اللہ کا خوف ہے کہ نہیں؟ نہیں بنائے گا اب خبردار جو اس کو ہاتھ بھی لگایا تو......" سلطانہ آدے غصے سے بول رہی تھیں اور اس کی روتی آنسوؤں سے لبریز آنکھوں میں اس کے شوق کے شعلے بجھتے جا رہے تھے۔

نغمہ دور کھڑی، روتے ہوئے اپنے دوست کو دیکھ رہی تھی...... وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی...... وہ ڈرپوک تھی، پھر روتے ہوئے پیچھے مڑ کر اپنے گھر کی اور بھاگی تھی۔

☆☆☆

اس دن کے بعد زرک کا رستم یعنی اپنے باپ کے ساتھ رویہ بدل گیا۔ وہ جس قدر اپنے باپ کو چاہتا تھا، ان کی تصویریں بناتا تھا۔ ان کے آگے پیچھے گھومتا تھا۔ اب اس چاہت پر ان کا خوف بھاری پڑ گیا۔ اس دن کے بعد زرک کی زندگی بہت بدل سی گئی۔

وہ خوش رہنے والا معصوم زرک، خاموش طبع بن گیا۔ اس کی زندگی میں بس دو ہی ایسے لوگ تھے، جن کے سامنے وہ رو سکتا تھا۔ مور جانہ اور نغمہ۔

"تم اب بھی تصویر نہیں بناؤ گے؟" نغمہ مغموم سی اس سے پوچھتی۔

"نہیں۔"

"کبھی نہیں؟"

"کبھی نہیں۔"

یہ چھوٹا حادثہ اس کی ذات کے سفال کو کسی اور ہیئت میں ڈھال رہا تھا۔ وقت کے کمہار ہاتھوں میں شتابی تھی اور اس کی ذات کے سفال کو اس نے "طفل" سے "جوان" میں بدل دیا۔ جوانی کی دہلیز پر قدم دھرتے ہی' اس کے اور نغمہ کے رشتہ کی نوعیت بدل گئی۔ اب وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر' پگڈنڈی پر نہیں بھاگ سکتا تھا نہ ہی پچھواڑے میں بڑ کے درخت کے نیچے وہ گھنٹوں کھیل سکتے تھے۔ حیا کی ایک دبیز چادر ان کے بیچ کھنچ گئی لیکن ان کے درمیان ان کی محبت ویسے ہی قائم تھی۔

☆☆☆

کھلے آسمان تلے' بالائی منزل میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی...... وہ فوراً کھڑکی سے جھانک کر دیکھنے لگی۔ اگلے ہی پل اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی۔

نیچے کھڑا زرک اس کو سر اٹھائے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں لیکن چہرہ مسکراہٹ سے مبرا تھا۔

"یہ گلاب کس لیے؟" نغمہ کھڑکی کے چوکھٹے میں دونوں کہنیاں جما کر اب پوری دلجمعی سے اس کو دیکھنے لگی۔

"تمہارے لیے۔"

"تم مجھے گلاب اس طرح دو گے؟...... میرے گالوں پر دے مار کر؟"

"تم اس طرح کھڑکی میں کھڑی رہو گی تو......"

"اور اگر میں کھڑکی میں نہ کھڑی ہوں تو؟"

"پھر تمہارے بالوں میں سجاؤں گا۔"

"آدے کہتی ہے جوان لڑکیوں کے بالوں میں پھول نہیں سجاتے...... جن عاشق ہو جاتے ہیں۔"

"آدے مجھے بھی جن کہتی ہیں۔"

اس کے جواب پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"آدے یہ بھی کہتی ہے کہ تم صرف باتیں بگھارتے ہو۔ صرف باتیں ہی کر سکتے ہو بالوں میں پھول لگانے کی......"

"اور تم ڈرپوک ہو، بھاگ جاتی ہو۔"

"وائی اللہ توبہ...... دمرہ چین دروغ؟ (سفید جھوٹ!)"

"آؤں اب اوپر...... پھول لگانے؟"

"بالکل...... آؤ...... میں بھی دیکھوں ہمت......" نغمہ نے اس کی ہمت آزمانی چاہی۔ زرک فوراً بڑ کی اور بڑھا۔ کیونکہ بڑ کی ایک بڑی شاخ چھت سے ملتی تھی۔ وہ دلچسپی سے اس کو چڑھتا دیکھ رہی تھی کہ اگلے ہی پل اس کے چہرے کا رنگ اڑا۔

"اللہ...... وائی......" نغمہ کی آواز میں وحشت تھی۔

وہ جو تھوڑا اوپر چڑھا۔ فوراً کودا تھا لیکن سنبھل نہ سکا اور گر گیا۔ اس کے گرتے ہی کھڑکی سے 'ھی ھی' کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ نغمہ کھڑکی میں کھڑی اس پر ہنستی جا رہی تھی۔ زرک نے ارد گرد دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس کا چہرہ اتر گیا اور وہ مسلسل ہنسے جا رہی تھی۔

"آدے تمہیں پاگل اس لیے کہتی ہیں کہ چھت پر آنے کے لیے درخت نہیں' سیڑھیوں کا استعمال کیا جاتا ہے...... لیونیا (پاگل)......" یہ کہہ کر وہ منہ پر ہاتھ رکھے ہنستی چلی گئی۔ وہ منہ بناتا فوراً باہر چلا گیا۔ حالانکہ اس کو مور جانے نے کسی کام کے لیے بھیجا تھا۔

☆☆☆

بڑے قبرستان کے ارد گرد سفیدے کے بڑے بڑے قد آور درختوں کا جھنڈ تھا۔ قبرستان کے سامنے بڑی مسجد کے کھلے دروازے سے لوگ نکل رہے تھے۔ کہرا بڑھتا جا رہا تھا اور شال اوڑھے زرک کے سر پر نماز کی ٹوپی تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے اپنے گھر کی اور جا رہا تھا۔ پکی سڑک کا راستہ طویل تھا۔ سو اس نے بڑے قبرستان کے سفیدے کے جھنڈ والا راستہ

اپنایا۔ معاً اس کو سامنے چادر کے نیچے چھپے بندے کے منہ میں جلتا ہوا سگریٹ دکھائی دیا......

"کون ہو؟" اس نے احتیاطاً پوچھا تھا۔ جیسے ہی وہ قریب پہنچا۔ اب تھوڑی بہت شام کی نیلی روشنی میں اس کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ چرس کی کسیلی بو اس کے ناکوں میں گھس رہی تھی۔

"تم ...... یہ......" وہ ششدر سا نیک احمد کو دیکھ رہا تھا' جس کے منہ میں چرس سے بھرا سگریٹ دبا تھا۔

نیک احمد کے سر پر نشہ چھا چکا تھا۔ وہ اس کو نہیں سن رہا تھا۔ اس نے نیک احمد کو بازو سے پکڑ کر اٹھانا چاہا لیکن نیک احمد نے اس کو دھکا دیا اور بھاگتا ہوا دوسری جانب گم ہو گیا...... جاتے ہوئے اس کے پشت پر چادر سرک کر گری تھی۔ زرک نے جھک کر اس کی چادر اٹھائی۔

گھر پہنچ کر وہ سیدھا سلطانہ آدے کے گھر گیا۔ ان کے صحن میں اندھیرا تھا اور دور کمرے کے ادھ کھلے دروازوں سے بجلی کی روشنی نکلتی' برآمدے کی لیپ شدہ زمین پر پھیل رہی تھی۔ جارٹی سے دھواں اٹھ رہا تھا اور اسی سے شاہ گل باہر نکلی تھیں۔ اس کو وہیں رکے دیکھ کر استفسار کرنے لگیں۔

"رازہ کنہ؟ (آؤ ناں) وہاں کیوں کھڑے ہو؟"

اس نے گہری سانس لی' سو اس کو شاہ گل کو بتانا چاہیے۔ حبیب الرحمن کاکا کو بتا دیتا تو شاید اس کو مار پڑ جاتی۔

"شاہ گل! میں گیا تھا تاجے ترور (پھپھو) کے گھر کوز کندے (نچلا محلہ)۔ مور جانتے' نے دیسی گھی دیا تھا' ان کی بہو کے لیے...... وہاں نماز پڑھ کر میں بڑے قبرستان کے راستے آنے ہی والا تھا کہ وہاں مجھے سفیدے کے جھنڈ میں نیک احمد ملا......" وہ آگے کے جملہ بولنے کے توقف کر کے گہری سانس لے رہا تھا۔

شاہ گل کا چہرہ زرد سا پڑنے لگا' وہ اس جگہ کی بری شہرت سے واقف تھیں۔

اسی سے ان کے پیچھے کھڑا حبیب الرحمن ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ شاہ گل کے چہرہ مزید سفید پڑ گیا۔ انہوں نے اشارے سے زرک کو بتانے سے منع کیا۔ زرک آہستگی سے چادر چھپانے لگا۔

"کیا کر رہا تھا وہ؟" اس کو خاموش پا کر اس نے انہوں نے اس کے ہاتھ سے چادر چھینی اور اس کو سونگھا۔ چرس کی دبی دبی بو ان کے نتھنوں سے ٹکرائی اور ان کے بے ڈھب و بڑے سے ابرو ترچھی ہو کر ایک دوسرے میں مدغم ہونے لگے۔ "لباس خانہ۔ علی خانہ۔"

کاکا جی چیخ کر اندر کمرے میں گڑ کی چائے کی چسکیاں اڑاتے اپنے بیٹوں کو پکارنے لگے۔ ان کی پہلی آواز پر دونوں فوراً باہر نکلے۔ ان کے چہرے پر اڑتے غیض و غضب کی پرچھائیں دیکھ کر ان کی سانس اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ ان کی چیخ پر باقی سب بھی باہر نکل آئے۔

"جاؤ اور بڑے قبرستان سے اس کم بخت کو ڈھونڈ کر نکالو۔ اگر وہاں ملے تو ایک اس کو کھینچ کر لائے یہاں اور ایک اس کے لیے وہاں قبر کھودے......" یہ کہہ کر انہوں نے چادر نیچے زمین پر پھینکی۔

سلطانہ آدے سر جھکائے زرک سے پوچھ رہی تھیں اور نغمہ اس کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں میں دکھ سا تھا۔ شاہ گل کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا۔

"مجھے معاف کر دیں شاہ گل' میں ایسا نہیں چاہتا تھا...... میں تو بس آپ کو بتانا چاہ رہا تھا۔" زرک شرمندگی سے معافی مانگ رہا تھا۔ شاہ گل خاموش کھڑے ہوئے اضطراب سے انگلیاں بھینچ رہی تھیں۔ ان کو زرک سے کوئی گلہ نہیں تھا' اس کی سچائی پر ان کو یقین تھا۔ بس آنے والا طوفان ان کے دل کی دھڑکن کو تیز کر رہا تھا۔

☆☆☆

"تم نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔" نغمہ کے لہجے میں اس کے لیے بے اعتباری تھی اور دکھ بھی

......اس کی بات پر پہلے زرک نے اس کو تڑپ کر دیکھا۔

"تم ایسا کہہ بھی کیسے سکتی ہو؟" وہ بے یقینی سے اس لڑکی کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ جس سے اس کو محبت تھی۔

"کیوں نہیں کہہ سکتی۔ پورے خاندان میں تم نے میرے بھائی کو بے عزت کردیا۔ تم نے اس پر جھوٹا الزام اس لیے لگایا تھا کہ تم اس سے بچپن کی اس بات کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔" نغمہ بے دردی سے کہتی اس کے دل پر مزید ضربیں لگا رہی تھیں۔

"بچپن کا بدلہ؟......" اس نے طنزیہ ہنکارا بھرا اب وہ بے یقینی کے بعد دکھ کی سیڑھی پر کھڑا تھا۔ "تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہو میرے لیے؟ میں بچپن کا بدلہ لے رہا تھا؟" اپنے سینے پر انگلی رکھ کر استفسار کر رہا تھا۔ "میں نے بہت سوچ سمجھ کر صرف شاہ گل سے بات کرنا چاہی تھی۔ لیکن اس وقت کاکا جی نکل آئے۔ اس میں میری غلطی نہیں تھی۔ اگر مجھے اس سے بچپن کا بدلہ لینا ہی تھا تو میں اس طرح نہ لیتا۔ میں اس کو پڑے رہنے دیتا اس تاریکی میں۔ وہ چرس پیتا اور تم لوگ بے خبر رہتے۔ لیکن میں نے اس کی بھلائی سوچی تھی نغمہ! آخری بات...... میں جھوٹ نہیں بولتا' اور اس چرس کی گواہی غفار حجام اور اشرف ماما بھی دے چکے ہیں...... صرف میں نے نہیں دیکھا ہوا اسے......" وہ اتنا کہہ کر تن فن کرتا وہاں سے چلا گیا۔

گھر آ کر غصے میں اپنے کمرے جا گھسا اور دروازہ بند کر کے' چارپائی پر لیٹ کر' آنکھوں پر بازو رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

۔اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ نغمہ سے بات نہیں کرے گا۔ اگر اس کو اپنے بھائیوں کے دستار کی اتنی ہی فکر ہے' تو اس کو بھی اپنی محبت کے وقار کا خیال ہے......!

ساری رات وہ اس کی باتوں پر کڑھتا رہا۔ اگلے دن اس کا اسلامیہ کالج میں پہلا دن تھا اور اس کو فجر دم ہی اٹھنا تھا باڑہ کی بس کے لیے...... صبح نماز پڑھ کر وہ اپنے سفید کپڑے پہن کر' کتابیں لے کر روانہ ہوا۔ گھر سے نکلتے اس نے دیکھا کہ نغمہ پانی بھر رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں اور اس نے فوراً نظریں موڑ لیں۔ نغمہ اس کے پشت کو دیکھتی رہی۔ اس نے کل رات بہت برا کیا تھا۔ اس کو افسوس ہو رہا تھا اور اپنی غلطی کا احساس بھی۔

☆☆☆

جب وہ بس سے اترا تو گاؤں کے اسٹاپ پر' سہ پہر کی نارنجی روشنیاں پھیلی ہوئی تھی۔ گنے کے کھیتوں میں ایسا لگتا تھا کہ سارا گاؤں اکٹھا ہوا تھا۔ کوئی گنے کے گٹھڑیوں کو کندھوں پر اٹھائے جا رہا تھا اور کوئی پاندونوں (گنے کا اوپری حصہ' جو مویشوں کو کھلایا جاتا ہے) کر رہے تھے۔ ان کے مزدوروں نے اس کو دیکھ کر سلام کیا تھا۔ وہ جواب دیتا آگے بڑھ گیا تھا۔ ان کے خاندان میں' بلکہ پورے گاؤں میں زرک پہلا لڑکا تھا جو پانچویں جماعت سے آگے پڑھ کر اب کالج بھی جانے لگا تھا۔

حبیب کاکا نے نیک احمد کو میاں صاحب کے مدرسے کلی (گاؤں) بھیج دیا تھا۔ باقی دونوں بھائی اپنے کھیتوں کے کام دیکھنے لگے تھے۔ وہ ویسے بھی اپنے کام سے کام رکھنے والے لوگ تھے۔

جیسے ہی وہ اپنے گھر پہنچا تو صحن میں بچھائی گئیں چارپائیوں پر بیٹھے' سہ پہر کی بچی کچی دھوپ سینکتی مور جانہ کے سامنے برکت ماما بھی بیٹھے تھے۔ اس کے چہرے پر ایک خوبصورت دلکش مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ان کے پاس پہنچ کر گلے لگ گیا۔

"کتنے عرصے بعد دیکھا ہے بھئی اس کو...... اس کی تو مونچھیں بھی نکل آئیں اور یہ کیا تم نے حجامت بھی کرنی شروع کردی کیا؟" اس کے چہرے کا بھرپور جائزہ لیتے برکت ماما (ماموں) اس سے پوچھ رہے تھے۔

"وہ خیرہ (خیر سے) اس کی حجامت کا حلوہ

پچھلے مہینے پکایا تھا......" مور جانہ بیٹے کو پیار سے دیکھتے ہوئے' اپنے بھائی کو بتا رہی تھیں۔ (پرانے وقتوں میں' لڑکے کی پہلی حجامت پر مائیں حلوہ پکاتی تھیں)

"مونچھیں تو چھوڑی ہیں......لیکن میرے سامنے تاؤ مت دینا ورنہ میں کاٹ دوں گا۔" برکت ماما اس کو مصنوعی دھمکی دے رہے تھے۔ اس نے سنتے ہی تاؤ دیا اور برکت ماما نے 'شیطان' کہتے ہوئے اس کا کان پکڑا۔ وہ کراہنے لگا۔

"توبہ' بیا نہ کوم (پھر نہیں کروں گا)" اس بات پر برکت ماماجی نے فوراً اس کے کان چھوڑے تھے۔

"کہاں داخلہ لیا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"اسلامیہ کالج میں۔" اس نے جواب دیا۔

"واللہ......باقی کسی کو تو شوق نہیں۔ نہ ہی اس کے باپ نے کچھ کہا۔ کہہ رہے تھے کہ جو جی میں آئے کرے' بس ایسے کام نہ کرے جس سے ان کے دستار کو خطرہ ہو۔" مور جانہ نے دونوں کے علم میں اضافہ کیا۔

"تعلیم سے دستار کو کبھی خطرہ نہیں ہو سکتا آپا۔ بے فکر رہو زما زرک خان (میرا زرک) کبھی ایسا کام نہیں کرے گا۔ اچھا تم بتاؤ۔ کس چیز میں داخلہ لیا ہے؟"

"آرٹس لیا ہے' ماماجی۔"

"سائنس کیوں نہیں؟ ڈاکٹر نہیں بننا کیا؟"

مسکرا کر ان کی باتیں سنتے ہوئے مور جانہ کے چہرے پر مسکراہٹ غائب ہوئی۔ "وائی اللہ! تم ڈاتر (ڈاکٹر) نہیں بنو گے؟ میں تو ہر کسی کو کہتی ہوں کہ میرا بیٹا ڈاتر بنے گا۔" ان کا انداز ایسا تھا کہ جیسے بڑا دھچکا لگا ہو۔

"نہیں مور جانے۔ میں ڈاکٹر بنوں گا۔ لیکن کتابوں کا ڈاکٹر۔ انسانوں کا نہیں۔" وہ برکت ماما کے سوال کا جواب دے رہا تھا یعنی اس کو پی ایچ ڈی کرنا تھی۔

"لو پھر کیا فائدہ تمہارے پڑھنے کا' ہنہ۔" مور جانہ ناک بھوں چڑھاتے ہوئے اٹھی تھیں۔ "اچھا تم بیٹھو تھکے ہارے آئے ہو۔ میں تمہارے لیے چائے بنا دوں۔"

ان کے انداز پر دونوں ماموں بھانجا ہنستے چلے گئے۔

☆☆☆

اور یہ اگلی جمعرات کا قصہ ہے۔

شام ابھی محو استراحت تھی اور وہ نماز پڑھ کر گھر آ رہا تھا۔ وہ ہر دن شام کو پڑھائی کرتا تھا۔ جیسے ہی وہ اپنے کمرے جا رہا تھا۔ تو برآمدے کے ستون سے کسی نے اس کا بازو دبوچا اور اس کو سیڑھیوں کی اور کھینچا تھا۔ چوڑیاں ہلکی سی کھنکی تھیں اور پہلے تو وہ اس افتاد پر سنبھلا نہیں......جب سنبھل چکا تو سمجھ بھی گیا۔ تیسری سیڑھی پر وہ رکا تھا۔ اوپر چڑھتی نغمہ بھی رکی تھی۔

"گلے کرنے ہو یا خفگی میں منہ بسورنا......اوپر آ کر شرافت سے کرو......" نغمہ کے لہجے میں بیک وقت' دلربائی بھی تھی' سختی بھی اور التجا بھی......اس نے پہلے شام کی نیلگوں روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کی تہہ میں باریک چاندنی جیسی تہہ چمک رہی تھی۔ وہ سپاٹ چہرہ پر سنجیدگی سجائے' لیکن دل میں مسکراہٹ دبائے اوپر چڑھنے لگا۔

"کہو......کیا کہنا ہے......" سینے پر ہاتھ باندھ کر وہ چہرہ موڑے پوچھ رہا تھا۔

"پہلے آنکھوں میں دیکھو۔" اس کے سامنے کھڑی نغمہ کہہ رہی تھی۔

"ان آنکھوں میں؟ جن میں کچھ دن پہلے میرے لیے بے یقینی تھی؟" خفگی میں طنز ملاقات کا حسن بڑھا دیتا ہے۔

"تم دیکھو تو سہی......" وہ منمنائی۔

"نہیں دیکھنا......کام کی بات پر آؤ......نیلی آنکھوں والے لوگ دروغ گو (جھوٹے) اور ساحر ہوتے ہیں۔" اس کی زبان پر ایسے جملے کیوں مچل رہے تھے' اس کو خود بھی حیرت ہونے لگی تھی۔ اس کا

دل تو اتنا بے قرار تھا اس کی آنکھوں میں دیکھنے کے لیے......اور اس کا کتابی چہرہ دیکھنے کے لیے......

"تم اب بھی خفا ہو؟" وہ اب روہانسی ہو کر پوچھنے لگی۔ "دیکھو تم نے کہا تھا کہ گلاب تمہارے بالوں میں سجاؤں گا۔ دیکھو میں لائی ہوں گلاب۔ میری ہتھیلی کو دیکھو۔" اس نے ہتھیلی پھیلائی۔ نا چاہتے ہوئے بھی زرک نے ترچھی نظروں سے اس کی ہتھیلی کو دیکھا تھا اور اگلے ہی پل نغمہ نے اس کی چوری پکڑ لی اور ہنسنے لگی۔ ایک دفعہ پھر سے وہ اس کو بے وقوف بنا گئی۔

وہ خفا ہوتا مڑ کر جانے لگا کہ ایسے میں نغمہ نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ پھیلایا اس کے عین سامنے......اس میں گلاب تھا......

"منانے آئی ہوں۔ مان جاؤ۔" وہ دوسرے ہاتھ سے کان پکڑے کہہ رہی تھی اور اس کے انداز پر وہ پگھل گیا۔ کچھ دیر وہ کھڑا اس کو خفگی سے دیکھتا رہا۔ پھر مسکرایا اور اس کے ہتھیلی سے گلاب اٹھا کر اس کے بالوں میں کان کی پیچھے سجانے لگا۔

"دنیا ایک طرف ہو میرے خلاف، تمہیں دوسری طرف کھڑے ہو کر میرا ساتھ دینا چاہیے' نغمہ!" اب اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہہ رہا تھا۔

"تم اب ایسی ملاقاتوں میں فلسفے بگھارو گے؟" اس نے منہ بسورا۔

"تو شاعری کروں کیا۔" وہ ہنسا تھا۔

"ہاں......شاعری سناؤ۔" اس کے مذاق میں کہی گئی بات کا امتحان بناتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ پہلے تو وہ سٹپٹا گیا......ایسے موقع پر دماغ کے سارے خانوں پر قفل لگ جاتا ہے۔ پھر اچانک صبح پشتو کے ٹیچر کے لیکچر کے دوران کہے گئے غزل کے شعر یاد آئے......وہ مسکرایا اور کھنکار کر گلا صاف کیا۔

"جانانہ سترگو پہ سترگو کی می گورہ

(جانان! آنکھوں ہی آنکھوں میں دیکھو)

چہ درتہ اوخکاری دہ چیل

(کہ تمہیں دکھے تمہارے

وہ چیل جبیں خالونہ"

(تمہارے ماتھے کی بندیا)"

اسی سے' نغمہ نے دیکھا محبت کا دیکھنا کیسا دیکھنا ہوتا ہے......اس کے دل کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہوئیں اور گال دہک کر لال ہو گئے۔ زرک کی پار ہوتی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے' وہ فوراً مڑی اور نیچے جانے لگی......

وہ ہنسا تھا...... "رکو تو......ڈرپوک......!"

☆☆☆

اسلامیہ کالج کی تاریخی عمارت پر سرما کی دھوپ سرک رہی تھی۔ سردیوں میں وہ سفید یونیفارم پر' کالی شیروانی پہنتے تھے۔ اس وقت وہ شیروانی پہنے دھوپ سینکتے انتاکشری کھیل رہے تھے۔ اس کے پاس ٹپوں اور غزلوں کی ایک بہتات تھی۔ جیسے ہی جملہ ختم ہوتا' وہ آخری حرف پر فوراً ہی غزل سنانے لگتا ......اور وہ زیادہ تر غنی خان بابا کی غزلیں ہوتیں......

کلاس کا ٹائم ہو گیا تھا۔

وہ اپنے سوات کے دوست کے ساتھ اب کلاس کی طرف جا رہا تھا۔

"تمہارا حافظہ بہت اچھا ہے زرک خان اور ذوق بھی......" سوات کا سنگریار اس کی تعریف کر رہا تھا۔ "کہاں سے پڑھا ہے اتنا سب کچھ؟"

وہ مسکرایا اور......چمکتی دھوپ میں آنکھیں چندھیاتے ہوئے وہ کہنے لگا۔

"میرا ماما ہے......چارسدہ اتمان زئی میں۔ ان کے پاس ٹیپ ریکارڈ ہے اور اتنے سارے کیسٹس۔ جب بھی جاتا تھا میں ان کے ہاں تو ان کا ریڈیو ہر وقت بجتا تھا اور نا چاہتے ہوئے بھی میں سنتا تھا......تو ایسے بہت ساری غزلیں حفظ ہو گئیں۔" اس نے تفصیل سے بتایا تھا۔

"تمہاری لکھائی بھی بہت اچھی ہے......بالکل خطاطوں والی......" سنگریار بہت متاثر معلوم ہوتا تھا۔

"نہیں یار۔ اب اتنی بھی نہیں۔"

"آرٹ کے اور کون سے شعبوں سے زیادہ شغف ہے؟"

"بس کچھ خاص نہیں ......" بچپن کا ایک تلخ واقعہ اس کے حلق میں کسی کانٹے کی طرح آن پھنسا تھا۔

"میں مان نہیں سکتا۔ اس دن تم تاریخ کی کتاب پڑھ رہے تھے لائبریری میں۔ اور کئی دن سے میں تمہیں نوٹ کرتا ہوں تم مجسمہ سازی کے ہی صفحات پڑھتے ہو اور مشہور مجسمہ سازوں کے مجسمے دیکھتے ہو۔"

وہ مسکرایا۔ "لگتا ہے تم میری جاسوسی کرتے ہو۔"

"نہیں۔ بس وہ تمہاری محویت مجھے دیکھنے پر مجبور کرتی تھی۔ اب بتاؤ بھی۔ اس میں کیا ہے؟ مجھے افسانے لکھنے پسند ہیں۔ چند افسانے لکھے تھے پھر ڈرتے ڈرتے پشتو ڈیپارٹمنٹ کے مقصود صاحب کے پاس لے گیا۔ وہ جتنے بڑے لکھاری، شاعر اور مجسمہ ساز ہیں اتنے ہی اچھے، اور بڑے دل والے انسان بھی ...... اتنی عجز و انکساری میں نے کسی میں آج تک نہیں دیکھی۔"

"تو وہ پڑھ کر رائے دیتے تھے؟" وہ اب تجسس سے اس کی اور متوجہ ہوا۔

"ان کا بڑا پیارا انداز ہے۔ پڑھ کر پوچھتے ہیں کہ افسانے کی پہلے اچھی بات بتاؤں یا بری؟ میں کہتا ہوں کہ اچھی ...... کہتے ہیں کہ پہلی بری بات بتاتا ہوں کہ کڑوی چیز کے بعد میٹھی چیز کھاؤ تو کڑواہٹ دور ہو جاتی ہے۔" سنگریار ہنستا تھا۔

"انہیں مجسمہ سازی پر ...... مصوری پر ...... کوئی کچھ نہیں کہتا؟" وہ رک کر اس سے پوچھنے لگا۔

"کیا مطلب کوئی کچھ کیوں کہے گا۔"

"میرا مطلب ...... لوگ مانتے ہیں کہ یہ گناہ ہے۔"

"یار! اس بارے میں میرا علم صفر ہے۔ نیم ملا خطرہ ایمان کے تحت میں چپ رہنا بہتر سمجھوں گا اس موضوع پر ...... کیوں نا تم بھی میرے ساتھ چلو اگلی دفعہ ......" سنگریار کا لہجہ بہت نرم اور معصومیت سے بھرپور ہوتا تھا۔

"وہ برا مان جائیں گے۔" وہ سر نفی میں ہلانے لگا۔ درحقیقت وہ سنگر سے یقین دہانی چاہتا تھا کہ وہ کچھ نہیں کہیں گے۔

"وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ وہ بہت اچھے ہیں بھئی۔" سنگر نے مسکرا کر اس کے شانوں پر ہاتھ مارا اور وہ مسکرایا۔ اتنے عرصے بعد اس کے اندر شوق کی آگ کو چنگاری ملی تھی۔

☆☆☆

پھر میں وہ سنگریار کے ہاسٹل پہنچ گیا وہ مقصود صاحب کے گھر گئے۔ انہیں دیکھ کر مقصود صاحب کے چہرے پر ایک مہربان مسکراہٹ پھیلی۔ "ایک اور آرٹسٹ؟ یا صرف دوست؟"

وہ سنگر سے مسکرا کر پوچھ رہے تھے۔ سنگر بھی ہنس پڑا۔ "سر جی یہ متجسس آرٹسٹ ہے۔ کچھ سوال پوچھنے آیا ہے۔"

"آؤ ......!" مقصود صاحب کی تقلید میں وہ دونوں گھر میں داخل ہوئے۔ ایک راہداری میں سے گزر کر وہ گھر کی پیچھے ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں آئے۔ سنگر باہر لان میں ہی بیٹھ گیا تھا۔ وہ مقصود صاحب کا اسٹوڈیو تھا۔

اسٹوڈیو بے ترتیب تھا۔ کہیں ہائیڈروکال کی بالٹی پڑی تھی، ووڈنگ ٹولز، اسکریپرز۔ وہ جوان اوزارو ں کے نام تک نہیں جانتا تھا۔

"سامنے دیکھو ...... مٹی نظر آرہی ہے نا، گارے جیسی۔ اس کو کلے کہتے ہیں۔ جاؤ اور کچھ بنا کر دکھاؤ، میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم میں قدرتی صلاحیت ہے کہ نہیں۔" مقصود صاحب اس کو سامنے میز پر پڑے چار مختلف کلے کی اقسام کی طرف اشارہ کر کے بول رہے تھے۔

زرک نے گہری سانس بھری ...... اور اس وہاں جا کر چاروں کلے میں سے ایک کلے کا انتخاب

کیا اور ہاتھوں سے اسی چڑیا کا مجسمہ بنانا شروع کیا جو وہ اور نغمہ بچپن میں ایک ساتھ بناتے تھے۔ جب بنا چکا تو مقصود صاحب کو دکھایا۔ وہ کچھ دیر اس کو پکڑے خاموشی سے گھورتے رہے۔

"سب سے پہلے یہ بتاؤ' تم نے اس کلے کا انتخاب کیوں کیا؟"

"کیوں کہ یہ لچکیلی مٹی تھی۔"

"اور اس سے کیا ہوتا ہے اگر مٹی لچکیلی تھی' باقی بھی تو اسی طرح کی تھیں ناں؟"

"نہیں سر جی ...... باقی اس طرح نہیں تھیں۔ یہ والی آسانی سے خشک نہیں ہوتی' اس لیے اس کو دوبارہ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ باقی میں پانی استعمال کرنے کی ضرورت تھی۔"

"ہمم۔" مقصود صاحب نے لمبا ہنکارا ابھرا۔ "تمہاری بات ٹھیک ہے بیٹا۔ یہ کلے جو تم نے استعمال کی' اس کو waxy clay or oil based clay کہا جاتا ہے اور یہ جلدی سوکھتا نہیں اور دوبارہ استعمال کیا جا سکتا ہے ......" پھر انہوں نے چڑیا کو دیکھا۔ "اور یہ ...... تمہارے ہاتھوں میں فن ہے' قدرتی فن ...... اس کو تراش کی ضرورت ہے' اور اس فن کے ہیرے کو تراشنے کا جوہری کون ہے' یہ بھی بتا دوں گا ...... لیکن اس سے پہلے تم مجھے یہ بتاؤ' تم کس تجسس اور کون سا سوال پوچھنے آئے ہو۔ تمہاری آنکھیں مضطرب دکھ رہی ہیں۔"

"سر! بچپن میں' میں تصاویر بناتا تھا۔ ان تصاویر پر مجھے قاری صاحب نے پیٹا اور ملعون کہا۔ کیا مجسمے بنانا گناہ ہے یا یہ آرٹ ہے۔"

"سو یہ تجسس نہیں ...... کنفیوژن ہے۔" مقصود صاحب مسکرائے اور اپنی کرسی سے اٹھے۔ "خیر' اس موضوع پر بات کرنے سے پہلے میں تمہیں پہلے یہ واضح کر دیتا ہوں کہ ہاں یہ آرٹ ہے اور ہاں یہ گناہ ہے۔ اسلام میں اس کی ممانعت ہے۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا فرمان ہے کہ' جو شخص مجسمہ تراشے گا' قیامت کے دن اللہ اس سے مطالبہ کرے گا کہ اپنے تراشیدہ مجسمے میں روح پھونک دے اور وہ اس کام میں عاجز اور ناکام ہو گا ...... ایک دوسری روایت بھی ہے کہ' جو شخص بھی مجسمہ تراشی کرے گا مانو اس نے اللہ سے جنگ کی۔'

سو یہ پہلے جان جاؤ کہ یہ گناہ ہے' اب اگر یہی تمہارا سوال تھا تو اس کا جواب یہ ہے ...... اور کوئی سوال؟"

"سر! لوگ مانتے ہیں کہ یہ ایک خدائی وصف ہے؟"

"ادھر آؤ' اس مجسمے کو دیکھو۔" مقصود صاحب اپنے کام کا ایپرن پہن کر اب اسٹینڈ پر لگے کلے کے مجسمے کے خدوخال کو سنوار رہے تھے۔ "انسان دو چیزوں سے بنتا ہے۔ ایک جسم' اور ایک روح۔ یہ دونوں مل کر بناتے ہیں نفس۔ ان دونوں کی جوڑی میں' جسم کی مثال ایک غلام اور روح کی مالک کی سی ہے۔ اور روح پھونکنے کا وصف صرف خدا کے پاس ہے ...... اس لیے ہاں یہ ایک خدائی وصف ہے۔ خدا نے ہر انسان کو الگ الگ مٹی سا بنایا ہے' پھر اس کا سانچہ (جسم) اس میں روح پھونکی ہے ...... اور یہی وصف ہم مجسمہ سازوں کے پاس نہیں ہے۔ اسی طرح یہ خدا کے وصف کی برابری کی ایک نقل ہی اور کسی حد تک شرک میں حساب ہوتا ہے۔"

"سر! اگر ہم کسی اہم شخصیت کا فرضی مجسمہ بنائیں' تو کیا یہ بھی ممنوع ہے؟ کیونکہ اس شخصیت کا تو سب کو معلوم ہوتا ہے اور نہ ہی ہم اس میں روح ڈالتے ہیں۔" وہ اپنا نچلا لب اضطراب میں کاٹ رہا تھا' یوں جیسے اس کو اپنے من پسند جواب سننے کی جلدی تھی۔

"اس کے دو جوابات ہیں' پہلا آج کے زمانے کے مطابق' جہاں آرٹ کو مذہب کے متعین کیے گئے پیمانوں میں نہیں ناپا جاتا ...... تو ہاں' آرٹ کی یہ قسم کافی مقبول اور کافی عرصے سے استعمال ہو رہی ہے۔ اس کا دوسرا جواب ہے کہ اسلام کے رو سے نہیں۔ کیوں؟ یہ ایک واقعے سے سمجھاتا ہوں۔ فتح

مکہ کے بعد، جب حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کعبے گئے تو انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ اسلام اور حضرت عیسی علیہ سلام کے مجسمے دیکھے، جن کے ہاتھوں میں کاسے تھے۔ ان کاسوں کے نام "ازلام" تھے۔ تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے ناراضی سے فرمایا کہ "اللہ ان مجسموں کے بنانے والوں کو ہلاک کردے۔ خدا کی قسم! وہ بھی جانتے ہیں کہ ان دو پیغمبروں نے ایسا کام انجام نہیں دیا ہے۔" تو کسی مذہبی شخصیت کی، یا ایسے کسی عام شخص کا مجسمہ بنانا بھی صحیح نہیں مانا گیا اور پسند نہیں کیا گیا۔"

"سر! آج کے زمانے میں ہم اس کو پوجتے تو نہیں ہیں ناں۔" زرک کے ماتھے پر چند شکنیں تھیں یوں جیسے اسے من پسند جواب نہ ملنے پر خفا ہو۔

"آج کے زمانے میں پوجنے کے لیے اور کئی خدا ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ماڈرن زمانے میں انسانوں سے زیادہ خدا پائے جاتے ہیں۔ آج کے لوگ اللہ کے علاوہ بھی کئی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں۔ طاقت، حرص، خود غرضی، شہرت، دولت، ہوس، خوشی، کامیابی، انسان، رتبہ، دھوکہ، انا، قوم، تعصب، اولاد...... یہ سب...... جو جو چیز آپ کو اللہ سے دور کر دیتا ہے وہ آپ کا خدا بن جاتا ہے۔ آپ اس کو پوجتے ہیں، اس کے لیے ہر حد پار کر دیتے ہیں۔"

"سر! آخری سوال...... آپ کو جب اتنا پتا ہے کہ پھر آپ مجسمہ سازی کیوں کرتے ہیں؟" پھر سے زرک نے لب کاٹے۔

"اللہ نے انسان کے جسم اور روح کی باگ نفس کو تھمائی ہے۔ نفس اس چیز کی طرف بہت مائل ہوتا ہے، جس میں آپ کو دلکشی دکھے...... اور یہ دلکشی بھی بطور امتحان رکھی گئی ہے۔ سو میرا یہ شوق نفس کا تابع ہے۔ جیسے ہم سب کو پتا ہے کہ گانا سننا گناہ ہے لیکن ہر کوئی یہ بات جان کر بھی سنتا ہے......"

"لیکن آج کا دور تو ماڈرن ہے، اس کو کوئی برا نہیں مانتا...... سبھی یہی کرتے ہیں...... نئے زمانے کی چال پر چلنا۔ اس کو پیشہ بناتے ہیں۔ جب میری اس صلاحیت سے اگر کسی انسان کو کوئی ضرر نہیں پہنچ رہا تو میں اس کو کیوں نا اپناؤں؟"

اس کے دونوں ابروؤں کے بیچ ایک الف سا کھنچ گیا۔ آنکھوں میں شوق کی جوالامکھی کی تپش پھوٹنے لگی۔ بالٹی میں مکسنگ کرتے مقصود صاحب نے سر اٹھا کر اس کو دیکھا تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"سو تم نے آرٹ اور مذہب کے بیچ ایک لکیر کھینچ دی ہے۔ تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں اس جوہری کے بارے میں بتاؤں، جو تمہارے فن کو مزید تراشے؟"

☆☆☆

اس کی آنکھوں میں تپش تھی، اپنے شوق کی اور ہاتھ میں منزل کی چھٹی...... جہاں اس نے اپنے فن کے ہیرے کو تراشنا تھا...... نیشنل کالج آف آرٹس لاہور......

چونکہ اس کے گھر میں اس کی تعلیم سے کسی کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس لیے اس نے گھر میں محض اتنا بتایا تھا کہ اس کو لاہور جانا ہے۔ سکندر یار ٹھیک کہتا تھا، اس کو کسی کو بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ وہ کیا پڑھنے جا رہا ہے۔ صرف مور جانے کو بتایا تو ان کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے خوف کی پرچھائی گزری تھی۔

"اگر تمہارے باپ کو پتا چلا تو؟"

"انہیں پتا نہیں چلے گا، زما خوائے مورے (میری پیاری ماں)!"

اس کے ایف اے کے پرچے ہونے میں ابھی وقت تھا۔ اس دوران اس کے بڑے بھائیوں عباس لالہ اور نبیل کے رشتے طے کر دیے تھے بخت الرحمن کاکا کی بیٹیوں کے ساتھ اور اس کی دونوں بہنوں کے رشتے ان کے دونوں بیٹوں کے ساتھ...... شاہ گل تو باقاعدہ خفا ہو بیٹھیں کہ وہ نیک احمد اور لیاس خان کے لیے اس کی بہنوں کا سوچے بیٹھی تھیں...... مور جانے نے ان کے ہاتھ پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا تھا۔

"دیکھو شمیم! انہوں نے پہلے بات کر دی تھی۔ میں ان کو انکار نہیں کر سکتی تھیں ناں۔ تم پہلے رشتہ ڈالتیں تو میں تمہیں فوراً ہاں کر دیتی۔ جیسے تمہارے بچے مجھے عزیز ہیں' اس طرح عابدے کے بھی ہیں...... لیکن میرا زرک خان ہیں ناں ابھی...... اس کے لیے میں تم سے نغمہ کا کہہ رہی ہوں۔ رشتے کے لیے پورے روایت کے ساتھ آؤں گی لیکن ابھی سے تمہارے کان میں بات ڈال دی ہے......"

شاہ گل پہلے تو خاموش رہیں لیکن جب حبیب الرحمٰن کاکا کی طرف سے کوئی اعتراض نہ اٹھا تو انہوں نے مورجانہ کو عندیہ دے دیا۔ جمعے کی چھٹی پر جب نیک احمد آیا تو اس کی آنکھوں میں اس فیصلے پر تپش تھی۔

"زرک اس کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔"

"تم چپ رہو۔ اپنا بغض اپنے دل میں دبا دو' منہ پر لانے کی ضرورت نہیں۔ اس کے فیصلے کرنے والے ابھی زندہ ہیں۔ مدرسے نے تمہیں ذرا بھی نہیں بدلا ہے' محض نام کی ڈاڑھی چھوڑی ہے اور دین پڑھ رہے ہو؟" اس کی بات پر شاہ گل آگ بگولا ہو گئیں۔ ان کو زرک ویسے بھی پسند تھا۔

ان کی بات پر وہ خاموش رہا لیکن اندر غصے کی آگ جلتی رہی۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ عباس اور نبیل کی شادی میں نہیں ہو گا اگر وہ لوگ تماشے (گانا بجانا' رقص) کریں گے۔ اعتراض تو نیا نیا تبلیغ میں چار ماہ لگا کر آچکے رستم اور حبیب الرحمٰن نے بھی کیا لیکن وہ مہمانوں کے لیے چپ رہے اور کچھ نہ بولے......

"اس شادی میں تمہاری اور نغمہ کی منگنی بھی ہو گی......" کتاب پر جھکے زرک کو مورجانے اپنے تئیں خوش خبری سنا کر مسکرا رہی تھیں۔ کتاب سے سر اٹھا کر جب زرک نے دیکھا تو اس کا چہرہ اس خبر پر بجھا ہوا تھا۔

"کیا فائدہ!" اس نے رخ موڑ کر کہا۔ اس کی بات پر مورجانے کا چہرہ متغیر سا ہو گیا۔ "نکاح پڑھوا دیتیں سیدھا۔" کتاب میں سر رکھ کر شرمانے کی مصنوعی ایکٹنگ کرنے لگا۔

مورجانہ اس کے کمر میں ایک دھموکہ جڑ دیا۔

"مشروٹ (شریر)......!"

☆☆☆

عباس لالہ اور نبیل کی مہندی کا سلسلہ شروع ہوا' خاندان بھر سے کوئی نہ کوئی ان کے لیے مہندی لے کر آتا تھا۔ یہ دو ہفتے لگا تار عورتیں رات کو دولہوں کو مہندی لگاتیں اور تماشے کرتیں...... جب شادی کا ہفتہ شروع ہوا تو پورے خاندان میں ہر گھر میں مہندی پہنچائی گئی (ایک پرانی رسم)۔ وہ کسی کام کے سلسلے نغمہ کے گھر گیا تو نغمہ ان کے گھر سے آئی مہندی میں پانی ڈال کر گھول رہی تھی۔ اس کو آتا دیکھ اس نے فوراً دوپٹا ٹھیک کیا اور مہندی کو وہیں چھوڑ کر برآمدے کی اور دوڑ لگائی...... ان کی چھیانکا تانگی سے حقہ اٹھاتے ہوئے سلطانہ آدے مسکرائی تھیں۔

"وائی اللہ توبہ! لگتا ہی نہیں کہ یہ دونوں بچپن کے دوست ہیں جو سارا دن بڑ کے نیچے شیطانیاں کیا کرتے تھے...... اب دیکھو' تمہیں آتا دیکھ کر شرم کے مارے بھاگ کھڑی ہوئی......"

"آدے! مورجانے نے کہا ہے کہ یہ ہفتہ آپ ہمارے گھر گزاریں گی۔ غٹہ آدے (بڑی دادی) کے بعد آپ ہی ہماری سربراہ ہیں۔" وہ ان کے ساتھ بیٹھا تو انہوں نے ماتھا چوما تھا۔

"وائی زار! بس آتی ہوں شام کو...... ان شاء اللہ۔ تم آجانا مجھے لینے......" آدے نے مسکرا کر کہا پھر اس کو دیکھ کر مسکراہٹ دبا کر اشارہ کیا کہ اب دیکھو۔ "نغمے! بچے جلدی آؤ مہندی میں مرغیاں چونچیں مار رہی ہیں...... زرک خان چلا گیا۔"

ان کی آواز پر جیسے ہی باہر آئی سامنے دادی اور وہ مسکراہٹ روکے اس کو دیکھ رہے تھے۔ شرم کے مارے اس کا چہرہ فوراً سرخ ہوا تھا اور واپس دوڑی تھی۔ دونوں نے ایک دلکش قہقہہ لگایا۔

"شرما گئی۔" دادی قہقہے لگاتیں تو کھانسی بھی

ساتھ ساتھ چلتی۔

"اچھا آدے، میں چلتا ہوں...... شام کو لینے آؤں گا۔" اس نے تیز آواز میں کہا' درحقیقت وہ اس کو سنانا چاہتا تھا۔ اپنے کمرے میں کھڑی' پھولی ہوئی سانسوں اور بے ربط دھڑکنوں کے ساتھ اس نے منتقمانہ مسکراہٹ چہرے پر سجائی اور بڑبڑائی......

"دیکھو، اب میں تم سے کیسا بدلہ لیتی ہوں۔"

دونوں بے صبری سے آسمان کے کنارے شفق کے سیاہی میں تبدیل ہونے کا انتظار کرتے رہے ...... جیسے ہی شام نے پر پھیلائے' اسی وقت دونوں اپنی مخصوص جگہ پر کھڑے تھے۔ گھر کے پیچھے بڑ کے درخت کے پاس......

"مہندی کہاں کی تھی؟" اس کا پہلا سوال کتنا غیر معمولی تھا۔

"کیا مطلب...... چارسدہ سے لائے ہیں برکت ماما...... جلدی اور بہت چوکھا رنگ چھوڑتی ہے ......" اس نے اترا کر کہا تھا۔ "تم پوچھ کیوں رہی ہو ویسے......؟"

اس کے سوال کے جواب میں ایک دم سے نغمہ نے تازہ مہندی اس کے چہرے پر لکیر کی صورت لگادی۔

"اس لیے...... بڑے شوخے بن رہے تھے ناں؟ اب جلدی ہی چوکھا رنگ بھی چھوڑے گی......"

"وہ آدے کا مذاق تھا۔" وہ ششدر کھڑا اس کو کہہ رہا تھا۔

"اور یہ میرا......" پھر اس نے پیچھے سے مہندی سے بھرا آب خورہ اس کے سامنے کیا۔ "دیکھو سب مہندی لگا چکے ہیں۔ میں نے تمہارا انتظار کیا۔ تم نے کہا تھا ناں کہ مہندی تم لگاؤ گے۔"

نغمہ کی چالاکی پر وہ مسکرایا۔ "زخم دے کر مرہم بھی ساتھ رکھتی ہو؟"

"شادی کے بعد نمک رکھا کروں گی مرہم کی جگہ......" وہ کھلکھلائی۔

وہ بھی مسکرایا۔ نغمہ نے ہاتھ آگے کیے اور اس نے بہت محبت اس کے پورے ہاتھوں پر مہندی لگائی۔ اس کے دودھیا ہاتھ' سرخ مہندی میں رچے کتنے حسین دکھائی دیں گے۔ وہ سوچ مسکرایا تھا۔

☆☆☆

مہندی کی رات اس کی زندگی میں آنے والی سب سے حسین رات تھی۔ اس رات اس کی منگنی تھی۔ منگنی تو خیر صرف نام کی تھی۔ بس پورے خاندان کے سامنے شاہ گل کو زرک کو انگوٹھی پہنانی تھی اور مور جانے کو نغمہ کو......

وہ اپنے کمرے میں کھڑا' اپنے کپڑوں کے انتظار میں تھا۔ ایسے میں ایک لڑکی داخل ہوئی' جس کے کپڑے عام سے تھے لیکن چہرہ صاف و شفاف ...... وہ جتنی خوب صورت تھی' اس کا حلیہ بھی اتنا ہی عام سا تھا۔

"زرک لالہ...... یہ طلعتو باجی نے بھیجے ہیں۔" اس نے چارپائی کے سرے پر اس کے استری شدہ کپڑے رکھے اور فوراً مڑی تھی۔ وہ اس سے آنکھیں نہیں ملا رہی تھیں۔

"سنو...... تم قاسم کی بہن ہو؟" وہ پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا' جب ناکام رہا تو پوچھ بیٹھا۔

لڑکی نے پیچھے مڑ کر پہلی بار اس سے نظریں ملائیں۔ "آو جی۔ (ہاں جی)"

اس نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا۔ قاسم کے ساتھ اس کی اچھی خاصی دوستی تھی۔ جب وہ اتمان زئی جاتا تھا برکت ماما کے گھر تو اکثر اس کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ قاسم ایک سادہ مزاج کا بہت نرم دل انسان تھا۔

کپڑے پہن کر باہر نکلا تو صحن میں عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ سیدھا باہر نکلا اور حجرے چلا گیا۔ حجرے میں ٹنگ ٹکور (موسیقی کی محفل) جمی ہوئی تھی اور منتیوں کے ساتھ برکت ماما بھی بیٹھا پورے جوش و خروش سے ٹپے گا رہے تھے ...... وہ قاسم کے ساتھ بیٹھ کر اس کے حال احوال پوچھنے لگے۔

"لگتا ہے عباس سے زیادہ اس کو جلدی ہے۔"
اس کی خالہ زاد نے کہا تو باقی سب بھی قہقہے لگانے لگے۔ دروازے کے قریب اس کی سب کزنز کھڑی تھیں۔ سب لڑکیاں اس کی ٹانگیں کھینچ رہی تھیں۔ وہ حاضر جواب تھا اور اس کے جوابات ان کو محظوظ کرتے تھے۔ اس کی نظریں نغمہ کو ڈھونڈتی رہیں لیکن وہ شرم کے مارے کہیں چھپی ہوئی تھی۔

مہندی میں شاہ گل نے اس کو سونے کی انگوٹھی پہنائی، جو بعد میں مور جانے نے اس سے لے لی تھی۔ پھر اس کو وہ دکھ گئی۔ رقص کے دائرے میں۔ اس کے بعد پوری شادی میں وہ اس سے چھپتی رہی۔

شادی کے بعد جب وریمہ (دلہن کا میکے جانا اور ان کا دلہے کے گھر والوں کو دعوت دینا) ہو چکا تو وہ لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس نے بس گھر میں اتنا کہا تھا کہ وہ پڑھنے جا رہا ہے۔ اور بس۔ دل تو چاہتا تھا کہ جانے سے پہلے وہ نغمہ سے ملے لیکن نیک احمد چھٹی پر گھر آیا تھا۔ اس لیے اس نے مناسب نہ سمجھا اس سے چھپ کر ملنا......!

☆☆☆

لاہور اس کے لیے نیا تھا۔ یوں وہ یہاں اسلام پورہ، مقصود صاحب کے ایک جاننے والے کے گھر میں پے انگ گیسٹ کے طور پر رہتا تھا۔ ان کا گھر پرانے طرز کا تھا۔

صبح ہوتی تو نیچے اس کے جاگ جانے کے بعد کہیں شور اٹھتا۔ دروازہ کھٹکھٹاتا دودھ والا، باہر گلی کے چوبارے پر بنی چوہدری صدام کی دہی کی دکان پر رش۔ اس کے لیے یہ سب نیا تھا۔ وہ پشاور کے ایک گاؤں کا رہنے والا، زندہ دلوں کے شہر لاہور میں آنکھیں کھول رہا تھا۔

جب وہ این سی اے پہنچا تو این سی اے کے ماتھے پر ستمبر کے سورج کی روشنیاں پڑ رہی تھیں۔

ستمبر کی دھوپ میں تھوڑی بہت حدت تھی اور این سی اے کے اس پرانے عمارت کی بنیادوں میں وقت کی یادیں دفن تھیں۔ اس نے سوچا تھا کہ لاہور میں کتنے تاریخی عمارات ہیں، اس کو تو میوزیم میں سجا کر رکھنا چاہیے۔ پھر خود ہی اپنی بات پر ہنس کر کے کالج کا مین گیٹ کراس کر کے اندر داخل ہو گیا۔

کالج میں داخل ہوتے ہوئے، اس کی نظروں میں حیرت، خوشی، ستائش اور جوش کے کئی رنگ تھے۔ وہ پورا کالج گھوم رہا تھا۔ سر اٹھائے، سر گھماتے، رک کر ٹھٹک کر۔ جھولے پر بیٹھا بوسہ دیتے کپل کا مجسمہ، آرکیٹکچر ڈیپارٹمنٹ میں گول دائرے میں کے خم کھا کر کھڑا david کا مجسمہ، محرابی رنگین کھڑکیاں، پرانے سرخ اینٹوں سے چنی دیواریں، بوڑھے چھتنار درخت، دو رخ میں بٹی سیڑھیاں......

اس کے لیے یہ حیرت کدہ تھا، اس کے خوابوں کی دنیا...... بچپن سے اس نے اپنے اندر کے شوق کو دفنائے رکھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ شاید اس کی یہ شوق دفن ہو کر مٹی ہو جائے گا لیکن وہ بھول چکا تھا کہ شوق جب دفنا دیا جائے تو وہ مٹی نہیں بنتا...... وہ جوالا مکھی (آتش فشاں) بن جاتا ہے...... جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔

اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا، اس میں انگارے نہیں تھے...... گارا تھا...... تازہ، خوشبودار گارا...... اس نے اپنے ہاتھوں کو سونگھا اور ایک تسکین اس کی روح کو پہنچی، سامنے اسٹول پر اس کی تخلیق کی پہلی صورت بن رہی تھی۔

☆☆☆

سلطانہ آدے کا انتقال ہو گیا۔ وہ ان کا رسم قل ادا کر کے، وہ ایک ہفتے وہاں گزار کر واپس لاہور جا رہا تھا۔ آتے وقت وہ بڑے قبرستان میں آدے کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گیا تو آنسوؤں کے جھرنوں کو وہ روک نہ پایا تھا۔ جب جب وہ کسی مشکل میں ہوتا، مور جانے سے پہلے وہ آدے کے مہربان گود میں سکون ڈھونڈتا تھا...... وہ اس کی ڈھال تھیں، ہر کسی سے اس کو بچاتیں۔ لوگوں کی زبانوں پر ان کے کردار کے لیے اچھے الفاظ نہ تھے، لیکن جاتے وقت سب کو رلا کر گئیں

لاہور پہنچ کر اس کی حالت بدل گئی تھی اور یہ اس کی کلاس فیلوز نے بھی نوٹ کیا تھا کہ اب وہ خاموش رہنے لگا ہے پھر اس نے اپنی ساری توجہ اپنے کام میں لگادی۔ اس کی پینٹنگ اور مجسموں کی تعریفیں تعریف بھی ہوتی...... کیونکہ وہ اپنی جڑیں نہیں بھولا تھا' وہ ہمیشہ اپنے علاقے' اپنے رسم ورواج' اپنی ثقافت سے انسپائریشن لیتا تھا......

اس کا پہلا باقاعدہ مجسمہ' جو ڈسپلے ہوا تھا وہ "میمو تئے" کا تھا۔ پشتو کے ایک لوک داستان کا مرکزی کردار' جس کو اس کے شوہر نے اس غیرت کے نام پر ذبح کیا تھا۔ اس نے اس مجسمے کا نام "میمو تئے" ہی رہنے دیا...... زمین پر اوندھی لیٹی ایک لڑکی' جس کے سر پر دوپٹا تھا اور ایک لٹ اس کی آنکھوں پر سایہ فگن تھی۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو کی لکیر اس کے چہرے پر بہہ رہی تھی۔

ڈسپلے میں اس کے مجسمے کی کافی تعریفیں ہوئیں' لوگ تجسس کے مارے اس مجسمے کے سامنے کھڑے ہوتے تو کہانی سننے کی فرمائش کرتے اور پوری کہانی جان کر ان کا دل بنا روح کے مجسمے کے لیے دکھ سے بھر جاتا اور مجسمہ ساز کے لیے ستائش سے......!!

وہ بہت خوش تھا' اس کے فن میں نکھار بھی آیا اور انفرادیت بھی...... لیکن اس کو یہ نہیں پتا تھا کہ کل صبح اس کے مجسمے کے سامنے کوئی کھڑا اس کو شعلہ بار نظروں سے دیکھ رہا ہوگا...... اس شخص کی نظروں میں نفرت تھی' اس کے لیے...... اس مجسمے کے لیے......

"یہ آپ کے خان صاحب کا فن پارہ ہے' اور بھی ہیں کمال کے مجسمے۔ آپ دیکھنا چاہیں گے؟" اس شخص کو زرک کا کلاس فیلو خیام بہت جوش وخروش سے بتا رہا تھا۔

"نہیں...... مجھے اس "صنم تراش" سے ملنا ہے......"

نیک احمد نے گردن گھما کر خیام کو دیکھا تو اس کے مسکراتے ہونٹ سکڑ گئے۔ مہمان کے چہرے پر از حد کرختگی تھی۔

☆☆☆

رات کی تاریکیاں چہار سو پھیلی تھی۔ رستم خان کے کمرے کے اندر ہجوم اکٹھا تھا۔ فاطمہ (عباس کی بیوی) کے ہاتھ میں ٹرے قہوے کے فنجانوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی' اندر جمع لوگوں میں ایک ایک کے سامنے رک کر قہوہ پیش کیا...... رستم خان نے اس کو سر ہلا کر انکار کیا تھا۔

"نسوار می واچول (نسوار ڈال لیا ہے)......" ان کے چہرے پر گمبھیر سنجیدگی تھی۔

یہ سب آج ایک اہم فیصلے کے لیے جمع تھے۔ مور جانہ کی طبیعت آج کل کافی خراب رہنے لگی تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ انہیں یرقان ہے' تب سے انہوں نے یہ ضد لگائی تھی کہ ان کی زندگی اور موت کا کوئی بھروسا نہیں' وہ اپنی زندگی میں زرک کی شادی ہوتی دیکھنا چاہتی ہیں۔!

"ان کو تھوڑا وقت دیتے ہیں ناں......" عباس لالہ نے کہا تھا۔ "ایک تو اچانک شادی...... اور......"

"نہیں بیٹا...... ہماری فکر مت کرو' ہماری طرف سے ساری تیاریاں مکمل ہے۔ اکلوتی بیٹی ہے میری' بچپن سے اس کا جہیز بنا رہی ہوں......" اپنی آخری بات پر خود ہی شاہ گل ہنس پڑیں۔

"بس ہماری بھی تیاریاں مکمل ہی سمجھو' زیور میں کب کا بنا چکی ہوں اور باقی کام تو ویسے بھی شادی کے دنوں کے ہی کرنے کے ہوتے ہیں۔" مور جانہ کے زرد چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ان کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ان میں بہت توانائی آچکی ہو۔

"تو ٹھیک ہے' کل ماشاءاللہ سے نیک احمد رائیونڈ اجتماع کے لیے جا رہا ہے۔ آتے وقت زرک سے بھی اس کے کالج میں مل لے گا...... کہ ہم نے عید (تاریخ) رکھ دیا ہے......" حبیب الرحمن کے لہجے میں اب نیک احمد کے لیے فخر ہی فخر سا تھا۔ نیک احمد نے میاں صاحب کے مدرسے سے حفظ کیا تھا۔ اسی وجہ سے اس کی کافی سنی جاتی تھی۔ پانچ وقت کا نمازی'

تبلیغی اور حافظ۔

اگلے دن یہ خبر پورے خاندان میں آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ زرک کی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی ہے۔ جو لوگ اس کو افواہ سمجھ رہے تھے انہوں نے دیکھا کہ ان کے گھر سارے مرد اکٹھے ہو کے لکڑیاں کاٹ رہے تھے تو انہیں یقین ہو گیا۔ چارسدہ سے برکت ماماجی بھی آ چکے تھے۔ وہ ویسے بھی اکیلے تھے ان کا مہینہ اپنے گھر گزارنا یا یہاں گزارنا ایک ہی برابر تھا۔

نیک احمد رائیونڈ سے واپس آیا تو اس کا چہرہ بدل چکا تھا۔ چہرے اور آنکھوں سے کرختگی جھلکتی تھی۔ گھر آنے کے بعد اتنے لمبے سفر کرنے کے باوجود وہ سیدھا مسجد گیا تھا۔ اس کو امام صاحب سے ملنا تھا۔

مسجد کے ایک کونے میں امام صاحب کے لیے ایک کمرا مختص تھا۔ چھوٹا سا کمرا جس میں ایک بڑی الماری کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس وقت کمرے میں کافی بھیڑ تھی۔ محلے کے بزرگ لوگ اور باچا خان کی تقریباً ساری اولاد جمع تھی۔ امام مسجد ایک اہم موضوع پر بات کر رہے تھے...... صنم تراشی پر اور صنم تراش پر...... یعنی زرک خان......

رات کو حبیب الرحمٰن کا چہرہ غصے سے سرخ تھا۔ ایک طرف کونے میں دوپٹے کا کونا مروڑ کر کھڑی نغمہ اور سر پکڑے شاہ گل بیٹھی تھیں اور دوسری طرف نیک احمد...... جس کی آنکھوں میں کرختگی تھی۔

''ہم اب اس صنم تراش کو اپنی نیک بہن کا ہاتھ دیں گے؟'' اس کا لہجہ اکساتا ہوا تھا۔

حبیب الرحمٰن نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کھڑکی کے پٹوں سے ہوائیں ٹکرا رہی تھیں۔ نغمہ کے چہرے پر سے پلو گرا اور آنکھوں میں وحشت اتری۔ اس کی آنکھوں میں اس کے بت توڑنے کے ارادے آگ پکڑ رہے تھے......

سہ پہر کے بعد رستم خان کے صحن میں چارپائیاں ہنوز اپنی جگہ پر تھیں۔ پھر سے صحن دونوں گھرانوں کے تمام افراد سے بھرا ہوا تھا۔ غصے سے پاگل ہوتے رستم خان، وحشت زدہ مور جانہ، نفرت آنکھوں میں سموئے نیک احمد اور چپ سی نغمہ ......بس اس انسان کی کمی تھی، جو ابھی دروازہ کھول کر مسکراتا آرہا تھا معاً اس کی مسکراہٹ سمٹی......

☆☆☆

لاہور سے آتے ہوئے زرک کے چہرے پر ایک مستقل مسکراہٹ تھی۔ اس کی آنکھوں نغمہ کا سراپا تھا۔ سرخ گوٹا کناری لگے دوپٹے میں مڑ کر دیکھتی نغمہ جس کے چہرے پر ایک لٹ گر آئی ہے...... اور وہ فوراً اس کو کانوں کے پیچھے اڑس دیتی ہے۔

جب وہ گھر پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ صحن میں سب موجود تھے۔ اس کے چہرے پر سے مسکراہٹ سمٹی اور آگے بڑھ کر اس نے سلام کرنا چاہا...... لیکن کسی نے بھی اس کے سلام کا جواب نہیں دیا ...... زرک نے جواب چاہتی نظروں سے مور جانے کو دیکھا اور ان کا زرد چہرہ مزید زرد پڑ رہا تھا۔ سفید لیس والے دوپٹے کا پلو مروڑ کر منہ پر رکھے وہ اپنی سسکیاں دبا رہی تھیں۔ پھر زرک کی نظریں نغمہ پر پڑیں...... اس نے فوراً نظریں چرائی تھیں۔ معاً داجی آگے بڑھے......

آنکھوں میں انگارے تھے اور الفاظ انہی انگاروں میں دہکتے ہوئے......

''تم لاہور میں کیا کرتے تھے؟''

اس نے جواب دینے سے پہلے مڑ کر نیک احمد کو دیکھا، جو اپنی ڈاڑھی میں انگلیاں پھیرتا اس کو نفرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کو نیک احمد اور اپنی ملاقات یاد آئی اور وہ بھول گیا تھا کہ پچھلی بار بھی اس کی اسکیچنگ کو سب کے سامنے لانے والا وہی تو تھا...... تو وہ یقیناً بتا چکا تھا سب کو......

''میں وہاں مصوری سیکھنے گیا تھا۔'' اس نے سنبھل کر جواب دیا۔

''مصوری؟'' اس کے جواب پر نیک احمد نے طنزیہ ہنسی ہنس کر پوچھا تھا۔ ''مصوری ...... یا صنم تر

اشی؟"

"ہاں...... مصوری...... اور مجسمہ سازی سیکھنے......" اس نیک احمد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

اسی وقت ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے چہرے پر پڑا اور اس تھپڑ کی تقلید میں دو اور تھپڑ بھی پڑے۔ مور جانہ، عباس لالہ اور برکت ماما فوراً ایک ساتھ اٹھے۔ برکت ماما باپ بیٹے کے درمیان کھڑے ہوئے۔

"داسہ کوے رستمہ (یہ کیا کر رہے ہو رستم)...... جوان جہاں بیٹے پر ہاتھ اٹھا رہے ہو۔"

"ہاں...... اٹھا رہا ہوں۔ کیسے ڈھیٹ پن سے یہ کہہ رہا ہے کہ یہ بت تراشتا تھا اب تک...... تین سال...... تین سال اس نے کتنے بت تراشے ہوں گے؟ پوچھو اس سے۔ اس ملعون کی وجہ سے اس گھر پر عذاب اترا ہے۔ پہلے سلطانہ آدے مریں، پھر اس کی ماں بیمار ہو بیٹھی، طلعت کا بیٹا مرا، پورا ایک کھیت جل گیا...... ہر طرف سے عذاب نازل ہو رہے ہیں...... لوگ کہتے تھے کہ یہ کسی نے جادو کیا ہے لیکن انہیں یہ نہیں پتا تھا...... ہمیں یہ نہیں پتا تھا کہ یہ ہمارے صنم تراش بیٹے کے گناہوں کی سزا ہے۔"

رستم خان اتنی تیز آواز میں بول رہے تھے کہ ان کے گلے کی رگیں نیلی پڑتے ہوئے ابھری ہوئی تھیں...... ان کی آواز آخر میں پھٹ سی گئی...... ان کی چنگھاڑتی آواز پر دیوار پر سے پڑوسی بھی جھانکنے لگے۔

"خدا میرے گناہوں کی سزا کسی بے گناہ کو کیوں دیں گے؟" زرک کا دائیں گال سرخ اور جل رہا تھا۔ وہ بولا تو اس کی آواز میں اہانت کی کرچیاں تھیں اور غصہ کی لے میں بہتی آواز میں اپنے لیے احتجاج سا تھا۔

"کیوں نہیں دیں گے۔ ہر قوم پر سزا اس قوم کے گناہوں......"

اس نے غصے سے اپنے باپ کی بات کاٹی تھی۔

"وہ اجتماعی گناہ ہوتے تھے...... اور میں نے کیا برا کیا ہے؟ یہ نئے زمانے کے فن ہیں۔ آرٹ کہتے ہیں اس کو۔ زمانہ قدیم سے چلے آ رہے ہیں۔ میں مجسمہ بناتا ہوں...... اس کو پوجتا نہیں ہوں......"

"پوجتے بھی ہو گے...... یہ خدائی وصف ہے۔ اسلام میں اس کی سخت ممانعت ہے۔ تم اب اسلامی تعلیمات کے خلاف کھڑے ہو گے؟" نیک احمد بھی تیزی سے اٹھا اور اونچی آواز میں غصے سے بولا۔

"نہیں...... میں پوجتا نہیں...... میں اس کو فن کے طور پر بناتا ہوں۔ میوزیمز میں رکھے جاتے ہیں، چوکوں پر...... یہ زمانے گزر جانے کے بعد تاریخی بن جایا کرتے ہیں......" اس نے دلیل دینی چاہی، لیکن فوراً اس کو اندازہ ہوا کہ اس کی دلیل نہ تو ٹھوس تھی اور نہ ہی وہ قائل ہوئے تھے۔

"تم اس کو چھوڑ دو...... بس! اللہ سے رجوع کرو...... اپنی معافی کے لیے...... اپنے گناہوں کے لیے......" رستم خان نے ایسے انداز میں کہا کہ جیسے وہ مزید اس کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

وہ کچھ دیر کے لیے خاموش رہا، جب بولا تو اس کی آواز میں قطعیت تھی۔

"میں یہ نہیں چھوڑ سکتا۔"

اس کی بات پر رستم خان مڑے۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ آج کے بعد نہ میرا تم سے کوئی تعلق ہے اور۔ میرے خاندان میں سے کسی کا...... اگر کسی نے تم سے رابطہ کیا یا بات کی تو اس سے بھی میرا کوئی تعلق نہیں......" پھر وہ مور جانہ کی طرف مڑے جو تڑپنے لگی تھیں۔ "تم بھی...... تم بھی اگر اس سے تعلق رکھو گی تو اسی وقت میں تمہیں طلاق دے دوں گا...... پھر اس سفید سر کے ساتھ طلاق یافتہ کا اعزاز سینے سے لگائے پھرنا...... اپنے اس بت تراش، ملعون بیٹے کے ساتھ......"

مور جانہ رونے لگیں۔ وہ مڑیں اور زرک خان کے پاس جانے لگی۔

"چھوڑ دو زرک جانہ! خیر دے زما دہ پارہ (خیر ہے میرے لیے)"

"کیوں چھوڑوں میں؟ یہ میرا جنون ہے ...... شوق ہے ...... میں اس کے آگے مجبور ہوں ...... لوگ گانے گاتے ہیں، سنتے ہیں۔ اس کو آرٹ کہتا ہے آج کا زمانہ......" وہ روہانسا ہوا تھا۔ اپنے باپ کے سامنے اس کا غصہ دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ ساری عمر ان کی محبت بھری ایک پکار کے لیے وہ ترستا رہا اور اب وہ کتنی آسانی سے اس سے لاتعلقی کا اعلان کر چکے تھے......" میں یہ نہیں چھوڑ سکتا، خیر وہ داجی...... آپ ایسے میرے ساتھ تعلق ختم نہیں کر سکتے......"

"میں کر چکا ہوں ......" لاتعلقی کی پہلی سرد مہری ان کی آواز میں دھر آئی۔ "میں اس گھر میں بت تراش نہیں رہنے دوں گا۔ تمہارے اس میلے میں جا کر میں ابراہیم علیہ السلام کی طرح سارے بت توڑ نہیں سکتا...... لیکن یہ لاتعلقی کر سکتا ہوں...... دل تو چاہتا ہے، کہ بڑے قبرستان میں گڑھا کھود کر تمہیں سنگسار کر کے ماردوں...... لیکن......"

"جب آپ کر چکے ہیں لاتعلقی کا اظہار تو ہم بھی اس ملعون کے ساتھ اپنی بہن کا رشتہ نہیں رکھنا چاہتے......" نیک احمد کی آواز میں نفرت بھی تھی اور حقارت بھی......

وہ کرنٹ کھا کر فوراً مڑا، اس نے نغمہ کو دیکھا اور اگلے ہی پل وہ اس کی جانب بڑھا تھا۔

"نغمہ مجھے نہیں چھوڑ سکتی ...... میں نغمہ کو نہیں چھوڑنے والا......" اس کی آواز میں قطعیت تھی۔ نغمہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے......

"یہ تم سے کوئی تعلق نہیں رکھے گی۔" نیک احمد کا انداز حتمی تھا۔ سب یک ٹک زرک اور نغمہ کو دیکھ رہے تھے۔

نغمہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ بہنے لگے۔ اس نے ملتجیانہ نگاہوں سے زرک کو دیکھ کر منت کرتے لہجے میں کہا تھا۔

"چھوڑ دو زرک...... سب کہہ رہے ہیں......"
"نہیں چھوڑ سکتا...... تم میرے ساتھ چلو......"
"زرک دیکھو...... ایسا مت کرو......"

"یہ سب نیک احمد اپنے بدلے......" اس نے کہنا چاہا لیکن نغمہ کی کاٹ دار آواز نے اس کا جملہ وہیں روکا تھا۔

"ہاں...... نیک احمد بدلے میں کر رہا ہے۔ مان لیا میں نے؟ لیکن کیا وہ جس بات پر بدلہ لے رہا ہے؟ کیا تم اس سے انکار کر سکتے ہو؟ بولو تم کہہ دو کہ ہاں میں نہیں تراشتا بت...... ہر بار تم ٹھیک نہیں ہوتے زرک، اس بھرم سے نکل آؤ......" نغمہ نے پھر رک کر سب کو دیکھا...... اپنے بھائیوں کو، اپنے باپ کو...... اور فیصلہ اس کے سامنے تھا۔ صاف اور اٹل۔ "تم اس کو نہیں چھوڑ سکتے...... تو مجھے چھوڑ دو...... میں تمہیں چھوڑ رہی ہوں...... میں تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔"

"نہیں، تم ایسا نہیں کر سکتیں، نغمہ تم تو مجھ سے محبت کرتی ہو ناں؟" وہ پاگل سا ہونے لگا۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں نغمہ!" وہ رونے لگا تھا۔ پھر مڑا۔ "داجی...... آپ......"

اسی وقت نیک احمد نے اس کو بازو سے پکڑ کر دھکیلا۔ وہ لڑکھڑایا تھا۔ برکت ماما جی فوراً آگے بڑھے۔ "حد میں رہو نیک احمد!" پھر زرک سے مخاطب ہوئے، "اٹھو میرے ساتھ چلو......"

"اس کو لے جا رہے ہو، پھر بھی لوٹ کر مت آنا برکت!" رستم خان کی خبردار کرتی آواز......

"مجھ سے کوئی تعلق مت رکھو تم...... کوئی شوق نہیں مجھے بھی تم سے تعلق رکھنے میں...... تم نے اس کو بیٹا ماننے سے انکار کر دیا ہے، آج سے یہ میرا بیٹا ہے۔" برکت ماما کی آواز میں ان کے لیے نفرت تھی۔

☆☆☆

بیہ کڈے بار گی
(پھر ہجرت کا ساماں باندھا جا رہا ہے)
پاڑی واچول اوخانوں کی
(اونٹوں میں رسیاں ڈال دیے ہیں)
سہ اوکمہ خدایا
(کیا کروں خدایا)
زڑہ میں بندی پہ کوچیانوں کی......

(دل بند ہے کوچیان میں)

صحن خالی ہو چکا تھا اور برآمدے میں برکت ماما اس کا اور اپنا سامان باندھ رہے تھے۔

بیہ کڈے تاڑ لے شی

(پھر ہجرت کا سامان باندھا جارہا)

راتہ خکاری چہ بلسند تہ زی......

(ایسا لگ رہا ہے کہ بلسند جارہے ہیں)

نیک احمد' داجی' شاہ گل اور باقی سب برآمدے کی چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ سب کے چہرے سپاٹ تھے۔ صحن میں نغمہ کے قدم تھمے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں بہہ رہے تھے۔

اس کی نظروں میں ایک منظر تھا۔ کسی کی شادی کا۔ اس کی پڑوسن نیک احمد کے چرس والے واقعے پر اپنی سہیلی کے کان میں گھسی نیک احمد کے بارے میں پوچھ رہی۔

''نیک احمد کیا چرسی ہے؟''

وہ مڑی اور اس کے عین سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ''اور اپنے چرسی باپ کے بارے میں کیا کہنا ہے؟ جو عنقریب تمہیں صنم خان کو بیچنے والا ہے؟''

''ہیں؟ دماغ خراب ہو چکا ہے کیا نغمے تمہارا؟'' لڑکی غصہ ہوئی۔

''ہاں ہوا ہے میرا دماغ خراب......اور جب میرا دماغ خراب ہوتا ہے میں لوگوں کے چہرے خراب کر دیتی ہوں۔ اگلی دفعہ میری بھائیوں کے بارے میں ایسی ویسی باتیں کیں تو میں بھی نادان بابا (نہر کا نام) کے پل کے نیچے تمہاری اور گلزار کی ''ملاقاتوں کے قصے'' مشہور کردوں گی......'' یہ کہہ کر وہ تن فن کرکے جانے لگی۔ اس لڑکی کی سہیلی اس کو سمجھا رہی تھی۔

''نغمہ بھائیوں کے خلاف باتیں برداشت نہیں کرتی۔''

خوگ آشنا نہ دے بل وطن تہ زی

(پیار جانان دوسرے وطن جارہا ہے)

زہ یی پرے بخو دم دلتہ

(مجھے چھوڑ دیا یہاں)

زڑہ یی اوڑو پہ چشمانوں کی

(دل لے گیا اپنی آنکھوں میں)

بیہ کڈے بار یگی

برآمدے میں مور جانے کی رونے کی آواز میں تیزی در آئی جب زرک نے دہلیز پار کی۔ سامنے گاڑی کھڑی تھی اور دور بجلی کے تاروں میں پھنسے اس گلی کے اکلوتی لائٹ کی زرد روشنیوں کے سامنے کئی پتنگے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ وہ گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی روانہ ہوئی۔

اس نے گاڑی کے شیشے سے سر لگایا۔ اس کی آنکھیں بجھی ہوئی تھیں اور آنسو سوکھ چکے تھے......وہ مجنونیت کے پہلی سیڑھی پر قدم دھر چکا تھا۔

بس کہ ستم گرے

(بس کرو ستم گر)

داسی مہ کوہ آشنا نہ سرہ

(ایسا مت کرو اپنے جانان کے ساتھ)

سور رومال می ستہ دے

(سرخ رومال تمہارا ہے)

دغہ جبہ می دہ تہ سرہ

(یہی زبان دی ہے تمہیں)

سر کا می خو سیلی......

(اگر سر بھی زخمی ہو)

''نغمے! اوپر آؤ......'' شاہ گل نے اس کو پکارا لیکن نغمہ کے کانوں میں کئی آوازیں تھیں۔

''نغمہ! تم بہت جلد پچھتاؤ گی ہو۔'' زرک کی آواز کسی ضرب کی طرح پڑ رہی تھی اور معاً اس کے دل میں ٹیس اٹھی۔ وہ مڑی۔ نیک احمد اس کی اور بھاگا اور اس کو بازو سے پکڑا۔

''وہ جارہا ہے...... مجھے جانے دو......'' اس کی آواز میں التجا بھی تھی اور چیخ بھی......

''جانے دو۔''

''وہ میرے بغیر مر جائے گا......'' اس بار بار تیز آواز میں رونے لگی۔

''مرنے دو۔''

"میں اس کے بغیر مر جاؤں گی......" اب کی بار وہ نہیں روئی تھی...... یوں جیسے اس نے موت دیکھ لی اور مر گئی...... ایک تھپڑ اس کے چہرے پر پڑا۔

"بے حیا! اس دہلیز سے تم صرف میت کی صورت ہی نکل سکتی ہو۔"

نیک احمد نے اس کو بازو سے پکڑ کر کھینچا تھا۔ اس نے زور سے اس سے بازو چھڑوایا اور اوپر کی جانب بھاگی...... سب اس کے پیچھے بھاگے...... جب وہ پہنچے تو نغمہ چار دیواری سے جھانک رہی تھی۔ یوں جیسے کوئی اس کی روح ضبط کر چکا تھا' اس کی آنکھیں ایسی پھیلی تھیں۔...... دور گلی کے نکڑ میں گاڑی نے چکر کاٹا تھا۔

زہ بہ نہ شم د بل چہ سرہ

(میں کسی اور کا نہیں ہو جاؤں گا)

سنگہ بہ تہ سترگے غاڑوے بہ آشنایانوں کی

(تم کیسے کھولو گے اپنی آنکھیں نئے آشناؤں میں)

بیہ کڈے باریگی......

☆☆☆

اس کی حالت بہت خراب تھی۔ جب سے وہ چارسدہ آیا تھا اس کو تیز بخار تھا۔ ساری رات وہ بخار میں تپتا رہا۔ برکت ماما ساری رات جاگتے رہے۔ ان کا دل اس کے لیے دکھ سے بھر چکا تھا۔ ان کی اپنی اولاد نہ تھی' لیکن وہ اپنی بہن کا درد اس سے سمجھ رہے تھے۔

بچوں کو سمجھانے کی کئی زبانیں ہوتی ہیں...... لیکن یہاں 'مار' کی زبان بہت کارگر سمجھی جاتی ہے۔ اس سے بچے یا تو خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں یا پھر باغی ہو کر مزید اس آگ میں کود جاتے ہیں۔

صبح کی روشنی جب اس کی آنکھوں کے پپوٹوں پر دستک دینے لگی تو وہ تڑپ رہا تھا۔ یوں جیسے کسی نے اس کے وجود کو شکنجے میں جکڑ رکھا ہو...... سختی سے کس کر...... وہ ہل نہیں پا رہا تھا۔ اس کے حلق میں کانٹے اگ آئے تھے وہ بس دو جملے دہرا رہا تھا۔

"تم تو مجھ سے محبت کرتی ہو' ناں؟"

"میں تم سے محبت کرتا ہوں' نغمہ!"

معاً وہ تڑپ کر اٹھا تو اس کے سامنے ایک جانا پہچانا چہرہ تھا۔ اس کے ہم عمر لڑکے کا۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا لیکن وہ سن نہیں پا رہا تھا۔ اس کے کانوں میں وہی دو جملے تھے جو بار بار گونج رہے تھے اور اس پر غالب ہوتی رستم خان کی چنگھاڑتی آواز...... "میرا اس سے کوئی تعلق نہیں......"۔

"زرک بچے! یہ دوائی کھا لو۔" برکت ماما اس کو بازو سے ہلا کر اس کو دوائی کے ساتھ پانی دے رہے تھے۔ یہ پہلا جملہ تھا جو اس نے ان دو دنوں میں سنا تھا۔ برکت ماما زبردستی اس کو دوائی پلا کر چلے گئے۔

قاسم دیر تک اس کے ساتھ بیٹھا رہا۔ اس کو ماما نے بھیجا تھا کہ اس کے ساتھ باتیں کرے۔ تاکہ اس کا دماغ انہی سوچوں کے گرد نہ گھومے لیکن ان کو نہیں پتا تھا وہ اس میں کامیاب نہیں ہونے والے تھے کیونکہ یاتونی قاسم کے منہ سے نکلا تھا اور فوراً اس کو اپنی سنگین غلطی کا احساس ہوا تھا۔

"صاحبزادہ خان کے بیٹے سے نغمہ کی شادی ہو گئی......"

☆☆☆

"ادھر آؤ...... ان کیسٹس میں سردار علی ٹکر کے سارے کیسٹس علیحدہ کر کے ایک طرف رکھ دو۔" وہ کھڑکی میں بیٹھا' آسمان کو تک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں تلے حلقے اتنے گہرے ہو چکے تھے کہ یوں لگتا تھا کہ کسی نے سیاہی مل دی ہو۔ وہ چپ چاپ اٹھا اور ٹیپ ریکارڈ میں ایک ایک کیسٹ لگا کر تھوڑی دیر سنتا اور پھر ایک طرف کر دیتا...... اس کام میں اس نے کئی گھنٹے صرف کیے......

برکت ماما اس کے دھیان بٹانے کے لیے ایسا کرتے تھے کہ اس کو کسی کام میں لگا دیتے اور وہ اسی میں مصروف رہتا۔ کبھی اپنے ساتھ کیاریوں میں لگا دیتے...... سارا دن وہ دونوں ٹماٹر کی کیاریوں میں لگے رہتے...... کبھی وہ باورچی خانے اپنے ساتھ کھڑا

کرتے اور اس کو کھانا پکانا سکھاتے رہتے......
"ہم مشرقی مرد کھانے کے لیے بہت عورتوں پر منحصر ہوتے ہیں...... حالانکہ یہ بہت آسان لیکن دل سے کرنے والا کام ہے...... بس دیکھو مجھے...... پیاز کاٹو' ٹماٹر کاٹو...... اور......" برکت ماما جی ایک ایک چیز یں کاٹتے اور پکانے کے ہر مرحلے کے بارے میں تفصیل سے بتاتے جا رہے تھے۔
"کھانا پکانے سے مرد عورت نہیں بن جاتے...... اگر ایک دن تمہاری بیوی بیمار پڑ جائے تو تم بنا لینا اس کی جگہ......" برکت ماما جی اپنے ہی دھن میں کہہ رہے تھے کہ ایسے میں وہ رکے...... انہیں اندازہ بھی نہیں ہوا کہ بولتے بولتے وہ زرک کی دکھتی رگ چھیڑ چکے تھے۔
وہ فوراً باہر نکلا اور برکت ماما جی نے تاسف سے اس کو دیکھا۔
اس کے بعد برکت ماما کافی احتیاط برتنے لگے تھے۔ وہ اس کی صحت کا خیال رکھتے' لیکن اس دوران وہ اپنی صحت بھول سے چکے تھے۔ بہار کے اوائل کے دنوں میں ان کی زندگی پر خزاں کا موسم مسلط ہو گیا۔ ایک دن ان کو ہارٹ اٹیک آیا۔ ڈاکٹرز نے آپریشن کرنے کا کہا اور برکت ماما نے منع کر دیا۔
"ویسے بھی اتنا کم وقت بچا ہے...... میں اپنے جسم کو تار تار نہیں کرنا چاہتا......" ان کے انداز میں دکھ نہیں تھا' ایک عجیب قسم کا سپاٹ پن تھا۔ اس نے خوب سنایا لیکن وہ اپنی ضد پر ڈٹے رہے۔
ان دنوں ان کے گھر ایک وکیل کافی آتا جاتا رہتا۔ انہوں نے اتمان زئی بازار میں چار دکانیں' اپنا گھر اور اپنے حصے کے کھیت سب اس کے نام کر دیے تھے۔
"اللہ سے شکوہ تھا کہ ایک تو بے اولاد بنایا مجھے' پھر محبوبہ جیسی بیوی بھی چھین لی...... لیکن اب دونوں شکوے نہیں رہے۔ تمہاری صورت اولاد بھی مل گئی' اور محبوبہ جیسی بیوی سے ملنے بھی جا رہا ہوں......"
آخری بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسے لیکن وہ ہنسا نہیں

...... دکھ بھری نظروں سے ان کو دیکھتا رہا......
اس کی زندگی میں اس سے پیار کرنے والے ایک ایک کر کے سب فوراً جا رہے تھے۔ وہ اکیلا ہو چکا تھا۔

☆☆☆

برکت ماما کے جنازے پر صرف عباس لالہ اور مور جانہ آئی تھیں۔ تین دن ٹھہر کر جب وہ جانے لگیں تو اس سے مل کر رو پڑیں...... اس کے گال چومتے ہوئے مور جانہ روتے ہوئے گویا ہوئیں۔
"بس کر دو...... آ جاؤ! خدمت کرو......"
وہ سر نفی میں ہلاتا رہا...... آنسو کی ایک لکیر اس کے چہرے پر بہہ رہی تھی۔ آج مور جانہ اس کو یہ بھی نہیں کہہ رہی تھیں جب وہ بچپن میں رویا کرتا تھا کہ بس کر دو' مرد نہیں روتے......!
مور جانہ چلی گئیں اور وہ اکیلا رہ گیا۔ اس کی سوچیں اب مزید خطرناک ہونے لگی تھیں۔ اس نے گھر کے پچھواڑے میں بنے اس اسٹور کو خالی کیا۔ اور قاسم کے ساتھ اسکلپچر کا سارا سامان لا کر یہاں اسٹوڈیو بنایا۔ جس کے لیے وہ دھتکارا گیا تھا' وہ اب اس کو کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں رعشہ بھی ہوتا لیکن جب وہ ہاتھ گارے سے گندے ہو جاتے تو وہ پھر رکتا نہیں...... گھنٹوں گھنٹوں لگا رہتا...... مجسمہ پر کام کرتا' اس کی کمر اکڑ جاتی لیکن وہ رکتا نہیں تھا......
اس سارے عمل کے دوران اس کی حالت مزید بگڑتی جا رہی تھیں۔ یادیں کسی سلو پوائزن کی طرح اس کی نس نس میں سرایت کر رہی تھیں۔ اس کے ذہن کی جڑیں بنجر ہو رہی تھیں اور دل پر بوجھ پہاڑ بنتا جا رہا تھا۔
قاسم روز آتا۔ اس کے ساتھ چائے پیتا۔ اس کو زبردستی اپنے ساتھ والی بال میچ دیکھنے لے جاتا۔ پھر قاسم نے آنا بند کیا اور اس کی حالت ایک دفعہ پھر سے بگڑنے لگی......
وہ جس سرزمیں پر قدم دھر چکا تھا' وہ قیس کی سرزمیں تھی...... مجنونیت کی......

☆☆☆

"زرک...... زرک......"

کوئی اس کو پکار رہا تھا۔ اس کے تھوڑی بڑھی ڈاڑھی پر کسی کے نرم ہاتھ جمے ہوئے تھے۔ جو آہستہ آہستہ اس کے چہرے کو تھپتھپا رہے تھے لیکن اس کی آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے پار دھند لگے تھے۔

زرمینہ اس کے گالوں پر ہاتھ رکھے اس کو ہوش میں لانے کے لیے آوازیں دے رہی تھی۔ معاً اس کی سرگوشیاں تھمی تھیں اور زرمینہ کا ہاتھ بھی...... چہرے کا رنگ فوراً متغیر ہوا اور وہ باہر کی اور بھاگی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اپنے گھر کے صحن میں پکار رہی تھی...... "قاسمہ! قاسمہ!"

اس درد بھری پکار پر پہلے بھابھی نکلیں اور پھر قاسم......

"کیا ہوا ہے زرمینے؟ یہ رنگ کیوں سفید پڑ رہا ہے تمہارا؟" رخسانہ آگے بڑھیں اور بیٹی کی متوحش آنکھوں میں جواب ڈھونڈنے لگیں۔

"قاسم! جلدی سے گاڑی کا انتظام کرو...... کسی ڈاکٹر کو بلاؤ...... وہ...... زرک بے ہوش چکا ہے زرک......" اس کی آواز رونے کی وجہ سے لکنت کا شکار ہوگئی۔ قاسم، جس کے چہرے سے اب صحت یابی جھلکتی تھی، فوراً باہر بھاگا اور اس کے پیچھے وہ......

جب گھر پہنچی تو اسٹوڈیو میں وہ ویسے بے ہوش پڑا تھا۔ آنسو کی لکیر اس کے چہرے پر اب سوکھ چکی تھی۔ ایسے میں قاسم داخل ہوا اور اس کو اٹھا کر اس کے کمرے میں لے آیا۔ اس کے بعد وہ ڈاکٹر کے پیچھے گیا اور جب ڈاکٹر آیا تو انہوں نے بس یہی بتایا۔

"ان کی صحت کا خیال رکھیں، زیادہ سے زیادہ پانی پلائیں اور...... یہ کچھ دوائیاں ہیں، اگر نیند نہیں آتی ہو تو ان کو یہ نیند کی دوائیاں دیں۔" چٹ لکھ کر قاسم کو تھمائی۔ دوسرے کمرے کی کھڑکی میں پردہ کیے کھڑی زرمینہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ ان چاہی بیوی سہی، وہ تو من چاہا محبوب تھا۔

"اور سب سے اہم بات...... انہیں کسی اچھے نفسیاتی ڈاکٹر کو دکھائیں۔" یہ کہہ ڈاکٹر چلا گیا اور اس کے پیچھے قاسم بھی۔

وہ زرک کے کمرے میں چلی آئی۔ اس نے دیکھا کہ اب ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ سکون کی نیند سو رہا ہے۔ زرد ماتھے پر اس کے بال بکھرے تھے۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔ اور اس کا ہاتھ تھاما۔ آنسو زار و قطار اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ اس کو بس اتنا پتا تھا کہ نیک احمد نے اپنی بہن کا رشتہ توڑ دیا تھا اس سے...... اور پھر رستم خان نے اس سے لاتعلقی کا اعلان کیا اور اس کے پیچھے زرک کی 'مجسمہ سازی' تھی۔

وہ جانے کتنی دیر اس کا ہاتھ تھامے بیٹھی رہی۔ اس کے انداز میں جھجک نہیں تھی اور نہ ہی اس کا خوف۔ نکاح صرف نام کا ہی سہی، وہ اس کا ہاتھ تھامنے کا حق رکھتی تھی۔ ساری رات وہ اس کے سرہانے کسی جوگن کی طرح بیٹھی رہی۔ طاق میں رکھی شمع جلتی رہی...... بالکل اس کے دل کی طرح...... موم ہوتی اور فنا ہوتی......!!

☆☆☆

اگلی صبح روشن تھی اور اس کے ماتھے پر بوسہ دیتی مزید چمک رہی تھی۔ اس کے گردن میں ایک ٹیس اٹھی اور اس نے گردن پر ہاتھ رکھ کر سر اٹھایا تو وہ ہنوز سو رہا تھا۔ زرمینہ اس کی چارپائی کے ساتھ کرسی لگائے اسی پر سوئی تھی۔ وہ فوراً باہر نکلی اس سے پہلے کہ اس کی آنکھیں کھل جائیں۔

اس نے چائے کے لیے پانی چڑھایا اور دیسی گھی میں پراٹھے بنانے شروع کیے۔ جب وہ اس کے کمرے گئی تو وہ اٹھ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہی اداسی اور یاسیت تھی۔

"آپ کل کچھ زیادہ ہی سو گئے تھے۔" وہ چائے رکھتی اس کو مسکرا کر کہہ رہی تھی۔ اب وہ اس کی نظر اندازی پر آنسو نہیں بہانے والی تھی۔

"میرا کام رہ......" وہ اٹھنے لگا تھا۔

زرمینہ فوراً اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ "پہلے چائے پئیں۔ آپ ویسے بھی کچھ زیادہ ہی کام کر چکے ہیں۔"

دونوں کی نظریں ملیں۔ زرک نے دیکھا کہ وہ

نیلی آنکھیں پہلی بار اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔ وہ بے باک آنکھیں......اس نے نظریں موڑیں اور سر جھٹکا تھا۔

"میں تم سے کہہ چکا ہوں۔ ہم ایک دوسرے پر اپنی رائے، اپنے فیصلے کچھ مسلط نہیں کریں گے۔"

"یہ نہ تو رائے ہے نہ کوئی فیصلہ......بس ایک پیالی چائے ہے اور دو پراٹھے......" اس نے مسکرا کر دوبدو جواب دیا تھا۔

اس بار زرک کو چپ ہونا پڑا۔

"غسل خانے میں آپ کے کپڑے رکھ دیے ہیں۔ نہا لیجیے۔" اتنا کہہ کر وہ باہر نکلی۔ جیسے ہی باہر نکلی تو اس کا دل انتہائی دھک دھک کر رہا تھا۔ اس نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا اور اپنی واری جانی نظروں میں کوئی منافقت بھی شامل نہ کر پائی ......اس کی محبت بغاوت پر اتر چکی تھی......

☆☆☆

اس کے بعد کچھ دن زرک اپنے اسٹوڈیو نہیں گیا اور زرینہ نے یہ غنیمت جانا۔ وہ صبح اس کی آنکھیں کھلنے سے پہلے اس کے لیے نئے کپڑے نکال کر غسل خانے میں رکھتی۔ پھر چائے بنا کر اس کے ساتھ بیٹھ کر اس سے بے تکے سوالات پوچھتی ۔ وہ صرف 'ہاں' اور 'نہیں' میں جواب دیا کرتا لیکن وہ زرینہ کی مستقل مزاجی سے زیادہ اس کا ڈھیٹ پن تھی۔

وہ چائے پی کر باہر نکلتا تو وہ اس کے پیچھے چلی آتی۔

"ان پودوں کو کتنا عرصہ ہوا کسی نے پانی نہیں دیا۔" وہ کیاری میں لگے پودوں کو یاسیت سے دیکھتی اور کہتی۔

زرک مڑ کر پہلے کیاریوں کو دیکھتا اور پھر مڑ زرینہ کو......زرینہ ہنوز کیاریوں پر نظریں ٹکائے ہوتی۔ پھر کہہ کر وہ وہاں سے چلی جاتی اور پھر کچھ دیر بعد وہ دیکھتی کہ زرک کیاریوں میں لگا ہوتا۔ خودرو پودوں کو نکال کر اور اس کی مٹی میں کھرپی چلاتا......اس کو یہ کام کرتے کچھ دیر ہی گزری ہوتی کہ ایسے میں زرینہ اس کے ساتھ پودوں میں لگ جاتی......اور وہ پانی لا کر، نیچے جھک کر اس کو پانی پیش کرتی......زرک کی خاموش نظریں اٹھتیں لیکن زرینہ ویسے ہی پانی کا لوٹا لیے کھڑی ہوتی......زرک اپنے کیچڑ لگے ہاتھ آگے کرتا اور وہ نیچے اس کے ہاتھوں پر پانی گرانے لگتی۔ جب وہ ہاتھ دھو کر جانے لگتا تو وہ چھوٹا تولیہ اس کو پکڑاتی۔ زرک سوالیہ نظروں سے اس کو دیکھتا۔

"اب بچوں کے طرح دامن سے ہاتھ پونچھیں گے؟"

زرک اس کے مسکراہٹ دبائے چہرے کو دیکھ کر رہ جاتا۔ تولیہ پکڑ کر وہ ہاتھ پونچھتا اور اس کو پکڑا دیتا۔

جب سہ پہر کی دھوپ سمٹ کر منڈیروں پر ستانے لگتی۔ تو وہ اس سے آ کر پوچھتی۔

"کھانے میں کیا بناؤں؟"

"جو تمہاری مرضی......"

"نہیں، آپ بتائیں......" ضدی لہجہ۔

"کچھ بھی بنا لو۔"

وہ ہنوز کھڑی رہتی، تو اس بتانا پڑتا۔ جب دوپہر کا کھانا وہ بنا چکی ہوتی تو ہال میں دسترخوان سجا کر اس کو بلانے آتی۔

"کھانا تیار ہے۔"

وہ چپ چاپ کرسی پر بیٹھا کہتا۔ "مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"لیکن مجھے تو ہے۔"

"تو جا کر کھاؤ۔"

"آپ بھی آئیں۔" وہی ضدی لہجہ۔

آج اس نے زرینہ کو دیکھا تھا۔ اس کی ناک پر غصہ دھرا تھا۔ معاً وہ اٹھا، زرینہ اس کو دیکھتی رہی۔ زرینہ کے دل کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہوئیں۔ دو قدم......تین قدم ......چار قدم......اور وہ اس کے عین سامنے......

زرک کا چہرہ اب زرد نہیں تھا۔ اس کا چہرہ اب چمک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں غصے سے بھری ہوئی تھیں اور اس کی پرحدت سانسیں زرینہ کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ زرینہ جو سانسیں روکے کھڑی تھی۔ اس کو

یک ٹک دیکھ رہی تھی۔ وہ ساکت اس لیے تھی کیونکہ زرک نے اس کو دونوں بازو سے پکڑا ہوا تھا۔

"کیوں کر رہی ہوں تم یہ سب...... جان بوجھ کسی جن کی طرح میری حواسوں پر سوار ہو رہی ہو؟ مجھے کیا پہننا چاہیے' میں کیا کھانا کھانا چاہتا ہوں۔ مجھے کون سے پھول اگانے چاہییں؟ تم یہ سب کس لیے کر رہی ہو؟"

اس کی آنکھیں بھرنے لگی تھیں۔ ان آنسوؤں میں زرک کا غصیلا چہرہ ٹھہر گیا۔

"اپنے لیے!" وہ بولی تو ایک آنسو ٹپکا تھا۔ آواز میں یک طرفہ محبت کی کرچیاں تھیں۔

"اپنے لیے؟" وہ استہزائیہ ہنسا تھا۔

"آپ مجسمے کیوں بناتے ہیں نغمے کے؟ کیوں......؟ اس لیے ناں کہ آپ کو معلوم ہے یہ بات کہ اس کی محبت آپ کو پاگل کر رہی ہے۔ ہر وقت اس کے مجسمے بناتے ہو کہ مجنونیت میں بس آپ کو ایک چہرہ یاد رہتا ہے...... اس کا...... نغمہ کا......" وہ بول رہی تھی اور آنسو بہتے جا رہے تھے۔ زرک کی گرفت اس کے بازوؤں پر ڈھیلی ہو گئی۔ "میں بھی کر رہی ہوں اپنے لیے...... آپ کی قربت پانے کے لیے......"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں' کہ ہمارا رشتہ محض نکاح کے دو بول تک محدود ہے۔"

"ہاں...... بتا چکے ہو...... جیسے وہ آپ کو بتا چکی تھی...... کہ اس کا آپ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ لیکن پھر بھی آپ اس سے اتنی محبت کرتے ہو...... آپ کو اختیار ہے اس پر؟"

"میں...... اس کو...... اس......" زرک کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ "میں اس کو بھولنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس کا چہرہ میری یادداشت سے جاتا نہیں......" وہ پلٹا اور کرسی پر بیٹھا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ "میں اس کی محبت میں بہت آگے نکل آیا ہوں۔" وہ اب زرمینہ کو دیکھ رہا تھا...... یاسیت اس کی آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔

اسی وقت زرمینہ کا دل ڈوبا' یوں جیسے کسی سمندر میں غرقاب ہوا ہو۔

"مجھے لگا تھا وہ میرے لیے کھڑی ہو گی۔ وہ سب کے سامنے کہے گی کہ میں زرک کو اس کی ہر کمی' اس کے ہر گناہ کے ساتھ قبول کرتی ہوں...... میں...... مجھے لگا تھا وہ سب کے سامنے میرا ہاتھ تھامے گی......" وہ کہہ رہا تھا اور یک ٹک زرمینہ کو دیکھ رہا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کو یوں دیکھ رہے تھے' جیسے پلکیں جھپکیں تو منظر تحلیل ہو جائے گا۔

"میں ساری عمر اپنے باپ کی محبت کے لیے ترستا رہا۔ وہ باقی بیٹوں کو چاہتے تھے لیکن ان کی زبان پر کبھی میرا نام نہیں آیا...... کبھی انہوں نے پیار سے مجھے بیٹا نہیں کہا...... پھر ان کو اپنے باپ ہونے کا حق یاد آیا' جب میرے گناہ انہیں دکھے...... تب ہی کیوں؟ اور اتنی آسانی سے کہہ دیا چھوڑ دو...... یا ہم لاتعلقی اختیار کر لیں گے......" زرک کے دل کے قبرستان میں دفن ہر خواہش اپنے قبروں سے نکل رہی تھی۔ "میں چھوڑ دینا چاہتا ہوں یہ۔ لیکن اب میں اتنا دور نکل آیا ہوں زرمینے کہ ہر سو اندھیرا ہے اور اس اندھیرے میں' میں اکیلا ہوں...... اور یہ اندھیرا مجھے نگل رہا ہے...... میرا اب کسی چیز پر بھی یقین نہیں رہا۔ نہ محبت پر' نہ رشتوں پر' نہ...... اور...... نہ ہی خدا پر......" اب کی بار اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے تھے۔

زرمینہ آگے بڑھی اور اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

"پلٹ آؤ۔ چھوڑ دو مجسمہ سازی۔ معافی مانگ لو خدا سے...... وہ معاف کر دینے والا ہے...... پلٹ آؤ......" اس نے زرک کا ہاتھ تھاما تھا اور زرک نے اس بار اس کا ہاتھ جھٹکا نہیں تھا۔ "میرا ہاتھ تھامو میں تمہیں اندھیرے میں بھٹکنے نہیں دوں گی۔"

"تم مجھے کہہ رہی ہوں' مجسمہ سازی چھوڑو؟ اور تم نے جو وہ بدعت کی تھی...... وہ گناہ نہیں سمجھو گی؟"

"میں تب بھی اس کو بدعت اور گناہ سمجھتی رہی لیکن کہا ہے' جب بات کسی پیارے کی زندگی کی ہو تو انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ میں بھی ہو گئی تھی۔ مجھے لگا کہ

اگر اس سے ٹھیک ہو سکتا ہے' تو مجھے کوئی پروا نہیں اپنی زندگی کی...... میں بہری ہو گئی تھی جو اپنے من کی بات نہیں سن رہی تھی کہ اللہ پر یقین کرنا چاہیے تھا مجھے۔ اسی کے تو قبضے میں ہیں سب کی زندگیاں...... پھر ہوش آنے پر میرا ضمیر مجھے پچھتاوے کی دلدل میں دھکیلنے لگا......"

"اور تم نے کیا کیا؟" وہ اب اس کو دیکھ رہا تھا۔

"میں نے اس سے معافی مانگی...... جس کے صفات میں ایک معاف کر دینے کی صفت بھی ہے۔"

"اور پھر......؟"

"اور اس کے بعد میرا دل ہلکا ہو گیا کسی مخمل سے بنے پر کی طرح......!!!"

وہ بول رہی تھی اور دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

ان دو گھروں میں ایک دیوار کھڑی کی جا چکی تھی۔

نیک احمد کی بھی شادی ہو گئی اور لباس اور علی خان کی بھی...... نغمہ شادی کے بعد بہت کم آتی تھی۔ اس کا شوہر انتہائی شریف انسان تھا۔ قریبی گاؤں کے امیر خاندانوں میں سے ایک۔ وہ وہاں راج کر رہی تھی۔ یہ ان کا ماننا تھا لیکن در حقیقت اس کی زندگی ایک جہنم تھی۔ آج وہ اپنی بیٹی کی پیدائش کے بعد چالیسویں سے نہائی تو اپنے گھر آئی تھی۔ وہ بھی شاہ گل کے بار بار بلانے پر۔

نغمہ' نغمہ نہیں رہی تھی۔ وہ ایک مرجھایا ہوا پھول تھی' جس کے حسن کو اسد اللہ نے گہنا دیا تھا۔

"وہ خاوند ہے تمہارا' اگر دو تھپڑ مار بھی دے تو برداشت کر لیا کرو۔ دیکھا نہیں ہے تم نے کیسے میری ساری بہوئیں اپنے شوہروں کو مٹھی میں کر چکی ہے۔ ابھی تو میں زندہ ہوں' تمہارا دادا جی زندہ ہے۔ اس کے بعد تو یہ تینوں تمہیں......" شاہ گل اس کو سمجھا رہی تھیں لیکن وہ سن نہیں پا رہی تھی۔ وہ یک ٹک اپنی بیٹی کو دیکھ رہی تھی۔ جو بالکل اس کی طرح تھی۔ خوب صورت اور معصوم۔

"میں چلتی ہوں بس!" وہ اٹھنے لگی۔

"ارے ابھی تو آئی ہو تم۔ اتنی جلدی میں......" شاہ گل نے اس کو روکا تھا۔ لیکن اس نے اپنی بیٹی کا بیگ اٹھایا اور پھر برقع۔ باہر نکلی تو برآمدے میں سفید نماز کی ٹوپی سر پر' سیاہ واسکٹ اور اس پر پلو...... نیک احمد اس کو دیکھ کر رکا اور وہ اس کو بنا دیکھے نظر انداز کرتی جانے لگی۔ ایسے میں اس کے پیچھے اس کو پکارتی شاہ گل نکلیں۔

"نغ...... نغمے!"

نغمہ کا چہرہ سپاٹ تھا لیکن وہ رک نہیں رہی تھی۔ جیسے ہی وہ دروازے تک گئی اسی وقت دروازہ کھلا اور اس نے جو دیکھا۔ اس کی سانسیں تھمیں اور قدم بھی......!

دروازہ کھول کر آتی اس نے لڑکی نے اپنا سفید برقع اتارا تو اس نے دیکھا...... سلک کی سیاہ شلوار قمیص پہنے لڑکی' اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس نے سرخ بنارسی دوپٹا اوڑھ رکھا تھا' جس کے چاروں طرف سنہرا بنارسی بارڈر تھا اور بیچ میں تین پتیوں والی سنہری بوٹی...... اس لباس میں لڑکی کا دودھیا چہرہ مزید اجلا اجلا لگ رہا تھا اور سرخ لپ اسٹک لگائے اور چہرہ گلابی...... کاجل لگی نیلی آنکھیں...... ایک لڑکی اتنی حسین کیسے دکھ سکتی تھی...... اس لڑکی کا حسن نہیں تھا' جس سے اس کے قدم تھمے تھے۔ بلکہ اس لڑکی کی اوٹ سے نکلا وہ......

سفید اجلے کاٹن کے شلوار قمیص پر سیاہ نیا نکور واسکٹ پہنے وہ شخص...... جس کی تباہی میں کچھ حصہ وہ بھی رکھتی تھی۔ اس کے سیاہ گھمبیر بال آج بھی اس کے ماتھے پر بکھرتے جا رہے تھے۔ تازہ شیو' پاؤں میں پشاوری چپل......

تین ایک ہی تکون میں کھڑے خاموش تھے' معاً نغمہ مڑی اور گھر کی سے باہر جانے لگی۔ پیچھے سے نکل کر اس کو پکارتی شاہ گل بھی ذرا رک کو دیکھ کر تھمی تھیں لیکن انہوں نے دیکھا کہ ان کی بیٹی جو واپس جا رہی تھی' اب پھر سے گھر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ تاریک تھا۔

☆☆☆

"مور جانے ! مور جانے ! باہر روزہ (باہر نکلو)......دیکھو کون آیا ہے......" فاطمہ ان دونوں سے مل کر اب دوائیاں لینے کے بعد سونے کی کوشش کرتی مور جانے کے کمرے میں آکر جوش سے چلا رہی تھی۔ انہوں نے پہلے حیرت و مستفسرانہ نظروں سے دیکھا اور پھر فاطمہ کے چہرے پر اپنا جواب پا کر فوراً اتر کر چپل پہننے کے لیے دیکھنے لگیں لیکن جلدی میں ان کو چپل نہیں مل رہی تھی......انہیں خواب لگ رہا تھا' اس سے پہلے کہ ان کا خواب ٹوٹ جاتا' وہ ننگے پیر باہر نکلی تھیں اور انہوں نے دیکھا۔ صحن میں بہار کی روشن دھوپ پڑ رہی تھیں اور چارپائی پر بیٹھے رستم خان کے قدموں میں ان کا وہ بچہ بیٹھا تھا' جس کے لیے وہ ہر وقت رویا کرتی تھیں......اس کے پیچھے ایک لڑکی کھڑی تھی' جس کا چہرہ سورج کی روشنیوں میں چمکتا جا رہا تھا۔ معاً اس لڑکی نے مور جانہ کو دیکھا اور مسکرائی......

"مجھے معاف کر دیں داجی!" وہ معافی مانگ رہا تھا اور سر جھکائے داجی کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ معافی تو وہ بھی مانگنا چاہتے تھے۔ جتنی نفرت انہوں زرک کو اس کے گناہ سے روکنے کے لیے کی' وہ اگر اس کو محبت سے سمجھاتے تو آج وہ ان کے قدموں میں یوں نہ بیٹھا ہوتا۔

سچ کہتے ہیں' معافی مانگنے کی ہمت ہر کسی میں نہیں ہوتی اور ان میں بھی نہیں تھی۔ رستم خان نے اس کے جھکے سر پر ہاتھ رکھا تھا اور اسی وقت برآمدے میں کھڑی مور جانہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں۔

☆☆☆

من تو شدم
(میں تو بن گیا ہوں)

اسٹوڈیو کی محرابی کھڑکیاں کھلی ہیں اور اس پار بہار کا پہلا سفید پھول کھل چکا ہے۔ سورج کی چمکتی روشنی اس کے فراخ و روشن ماتھے پر پسینے پر پڑتی ایسی معلوم ہوتی' جیسے کسی جوہری نے اپنے سارے موتی اس کے ماتھے پر سجا دیے تھے۔ تازہ گارے کی خوشبو اس کے پسینے کی خوشبو سے ملتی سرگراں تھی۔

تو من شدی
(اور میں تم بن گیا)

اس کا اسٹوڈیو نغمہ کے مجسموں سے خالی تھا۔ ماضی کی یاد کی طرح وہ اس کے حافظے سے ابھی تک لپٹی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا جو تازہ گارے سے اٹے تھے۔ لاشعوری طور پر اس نے ہاتھ کی پشت سے ماتھا صاف کرنا چاہا اور شہادت کی انگلی سے مٹی اس کے ماتھے پر ثبت ہوگئی......

من تن شدم
(میں جسم بن گیا ہوں)
تو جان شدی
(اور تو روح بن گیا)

اسٹوڈیو کے بیچ' گھومتے ہوئے چاک پر مٹی کو اس کے ہاتھ کوئی نئی شکل دے رہے تھے۔ اسی وقت تاجدار سورج کی چمکتی روشنیوں کے سامنے' وہ سادہ سفید جارجٹ کے کپڑے پہنے لڑکی کھڑی ہوئی اور مسکرائی اس بے خبر سفال گر کے قریب آئی۔ گھومتے چاک پر مٹی کے گرد اس کے دونوں ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

زرک نے ان ہاتھوں کو دیکھا' جنہوں نے اس کی مٹی کو "صنم تراش" سے "سفال گر" میں ڈالا تھا......

زرک نے مڑ کر دیکھا......اور دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا......!

اس گیلے گارے کی خوشبو پر' محبت کی خوشبو قابض ہونے لگی......!!!

تا کس نہ گوید بعد ازیں
(تا کہ اس کے بعد کوئی یہ نہ کہہ سکے)
من دیگرم
(کہ میں کوئی اور ہوں)
تو دیگری
(اور تو کوئی اور......)

☆☆

عندلیب زہرا

دائرے



آسمان سیاہ تھا لیکن زمین سنہری تھی۔ مصنوعی روشنیوں اور رنگوں سے مزین۔ سچی خوشی کے جذبات سے سجی ہوئی۔ عید کی رونقیں عروج پر تھیں۔

''مما ! یہ گولڈن پازیب......'' سبیکا ایک جیولری شاپ پر کھڑی ہوگئی۔

''نہیں بیٹا......بس دیر ہوگئی ہے۔'' اس نے قطعیت سے کہا۔ ساری خریداری مکمل تھی۔ بجٹ محدود تھا۔

''مما پلیز۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

''شادی کے بعد شوق پورے کرنا۔'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ بارہ سالہ سبیکا نے حیرت سے دیکھا۔ ''میرا مطلب ہے ابھی پڑھائی پر دھیان دو۔'' اس نے بات سمیٹنا چاہی۔

''کون جانے وہاں موقع ملے نہ ملے۔'' کسی کا لہجہ کانوں میں گونجا تھا۔

اگلے پل وہ پازیبیں پیک کروا رہی تھی۔ اس کی نظریں سبیکا کے چہرے پر تھیں۔ وہ خوشی سے سنہرا ہو رہا تھا۔ اور یہ خوشی کئی روز تک اس کا احاطہ کیے رہی۔ وہ مسکراتی نظروں سے بیٹی کو دیکھتی۔ جو اپنے لڑکپن کو انجوائے کر رہی تھی۔ بابل کے آنگن کی چڑیاں جنہیں چہچہانا پسند ہے۔ خوش رنگ تتلیاں جن کے بال و پر یہیں پروان چڑھتے ہیں۔ معصوم کلیاں جنہیں مسکرانے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اس کے ذہن میں ماضی کے دریچے وا ہو گئے تھے۔

☆☆☆

مئی کی گرم دوپہر تھی۔ علینہ کا چہرہ گرمی اور پسینے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ آج کا دن بہت مصروف تھا۔ گرمی، لوڈشیڈنگ، ٹیسٹ۔ واپسی پر وین خراب ہوگئی تھی۔ آدھا راستہ پیدل چلنا پڑا۔

''کھانا کھا کر بس اب سونا ہے۔'' جوتے پیروں سے اتارتے ہوئے اس نے سوچا۔ پنکھے کی ہوا لوری کا کام دے رہی تھی۔

''علینہ ! کھانا کھا کر برتن دھو لینا۔ شام کو پھوپھو آ رہی ہیں۔ کھانے کی تیاری میں میری مدد کرو۔'' امی کی آواز پر وہ کوفت کا شکار تھی۔

''امی! میں تھک گئی ہوں۔'' اس نے احتجاج کرنا چاہا۔

''ساس کے سامنے یوں کہو گی۔ ماں کا گھر ہے ناں اس لیے آرام کی سوجھتی ہے۔''

وہ امی کی بات پر حیران تھی بلکہ افسردہ بھی۔ صبح ناشتے میں امی کی مدد کرتی۔ چھٹی والے دن ڈسٹنگ

کرتی۔ رات کو برتن دھو کر کچن سمیٹ کر سوتی۔ وہ آٹھویں کلاس میں تھی جب اپنی ہم جماعت یا ہم عمر لڑکیوں کو دیکھتی۔ اکثریت لاابالی تھی یا من موجی۔

"مما کہتی ہیں ساری زندگی کام کرنا ہے۔ کم از کم پیرنٹس کے گھر آرام کرلیں۔" یہ ساویہ تھی جو چار بہنوں میں تیسرے نمبر پر تھی۔

"یار! میری امی کا خیال ہے کہ ابھی سے ہانڈی چولہا کرنے سے چہرہ پکا اور خرانٹ ہو جاتا ہے۔" ثمن نے علینہ کا کھلے لفظوں میں مذاق اڑایا تھا۔

علینہ کو کام کرنے پر اعتراض نہ تھا۔ اختلاف تو امی کے رویے سے تھا۔ جو خوش ہی نہ ہوتیں۔ جن کا موقف تھا کہ لڑکیوں کو تربیت یافتہ ہونا چاہیے۔ پھر ہی وہ سسرال میں رہ سکتی ہیں۔ تیرہ برس کی علینہ سے وہ بیس بائیس برس کی لڑکی کا حوصلہ مانگتیں۔ نانو ان کو سخت گیری پر ٹوکتیں۔

"ارے سسرال کا ہوا نہ بنا...... بے شک ماں باپ لڑکیوں کو کام کاج سکھائیں۔ لیکن میکے کو اتنا سخت نہ بنائیں کہ وہ اسے قید خانہ سمجھیں...... اور اس سے چھٹکارے کی تدبیریں سوچیں۔"

علینہ بڑی خوش ہوتی کہ کوئی تو اس کا ہمنوا ہے۔

مینا بازار میں سب پر جوش کر رہی تھیں۔ ساویہ نے لہنگا سلوایا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ وہ موٹی ہے سوا سے ایک بار ضرور سوچنا چاہیے۔

"مما کہتی ہیں اپنا ہر شوق پورا کرو۔ نجانے پھر موقع ملے نہ ملے۔" اس نے موٹے کندھے اچکا کر کہا اور مزے سے چاٹ کھانے لگیں۔ سب نے ایک مزاحیہ نظر اس پر ڈالی۔ لیکن وہ بے نیاز۔

سبرینہ نے بلیک ٹائٹس کے ساتھ فراک سلوایا تھا اس کا گھرانہ سخت مزاج تھا۔ لیکن اس نے ضد کی تھی۔

"مما نے کہا کہ ایک بار پہن کر شوق پورا کر لو۔" اس نے فخریہ بتایا تھا۔

سب اپنی تیاریاں ڈسکس کر رہی تھیں۔ جب ثنا نے علینہ سے اس کی تیاری کے متعلق پوچھا۔ وہ گڑبڑا گئی۔ کیا کہتی بھلا؟ چند روز پہلے وہ امی کے ساتھ مارکیٹ تک گئی۔ کتنی بار کھسوں کی دکان کی سامنے قدم رکے۔ نگاہیں جیولری دیکھ کر خیرہ ہوگئیں۔ لیکن امی نے بے نیازی سے کہا۔ "شادی کے بعد شوق پورا کرنا۔" وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ نانو کو علم ہوا تو بے نقط سنائیں۔ لیکن امی نے صاف کہہ دیا۔

"ماں ہوں ناں جانتی ہوں تربیت کیسے کرنی ہے؟"

سو وہ سب کے درمیان اداس بیٹھی تھی۔ مینا بازار میں روایتی رنگ تھے۔ سب تیار تھیں۔ میک اپ تھوپے، جیولری پہنے خود پر نازاں...... اسکول کی چار دیواری میں وہ سب آزاد تھیں۔ علینہ سب سے سادہ تھی۔ صدف نے اس کا میک اپ کر دیا۔ ساویہ نے اپنا جیولری سیٹ پہنا دیا۔ لیکن اس کی آنکھوں کی چمک ماند رہی۔ جھولے لیتے، چاٹ کھاتے، ایک یادگار دن ان سب کی یادداشت میں محفوظ ہو گیا تھا۔

زندگی والدین کے گھر میں ہو یا سسرال، مشکلات تو آتی ہیں۔ اس کو سر پر سوار کرنا محض ذہنی اذیت ہے۔ اب علینہ دسویں جماعت میں تھی۔ بورڈ کے امتحان ہونے والے تھے۔ لیکن امی رعایت نہ دیتیں۔ اس کی کلاس فیلوز کا کہنا تھا کہ ان کی مائیں انہیں بادام دودھ دیتی ہیں۔ صرف پڑھائی پر زور تھا۔ علینہ ان باتوں کا موازنہ خود سے کرتی۔ اسے احساس ہوتا کہ امی کی سوچ بہت عجیب ہے کہ سسرال میں کیا کرے گی۔ وہاں بھی کام ہوگا سو پہلے ماں کو آرام پہنچائیں۔

ان کا گھرانہ زیادہ بڑا نہ تھا وہ بڑی تھی اور دو چھوٹے بھائی۔ اسے اپنے گھر والوں سے محبت تھی۔ ان کا خیال رکھنا، پروا کرنا۔ لیکن اب سب کچھ بوجھ بنتا جا رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی امی اور وہ سہیلیوں کی طرح رہیں۔ بہت سی باتیں وہ اپنی امی سے شیئر کرنا چاہتی تھی۔ بچپن سے بلوغت اور لڑکپن سے نوجوانی کے سفر میں ماں ہی بیٹی کی ہمراز بن سکتی ہے۔ لیکن ادھر امی اور اس میں فاصلے تھے۔ ہر وقت سکھانے کے چکر میں رہتیں۔ سسرال کے ڈراوے دیتیں۔

"اصل سسرال تو آپ ہیں۔" وہ کوفت سے سوچتی۔ اسی کشمکش میں پیپرز کی تاریخ آ گئی۔ اور یہ ذہنی دباؤ تھا یا واقعی وہ کند ذہن تھی وہ بری طرح ناکام تھی۔

”نانو! ذہن صاف سلیٹ ہے کچھ یاد نہیں رہتا۔“

وہ سوں سوں کرتی ناک کے ساتھ نانو کے گلے لگ کر روتی رہی۔ آخر ابو نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ نانو کے گھر رہ کر پیپر زدے گی۔ تناؤ بھرے ماحول سے نکلی تو ذہن آزاد ہو گیا۔ اور پرسکون بھی۔ ادھر نانو اور ماموں رہتے تھے۔ جن کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ پڑھتی۔ نانو بوڑھے ہاتھوں سے پراٹھے۔ دودھ پتی بنا تیں۔ ماموں سموسے لاتے۔ پڑھاتے۔ غرضیکہ ذہنی آسودگی نے سبق یاد کرنے میں مدد دی۔ ماموں کے مشوروں سے پرچے اچھے ہو گئے۔ جب رزلٹ آیا تو دل سرشار تھا۔ سب نے تحائف دیے۔ امی نے بھی سوٹ لے کر دیا۔ وہ دن اس کے لیے یادگار تھا۔

☆☆☆

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہا تھا۔ اس کے وہی معمولات تھے۔ اب وہ نانو کے قریب تھی۔

”تیری ماں نے سسرال میں بہت سختیاں سہی ہیں اس لیے اسے تیری فکر تھی۔“ نانو اسے بتاتیں۔ بی اے کے بعد امی کو بیاہ کی فکر ہوئی۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ عام لڑکیوں کے برعکس وہ پرسکون تھی۔ جیسے قفس سے نجات ملی ہو۔ امی کی سختیاں اب بری نہ لگتی تھیں۔ نکاح رخصتی کے موقع پر وہ نہ روئی۔ شاید جذباتی تعلق انسان کو آنسو بہانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ امی البتہ اسے گلے لگا کر بہت روئیں۔

”کتنا آرام دیا تھا علینہ نے۔“ انہوں نے آنکھیں ٹشو سے صاف کیں۔

سسرال نئی دنیا تھی۔ اس کی تعلیم و تربیت، ہنر، مزاج کا امتحان۔ امی کے پڑھائے گئے اسباق کا پریکٹیکل...... وہ خود کو اس کا حصہ بنانے لگی۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ سسرال بھیانک نہ تھا جیسے امی ڈراوے دیتیں۔ شاید یہ رویے یا عادات ہوتی ہیں جو کوئی بھی ماحول بناتے ہیں یا رشتے مضبوط کرتے ہیں۔

اس کے ساس سسر بیٹیوں کو پیار کرنے کے قائل تھے۔

”یہ مہمان ہوتی ہیں انہیں تعلیم و تربیت دو، ہنر سے مزین کر دو اور اچھے نصیب کی دعا دو۔“

جب اس کی بیٹی سبیکا پیدا ہوئی تو ساس نے پوتی کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

”آنے والے وقت سے کیوں ڈرائیں انہیں۔ ان کے دل میں خوف، وہم کے بیج کیوں بوئیں بھلا۔“ انہوں نے علینہ کو مخاطب کیا۔

”یہ ہمارے آنگن کے پھول ہیں انہیں کھلنے دو، ستارے ہیں چمکنے دو۔ یہ اپنی محبت اور خدمت کا اجر نہیں مانگتیں، بس اچھے نصیب کی دعا......“

سسر نے آنکھیں صاف کیں وہ دیکھتی تھی کہ سجاد بیٹی کو بیٹوں پر ترجیح دیتے۔ اس دن اسے بیٹی کا مفہوم سمجھ میں آ گیا تھا۔ اور سبیکا سچ مچ اس کی آنکھ کا تارا بن گئی تھی۔

”مما! نیل پینٹ لگاتا ہے۔“ عید پر ننھے ننھے ہاتھ سامنے لا کر رکھ دیتی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی خواہشات تھیں۔ گڑیا گھر، پکنک، پارٹی وہ بیٹی کی ہر سرگرمی میں شامل ہوتی کیونکہ اسے ماں بیٹی میں فاصلے بڑھانے نہیں تھے۔ وہ اسے گھر داری سکھا رہی تھی۔ لیکن پیار سے، سہولت کے ساتھ۔

”آج کھانا ہم پکائیں گے۔“ بارہ سالہ سبیکا نے اعلان کیا تھا۔

”اور خود ہی کھائیں گے۔“ دونوں بھائیوں نے مذاق اڑایا۔

”ہرگز نہیں...... اپنی بیٹی کے ساتھ کوکنگ میں خود کروں گا۔“ سجاد نے ٹی وی ریموٹ سائیڈ پر رکھا۔

سبیکا نے فروٹ کسٹرڈ بنایا تھا۔ سب نے شاباش دی تھی۔ سبیکا اپنی کامیابی پر خوش تھی۔ علینہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

ماں باپ کے گھر میں کتنے انمول لمحے ہوتے ہیں۔ جنہیں خوف، اندیشوں، اوہام کی گٹھڑی میں باندھ کر ہم ان کی چمک ماند کر دیتے ہیں۔ بابل کی دہلیز تو ہر بیٹی نے چھوڑنی ہوتی ہے پھر انہیں خوش رنگ خواب کیوں نہ تھمائے جائیں۔ بابل کی دہلیز پر ہنسنے مسکرانے کا موقع کیوں نہ دیا جائے۔

☆☆

میمونہ صدف

سپاس گزار

پچھلی قسط کا خلاصہ:۔

دانش کے موبائل پر اذکار کے اسکول سے کال آتی ہے۔ وہ فوراً اسکول پہنچتا ہے۔

اذکار کی کلاس ٹیچر دانش سے کہتی ہیں کہ سائیکالوجسٹ نے بتایا ہے کہ اذکار شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہے اگر ایسا ہی رہا تو وہ شدید ڈپریشن میں جا سکتا ہے۔

دانش سے اذکار کہتا ہے کہ زیور بابا کو ماما نے کرنل پاپا سے کہہ کر نکلوایا ہے۔

دانش رطابہ سے ہاتھ جوڑ کر درخواست کرتا ہے کہ بچوں کا خیال کرے۔ ان کی آپس کی لڑائی بچوں کی ذہنی صحت متاثر کر رہی ہے۔

کالج میں لڑکیاں آپس میں [illegible] کرتی ہیں کہ شوہر کم پڑھا لکھا ہو تو پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

آئینور کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے۔ وہ اسے کہتی ہے کہ اپنے طور پر شمشاد سے کہیں کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرے۔

شمشاد آئینور سے کہتا ہے کہ ڈگریوں کے بغیر بھی انسان معتبر ہو سکتا ہے۔ اگر بہتر مستقبل کی اتنی فکر ہے تو آئینور کے سامنے بھی وہ بھی ایک شرط رکھے گا۔

سموئیل پارٹی کرتا ہے۔ اس میں کالج کے سارے پرانے دوست مدعو تھے۔ رہبر ریحِل سے اپنی ملاقات کا کرتا ہے اور مزید یہ کہ اس نے ریحِل کو سموئیل کا نمبر دیا ہے۔

سموئیل کی امی پارٹی ختم ہونے کے بعد ایک بار پھر اس سے شادی کرنے کا کہتی ہیں۔

سموئیل ممی سے آئینور کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس نے آئینور کو اپنی حماقت سے کھو دیا ہے۔

سموئیل ممی سے کہتا ہے کہ آئینور کا نکاح اسی وقت ہو گیا تھا۔

نویں قسط

عابدہ گم صم سی بیٹے کو دیکھتی رہ گئیں۔ وہ اتنے عرصے سے ایک ایسی لڑکی کے لیے رشتوں سے منع کر رہا تھا جس کا کئی سال پہلے نکاح ہو چکا تھا اور وہ اس بات سے باخبر تھا۔ تو پھر وہ کس امید پہ اس لڑکی کا

منتظر تھا؟

ان کا بیٹا یہ کیا جوگ لگا کر بیٹھا ہوا تھا جس سے وہ بے خبر تھیں جبکہ وہ ہمیشہ باپ کی نسبت ان سے قریب رہا تھا۔ اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات بچپن سے ہی ان سے کہتا آیا تھا تو پھر اس لڑکی کا بھی ذکر کیوں نہیں آیا۔

"نکاح ہو چکا تھا۔" وہ زیرِ لب بڑبڑائیں۔

"اب تو وہ کسی کی بیوی ہو گی ہی۔ پھر تم کیا سوچ کر اس کا انتظار کر رہے ہو، کیا سوچ کر مجھے دعا کے لیے کہہ رہے ہو؟"

"انتظار اس لیے نہیں کر رہا ممی۔" یہ جملہ کہتے اس کے اندر کچھ ٹوٹا تھا۔ کوئی اس کی بے بسی پہ رو دیا تھا۔ ساتھ ہی کوئی اندر زور سے ہنسا بھی تھا۔ وہ کسے بے وقوف بنا رہا تھا۔ صرف خود کو۔ وہ تو اس امید پہ بھی اسے ڈھونڈ رہا تھا کہ شاید۔ ہاں شاید کہ ابھی وہ کسی کی نہ ہوئی ہو۔ شاید کہ لیکن انتظار کی ایک اور وجہ بھی تھی۔

"میں اس لیے اسے ڈھونڈ رہا ہوں ممی، کہ میں اس سے اپنے ماضی کی ایک غلطی کی معافی مانگ سکوں۔ وہ لڑکی وہ سب ڈیزرو نہیں کرتی تھی جو میں

ناولٹ



نے اس کے ساتھ کیا۔ اور شاید اب میں اس کی معافی ڈیزرونہیں کرتا۔"

"کیسی غلطی؟" ممی کی اس بات پہ اس کا رنگ فق ہوا تھا۔ وہ سارا منظر وہ بھی دہرانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ وقت اس کی نظروں کے سامنے ایسے آ کھڑا ہوا جیسے حال ہی ہو۔

☆☆☆

رطابہ نے بچوں کو شام میں وقت دینا شروع کیا تھا اور ایسا اس نے خود سے کیا تھا۔ دانش نے اس کے بعد رطابہ سے کچھ نہیں کہا تھا۔

جس ہسپتال میں وہ شام کو جایا کرتی تھی، وہاں او پی ڈی کے لیے جانا ترک کر دیا۔ ایڈمنسٹریشن کو بتا دیا کہ وہ محض آپریشن کے لیے آسکے گی۔ وہ تمام آپریشن جن کی تاریخیں عرصے پہلے دی جا چکی تھیں، اسے ہی کرنا تھے لیکن مزید آپریشن کی تاریخیں نہ دی جائیں۔ وہ کچھ وقت مریض نہیں دیکھے گی، سرجری نہیں کرے گی۔ اس وقت وہ ایک جانی مانی سرجن تھی جس کا نام ہی شفا سے منسلک سمجھا جاتا تھا اور یہ زعم کہ اس کی گئی اب تک کی ایک سرجری بھی ناکام نہیں ہوئی تھی، اس کی گردن میں سریا پیدا کر چکا تھا۔

بچوں کو پڑھانا اور ان کو ساتھ لگا کر شام کو کالونی میں واک کرتے ان سے بات چیت کرتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ ذکی بہت خاموش ہو چکا ہے۔ وہ بس اس سے وہی بات کرتا تھا جو وہ پوچھتی تھی جبکہ اخبا اس کے ساتھ بہت چہک رہی ہوتی تھی۔ اس سے اپنے اسکول کی بہت ساری وہ باتیں شیئر کر رہی ہوتی جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھیں۔ رطابہ کو سچ میں نہیں پتا تھا کہ اس کی بیٹی اسکول میں اتنی ذہین طالبہ ہے کہ تمام اساتذہ اسے اس طرح سراہتے ہیں۔ کیونکہ سچ یہی تھا کہ وہ ان کی پی ٹی ایم پہ بھی نہیں جاتی تھی۔ یہ کام دانش کرتا تھا۔

وہ بار بار رطابہ کا ہاتھ تھام کر چومتی جیسے اس سے اپنی محبت کا اظہار کرنا چاہتی ہو، اسے بتانا چاہتی ہو کہ اس کا ساتھ اسے کتنا پیارا ہے۔ کبھی کبھار فرط جذبات میں مدہم سا بول بھی دیتی۔ "ماما آئی لو یو۔"

یہ سب ذکی بھی دیکھ رہا ہوتا لیکن وہ نجانے کیوں بار بار اس منظر سے نظریں چرا لیتا۔ وہ بھی اس سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ بس چپ چاپ ایک روبوٹ کی طرح اس کے احکامات سنتا اور مان لیتا۔ رطابہ کو احساس ہو رہا تھا کہ اس کی اسکول کی سائیکالوجسٹ نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ شدید مینٹل اسٹریس میں تھا جو جلد ہی شدید ڈپریشن میں تبدیل ہونے والا تھا۔

"ذکی...... کچھ دیر میرے ساتھ بیٹھو۔"

اخبا کے کہنے پہ اس دن وہ انہیں واک کے دوران پارک لے آئی تھی۔ اخبا بھاگ کر جھولوں کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اس نے قریبی بنچ پہ بیٹھتے ہوئے اذکار کو جھولوں کی طرف جانے سے روک دیا۔ وہ کچھ جھجک کر بنچ کے دوسرے کونے پہ ٹک گیا۔ دونوں کے مابین تین قدموں کا فاصلہ تھا لیکن اس سے کہیں زیادہ فاصلہ ان کے دلوں کے مابین تھا۔ کوئی کہہ سکتا تھا کہ وہ ماں بیٹا ہیں۔ کیا بیٹے ماؤں سے اس عمر میں اتنے دور ہو سکتے ہیں؟

"تم مجھ سے بولتے کیوں نہیں ہو ذکی؟"

"بولتا تو ہوں۔" وہ سر جھکائے کہہ رہا تھا۔

رطابہ اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ اس کا جواب میکانکی تھا۔ جذبات سے عاری۔

"خود سے نہیں بولتے جیسے اخبا بولتی ہے۔ نہ کچھ شیئر کرتے ہو۔"

وہ چپ رہا اور اپنے جاگرز سے زمین کریدتا رہا۔ اس کے اضطراب کو وہ بغور دیکھ رہی تھی۔ اس کے اندر جیسے کہنے کو ایک جہاں تھا لیکن نکلنے کا رستہ نہیں تھا۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم بھی اخبا کی طرح مجھ سے باتیں کیا کرو۔"

اس نے ماں کو دیکھا اور ان نظروں میں ایسا کچھ تھا کہ رطابہ کی زبان کو چپ لگ گئی۔ گو کہ وہ نظریں پھیر چکا تھا لیکن رطابہ سے مزید بولا نہیں گیا۔ اس کی نظروں نے اسے جتا دیا تھا کہ وہ اس سے قلبی طور پہ اتنا دور ہو گیا ہے کہ اب شاید ہی وہ بھی

اپنے رشتے کو ٹھیک کر سکے۔ اور جب ان کا رشتہ وہ رہا ہی نہیں تھا جو ہونا چاہیے تھا تو وہ کیسے اخبا کی طرح اس سے کچھ بھی کہتا۔

"ذکی۔ میں چاہتی ہوں ہم دوستی کرلیں۔ جو ہوا اسے بھول جائیں۔"

اذکار نے کچھ حیرت سے ماں کو دیکھا۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا کہ ماں اس کو دوستی کرنے کی پیشکش کریں۔ اس سے پہلے تو ماں کے پاس اس کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ گزار سکیں اور اب وہ دوستی کی بات کر رہی تھیں۔

"کیا ہم دوست نہیں بن سکتے؟" رطابہ نے اپنا سوال دہرایا۔

وہ خاموش رہا۔ اس کا چہرہ ایسا لال پڑ رہا تھا جیسے وہ رو دے گا۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم اخبا کی طرح مجھ سے دوستی کرلو۔"

وہ چپ تھا اور ہاتھوں کو آپس میں رگڑ رہا تھا، تیز تیز پلکیں جھپک رہا تھا تاکہ اس کے آنسو نہ بہہ سکیں۔ وہ چھوٹا بچہ، اس کا اپنا بیٹا اس کے سامنے رونا نہیں چاہتا تھا۔

رطابہ نے اسے کچھ وقت دیا اور خاموش رہی۔

"کیا یہ ہو سکتا ہے ذکی؟" کافی دیر بعد اس نے پوچھا۔

اذکار نے سر اثبات میں ہلایا۔

"کیسے؟"

اذکار خاموش رہا۔ بہت کچھ تھا کہنے کو کہ کیسے لیکن اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ کہہ سکے۔ لیکن اسے کہنا تھا۔ اگر اس کی ماں اس کی طرف از خود قدم اٹھانا چاہتی تھیں تو اسے اس رشتے کو ایک موقع دینا چاہیے تھا۔

"جیسے باقی بچوں کی ماما ہوتی ہیں۔"

رطابہ نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"جیسے وہ ان کے ساتھ ٹائم اسپینڈ کرتی ہیں، کھیلتی ہیں......" وہ سمجھا نہیں پا رہا تھا۔ بس اس نے ویڈیوز میں دیکھا تھا کہ مائیں ایسی ہوتی ہیں۔ دوستوں سے سنا تھا جن کی مائیں ایسی تھیں کہ وہ اپنی ماں کو اپنی ایک دنیا سمجھتے تھے۔ وہ دنیا جو باقی جہاں سے الگ ہی معنی رکھتی تھی۔ "جیسے وہ انہیں سمجھتی ہیں۔"

شاید مسئلہ یہی تھا کہ وہ اپنی اولاد کو سمجھتی نہیں تھی کیونکہ اس نے انہیں ہمیشہ خود سے ایک فاصلے پہ رکھا تھا۔ اس کے بچوں سے زیادہ اس کی مصروفیات اہم تھیں۔

"جیسی فاطمہ خالہ ہیں میرے ساتھ...... ویسے۔" رطابہ کے تاثرات بدلے۔ وہ اس کی بہن کو اس سے بہتر کہہ رہا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ وہ اس جیسی بن جائے۔ اندر بہت زور کا دھکا لگا تھا۔ وہ فاطمہ جو اسے ہر معاملے میں ہمیشہ خود سے بہت پیچھے لگی تھی کیسے کسی بھی معاملے میں اس سے آگے کھڑی تھی۔ یہ نا قابل برداشت تھا۔

"آپ پاپا سے لڑا مت کریں۔"

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسی ایک بات پہ پریشان رہتا ہے۔ لیکن اسے سر ہلانا پڑا۔ اذکار کو مزید ہمت ملی۔ اسے لگا کہ ماں بدل گئی ہے اسی لیے اس کی ہر بات پہ سر ہلا رہی ہے۔ وہ سب کچھ کرنے پہ آمادہ ہے۔ وہ اپنے بیٹے کی ہر بات، ہر خواہش کو ماننے پر آمادہ ہے۔ وہ اس سے وہ سب کہہ سکتا ہے جو وہ اندر چھپاتا ہے۔ اس کی ماں باقی ماؤں جیسی بن چکی ہے۔ جو کچھ بھی کہنے پہ اسے کچھ نہیں کہے گی۔

"اور......"

"اور؟" مزید بھی کوئی اور تھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ زیور بابا سے معافی مانگ کر انہیں واپس رکھ لیں۔"

اس کے جبڑے بھینچے۔ مٹھیاں بھنچی۔ ماتھے پہ شکنوں کا جال بنا۔۔۔۔ اس کے بیٹے کے نزدیک ساری دنیا اس کی ماں سے برتر تھی، بہتر تھی۔ اس کی ماں کو سب کی طرح ہونے کی ضرورت تھی، سب کے سامنے جھکنے کی ضرورت تھی۔ بھلے وہ ماں تھی لیکن بطور رطابہ اسے یہ سب کرنا نہیں آتا تھا۔۔۔ اپنے سے کمتر لوگوں کے سامنے جھک جانا اس نے کبھی نہیں سیکھا تھا۔ اسی وقت رطابہ کا پلڑا بھاری ہو کر جھکا اور ماں کا پلڑا ہلکا پڑ گیا۔ ایک انا پرست عورت کا یہ سب

کرنا ناممکن تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ ماں بیٹے کے مذاکرات ناکام ہو گئے تھے کیونکہ وہ جو مطالبات رکھ رہا تھا وہ پورے کرنا رطابہ کے بس میں نہیں تھا سو محفل برخاست۔

وہ بنا کچھ کہے تیزی سے اخیا کی طرف چل دی۔ اس سے پہلے کہ وہ غصے سے پھٹ پڑتی اسے جگہ بدلنا تھی۔

اذکار نے ماں کو خود سے دور جاتے دیکھا اور سر جھکا لیا۔ اس کی خوش فہمی کا بلبلا پھٹ گیا تھا۔ اسے غلط لگا تھا کہ ماں بدل چکی ہے۔ وہ جانتا تھا ماں اس کے لیے خود کو اتنا نیچے نہیں کر سکتی اور یہی ہوا تھا۔ وہ بنا کسی ہوں ہاں کے وہاں سے چلی گئی تھی۔ اخبا سے کچھ فاصلے پہ کھڑی رطابہ غصے کی تمازت سے لال پڑ رہی تھی۔ اس کا بیٹا اس سے دوستی کی شرائط میں اس بوڑھے نوکر تک کو لے آیا تھا جو اسے کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔

"زیور کا اس گھر سے جانا ہی اچھا ہے۔" غصے کا رستہ ہمیشہ سب سے کمزور کی طرف کھلتا ہے اور اسی پہ نکلتا ہے۔

☆☆☆

"فاطمہ......"

ان کے فائنل پراف دو ہفتے بعد شروع تھے اور وہ چاروں ہمیشہ کچھ موضوعات جو مشکل ہوتے، اکٹھے بیٹھ کر سمجھا کرتیں۔ اس وقت بھی جب وہ چاروں لان میں بیٹھی کمبائنڈ اسٹڈی کر رہی تھیں تو کتابوں پہ جھکی آئینور کو جانی پہچانی سی آواز سنائی دی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو شمشاد کھڑا تھا۔ آئینور کا رنگ فق ہوا۔ وہ یہاں کیا کر رہا تھا۔ اتنے بڑے کالج میں اس نے کیسے اسے ڈھونڈ نکالا تھا۔

"آپ؟" وہ ششدر سی زیر لب بڑبڑائی۔

باقی تینوں اس بندے کو کچھ دلچسپی سے دیکھنے لگیں۔

"یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا کہ تمہیں پک کر لوں۔ گھر ہی جا رہا تھا۔ تمہاری بھی چھٹی کا ہی وقت ہے۔"

اب تینوں آئینور کو دیکھنے لگیں کہ یہ کیا ماجرا تھا۔ وقت تو چھٹی کا تھا لیکن ابھی وہ فارغ نہیں ہوئی تھی۔

"چلیں...... میں فری ہوں۔" حالانکہ وہ تینوں جانتی تھیں کہ ابھی انہیں مزید پڑھنا تھا لیکن آئینور نے عجلت میں جلدی جلدی کتابیں سمیٹ کر بیگ میں ڈالیں جیسے وہ وہاں سے غائب ہو جانا چاہتی ہو۔

"لیکن ابھی تو ہمارا کافی سارا رہتا ہے آئینور۔" سمیرا نے جلدی سے ٹوکا۔

"تم لوگ آپس میں ڈسکس کر لو۔ میں خود پڑھ لوں گی۔" یہ سچ بھی تھا کہ وہ خود پڑھ لیتی تھی۔ یہ وہ تینوں تھیں جو اس سے پڑھا کرتی تھیں۔

سمیرا نے کچھ طنزیہ مسکرا کر ان دونوں کو دیکھا جو ہونقوں کی طرح آئینور کو دیکھ رہی تھیں۔ اسے ایسی جلدی کیا پڑ گئی تھی جانے کی اور وہ اتنا گھبرائی ہوئی کیوں تھی۔

"ان کا تعارف نہیں کرواؤ گی؟" سمیرا چپ نہیں بیٹھ سکتی تھی یہ طے تھا۔

"یہ......" آئینور کی زبان ہکلائی۔ "میرے کزن ہی سمجھو۔" باقی دونوں نے تو شاید یقین کر لیا لیکن سمیرا طنزاً مسکراتی رہی۔ وہ اسے ہرگز کزن نہیں سمجھ سکتی تھی۔

کچھ فاصلے پہ کھڑے شمشاد نے آئینور کا وہ جملہ سن لیا تھا۔ اس کا رنگ پھیکا پڑا تھا۔ شاید وہ امید کر رہا تھا کہ وہ اس کا تعارف اپنی سہیلیوں سے کروائے گی لیکن 'کزن ہی سمجھو' سن کر اس کا دل کٹا تھا۔ وہ اسے اس قابل نہیں سمجھتی تھی کہ اس کو متعارف کروا سکے۔ کیا اب تک وہ اس سے نسبت پہ شرمندہ تھی۔ اس کا کم پڑھا لکھا ہونا اسے کھلتا تھا یا اس کی شخصیت ابھی بھی اسے دبو سی لگتی تھی۔ شاید یہ فرق تاعمر اسی طرح حائل رہنا تھا۔

آئینور اس کے ساتھ چل رہی تھی لیکن اس کا چہرہ برہمی کا غماز تھا۔ اسے شمشاد کا وہاں آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ چپ چاپ جا کر اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ شمشاد بھی خاموش تھا۔

"آپ کو مجھے لینے نہیں آنا چاہیے تھا۔" گاڑی

میں بیٹھتے ہی اس نے سختی سے کہا تھا۔

"تمہارا خیال رکھنے کا حق ہے مجھے۔"

"حق کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ اس حق کو جگہ جگہ جتائیں۔ مجھے نہیں اچھا لگتا کہ آپ مجھے کالج سے لینے آتے ہیں۔ سب کیا سوچتے ہوں گے کہ یہ کیسی لڑکی ہے جسے کوئی لڑکا کالج سے پک کرنے آتا ہے۔" سخت لہجے میں اس نے کہا تو شمشاد اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تمہیں میں ہی اچھا نہیں لگتا۔"

آئینور نے گہری سانس لی۔" آپ غلط بات کر رہے ہیں۔"

"ایسا ہی ہے۔ جب سے ہمارا رشتہ طے ہوا ہے تم اسی قسم کی پابندیاں لگاتی آ رہی ہو۔ تم نے کہا کہ میں یکسو ہو کر پڑھنا چاہتی ہوں اس لیے مجھ سے رابطہ نہ رکھو۔ میں نے مان لیا۔ کبھی مڑ کر تم سے رابطہ نہیں کیا۔ منگنی ہو کر بھی کبھی تم سے منگیتروں کی طرح برتاؤ نہیں کیا۔ نہ بات کی، نہ ملنے کو کہا۔ تم نے کہا کہ میں دانی سے تمہاری کوئی بات تک نہ کیا کروں، میں نے وہ بھی مان لیا۔ اپنے لب سی لیے اور تمہارے ذکر سے بیگانہ ہو گیا۔ تم نے کہا کہ میں مزید آگے پڑھوں تاکہ تمہارے مقابلے میں کچھ تو تعلیم یافتہ ہو سکوں۔ مجھے برا لگا تھا، بہت برا لگا تھا لیکن تمہاری خوشی کے لیے میں نے یہ قدم بھی اٹھا لیا۔ اپنی کوئی خواہش نہ ہونے کے باوجود پرائیوٹ بی اے کر لیا۔ اب پرائیوٹ ایم اے کی تیاری بھی کر رہا ہوں تم جانتی ہو۔۔۔ لیکن کیا کبھی تم نے سوچا ہے کہ اس رشتے میں ہم کس طرح ساتھ چل رہے ہیں۔۔۔؟ تم ہمیشہ اپنی خواہشات کو ہی مجھ پہ مسلط کرتی آئی ہو۔ تم نے کبھی میرے جذبات کا خیال نہیں کیا۔ کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں بھی اس رشتے کو لے کر کوئی جذبات رکھتا ہوں، کیا کچھ سوچتا ہوں، کیا کچھ چاہتا ہوں۔ تم نے اپنی چلائی ہے ہمیشہ۔"

"اور آپ نے اپنی ایک چلائی نا۔ اور جب چلائی تو ایسی چلائی کہ میں اپنے رستے پہ چلنا بھول گئی۔" اس نے دوبدو اس کی نظروں میں نظریں ڈال کر کہا۔

شمشاد نرم پڑا۔

"تم اب بھی اپنے رستے پہ ہو۔ میڈیکل کر رہی ہو۔ ڈاکٹر بن رہی ہو۔ میں نے تمہارے رستے کو گم تو نہیں کیا۔ اور اپنی چلانے کی جہاں تک بات ہے یہ میری نہیں ماما کی خواہش تھی۔"

"آپ کو کیا پتا آپ نے میرا کیا گم کر دیا ہے۔" اس نے رخ پھیر کر سوچا تھا اور اس کی نگاہوں میں بہت کچھ گھوم گیا۔

"میں اگر تمہیں لینے آ جاتا ہوں تو کوئی تم پہ انگلی نہیں اٹھا سکتا کیونکہ میں وہ سب انگلیاں توڑ سکتا ہوں۔ تم سب کے منہ پہ ایک تماچا مار کر کہہ سکتی ہو کہ یہ غیر نہیں ہے۔ اس سے رشتہ ہے میرا وہ بھی اتنا مضبوط کہ جس کے سامنے کچھ ٹھہر نہیں سکتا۔"

آئینور نے کچھ نہیں کہا۔ اس کی نظریں اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی پہ ٹکیں جہاں ایک نازک سی ہیرے کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ اس نے خود سے ایک عہد کیا تھا اور اسے ہر حال میں نبھانا تھا۔ ساتھ بیٹھا وہ شخص اس کی مخلصی پہ اعتبار کرتا تھا اور وہ کسی کا خود پہ کیا اعتبار نہیں توڑ سکتی تھی۔

شمشاد نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

آئینور کی نظروں کے سامنے وہ سب گھومنے لگا جو کچھ عرصے پہلے ہوا تھا۔

یہ تب کی بات ہے جب آئینور فاطمہ گل ابا سے ضد کر کے کالج کے ٹرپ پہ گئی تھی۔ اس سے پہلے بھی کالج کے چار سالوں میں ٹرپ جاتے رہے تھے لیکن وہ اپنی ذات کی چادر سے واقف تھی جو اس کا تن ڈھانپتی تھی اسی لیے اس نے کبھی کہا ہی نہیں کہ اسے بھی کسی ٹرپ پہ جانا ہے۔ ان چار سالوں میں اس نے سادہ زندگی گزار کر بس اپنی تعلیمی ضروریات کو پورا کیا تھا۔ پہلے سال کے بعد سے ہی اس نے

ہمیشہ اسکالرشپ پہ پڑھا تھا کیونکہ وہ ہر سال یونیورسٹی میں ٹاپ کرتی تھی۔ پہلے سال کی فیس اور کتابوں کے تمام اخراجات اس نے اپنی محنت سے جمع کی گئی رقم سے باآسانی پورے کر لیے تھے۔ ابا کو کسی مشکل میں نہیں ڈالا تھا۔ اگلے سالوں میں کچھ تو ٹیوشن کی فیس اور کچھ ابا کی دی گئی رقم سے وہ کتابوں، نوٹس اور سفر کے اخراجات نکال لیا کرتی۔ فیس یوں بھی معاف ہوگئی تھی۔ کسی قسم کی پارٹی، ٹرپ اور فیسٹول میں شمولیت پہ وہ یوں بھی معذرت کر لیا کرتی۔ اپنا سادہ سا کھانا گھر سے لے جا کر ایک کونے میں بیٹھ کر کھا لیا کرتی۔ کپڑے اس کے وہ تھے جو بڑی بہنوں کی اترن تھے۔ ٹرانسپورٹ اس کی لوکل بس تھی جس کے لیے وہ کتنی دور پیدل چل کر جایا کرتی تھی تاکہ اپنے روٹ کی وین پکڑ سکے۔ بس یہ آخری سال تھا اور اس کا یہ آخری ٹرپ۔۔۔ جس پہ دوستوں کے بے حد اصرار پہ وہ دل کو سمجھا نہیں سکی کہ وہ انکار کر دیتا۔ کیا اسے کوئی پل اپنے لیے جینے کا حق نہیں تھا۔ ابا کو ٹرپ کے خرچے سے زیادہ اسے یوں چند دنوں کے لیے بھیجنے کا مسئلہ تھا۔۔۔ وہ جتنے بھی بیٹی کے معاملے میں اعتبار کرتے، جتنے بھی آزاد خیال ہو جاتے سچ تو یہ تھا کہ دنیا ان کے اعتبار اور آزاد خیالی کی دھجیاں کسی وقت بھی اڑا سکتی تھی اور وہ دنیا سے بہت ڈرتے تھے اور پھر ہوا بھی یہی تھا۔

اس کے جانے سے پہلے ہی امی نے کافی ہنگامہ کیا تھا کہ وہ لڑکی ذات کو اتنی چھوٹ کیوں دے رہے ہیں۔ اس کے سسرال والوں کو پتا چلا تو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔ سسرال والوں کو کس نے بتانا تھا سوائے اُس پیٹ کے ہلکے کے جو کھانے پینے کی چیزوں کے سوا پیٹ میں کچھ رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے تو یوں بھی فاطمہ چھٹی دے چکی تھی۔ لیکن وہ پھر بھی بات تک پہنچ ہی جاتا تھا۔

''اگلے پورا ہفتہ چھٹی ہے دانی۔'' اس نے چھٹی کے وقت اسے کہا تھا۔

''کیوں آپ کہیں جا رہی ہیں؟'' فاطمہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ معصوم سا بچہ جو پیاری پیاری باتیں کیا کرتا تھا، دراز قد ہو چکا تھا، چہرے پہ ہلکا سا رواں آنے لگا تھا، آواز بھاری ہوتی کچھ عجیب سی ہو چلی تھی۔ وقت بہت گزر چکا تھا۔

''بس کچھ کام ہے کالج کا'' اس نے ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔ وہ اکثر اپنے پیپروں میں اسے چھٹی دے دیا کرتی تھی لہٰذا یہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ ہمدان خاموش ہو گیا لیکن تجسس میں پڑ گیا۔

ابا نے امی کو تو خاموش کروا دیا۔ اس نے ہمدان سے بھی چھپا لیا لیکن اگلی صبح جب وہ کالج کے لیے نکل رہی تھی تو کالج بیگ کی بجائے ہاتھ میں ایک چھوٹا سفری بیگ تھا۔ اسے کالج پہنچنا تھا کہ بس وہیں سے تو چلنا تھی۔ وائے قسمت کہ گلی کے نکڑ پہ ہی ہمدان اپنے ابا سمیت ٹکرا گیا۔ وہ اسکول جا رہا تھا اور اسے ابا ہی چھوڑتے تھے۔

اس نے ہونے والے جیٹھ کو سلام کیا۔ اتنا بڑا بیگ وہ اپنے ننھے منے سے وجود کے پیچھے کیسے چھپاتی۔

''آپ اکیلی کہیں کام سے جا رہی ہیں؟'' ہمدان کی زبان کے لیے پہلی بار اس نے سوچا تھا کہ کاش اسے چپ رہنا آتا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ جیٹھ نے بھی کھوجتی نظروں سے دیکھا۔ پھر اس کی اڑتی رنگت کو دیکھ کر پوچھ ہی لیا۔

''اتنی صبح اکیلی کہاں جا رہی ہو بیٹا؟'' وہ اسے ہمیشہ بیٹا ہی کہتے تھے حالانکہ رشتے میں وہ ان کی ہونے والی دیورانی تھی۔ مگر جب جب وہ ان سے ملی وہ ہمیشہ ایک مشفق باپ جیسا برتاؤ کرتے۔

''وہ......'' اس نے تھوک نگلا۔

''کالج ہی جا رہی ہوں۔'' وہ جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔

ہمدان کی زبان میں کھجلی ہوئی۔

''اتنا بڑا بیگ لے کر؟'' بیگ سفری تھا سو جھوٹ بولنا حماقت تھا۔

''ٹرپ جا رہا ہے کالج کا۔''

"واؤ......امیزنگ۔کہاں جارہا ہے؟" ہمدان تو پرجوشی سے کھل اٹھا۔اسے گھومنے پھرنے، کھانے پینے کا بہت شوق تھا۔اس نے ہمدان کو ذرا سا گھورا۔اپنی استانی کی نظروں کو سمجھ کر وہ چپ ہو گیا۔کاش وہ پہلے ہی اسے گھور دیتی تو وہ زبان بند رکھتا۔

جیٹھ جی بار بار بیگ کا حجم دیکھ رہے تھے۔ اتنے عقل مند تو تھے ہی کہ سمجھ سکتے کہ وہ ایک آدھ دن کے لیے نہیں جارہی۔کوئی ایک دن کے ٹرپ پہ یوں بیگ باندھ کر نہیں جاتا۔

ان کے تاثرات کچھ بدلے تھے کہ انہیں یوں لڑکی کا ٹرپ پہ جانا پسند نہیں آیا تھا۔آتا بھی کیسے کہ جس خاندان کی لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی نہیں تھیں اس خاندان کی ہونے والی بہو اکیلی چند دن کے لیے لڑکوں کے ساتھ ٹرپ پہ جارہی تھی۔

"خیر سے جاؤ......خیر سے لوٹو......" انہوں نے بدقت کہہ تو دیا لیکن فاطمہ جانتی تھی کہ آگے کیا ہوتا ہے۔

کالج ٹرپ میں وہ سب بھول بھال کر بس اس ماحول میں گم ہو چکی تھی لیکن واپسی پہ گھر جاتے ہوئے ایک ایک قدم اٹھانا بھاری تھا۔وہ جانتی تھی کہ جاتے ہوئے وہ کس طوفان کا دہانہ کھول کر گئی تھی۔ایسا ہو نہیں سکتا تھا کہ واپسی پہ وہی طوفان تھم چکا ہوتا اور وہ اس سے بچ جاتی۔اسے ہر صورت اس کا سامنا کرنا تھا جسے کچھ دن وہ موخر کر گئی تھی۔

ٹرپ سے واپسی پہ گھر کی دبیز خاموشی نے اس کا استقبال کیا تھا۔امی کمرے سے نکلی ہی نہیں تھیں۔ بھائی شاید بھابھی کے ساتھ گھر پہ موجود نہیں تھا یوں بھی شادی کے بعد وہ کم ہی گھر پہ پایا جاتا تھا...... البتہ ابا نے اس سے حال احوال دریافت کیا تھا لیکن ان کا لہجہ عجب شکستہ سا تھا۔ان کی آنکھوں میں پہلے جیسی چمک نہیں تھی۔

"ٹرپ کا نہیں پوچھیں گے ابا کہ کہاں کہاں گئے؟" وہ ابا سے اپنے احساسات بانٹنے کے لیے پرجوش تھی۔بیتے وقتوں میں ابا اس کے اچھے دوست بن گئے تھے۔ابا سے وہ کالج کی چھوٹی بڑی تمام باتیں کر لیا کرتی تھی۔ابا بہت دلچسپی سے اس کی ساری باتیں سنتے۔اس کی کامیابیوں پہ اسے داد دیتے۔اسے لگتا کہ ابا وہی ابا بن گئے ہیں جو ریٹائرمنٹ سے پہلے ہوا کرتے تھے۔اس کی کامیابیاں انہیں پھر سے جوان کر گئی ہیں اور ان میں جینے کی نئی امنگ پیدا کر گئی ہیں۔وہ ابا سے جتنی قریب ہو گئی تھی اتنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں رہی تھی۔

"ہاں بتاؤ؟" ابا کا انداز اسے چونکا رہا تھا۔ جذبات سے مفقود سپاٹ لہجہ۔

"میرے پیچھے کیا ہوا ہے ابا؟" یقیناً بہت کچھ ہوا تھا وہ اندازہ کر سکتی تھی۔

"تم آرام کرو۔لمبا رستہ طے کر کے آئی ہو۔تھک گئی ہو گی۔" وہ اپنے کمرے کی جانب پلٹ گئے۔

"ابا......"

وہ ٹھہرے......مڑ کر اسے دیکھا۔اس وقت وہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔وہ جانتے تھے کہ وہ پریشان ہو گی اور وہ اسے پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔

"میں خوش ہوں کہ تمہاری ایک خواہش پوری ہوئی۔تم تفریح کے نام پہ ایک علاقہ گھوم آئی۔دعا کرتا ہوں کہ تم مزید بھی زندگی میں باقی علاقے دیکھو......پورا پاکستان گھومو۔" ان جملوں سے ابا کی سچائی عیاں تھی لیکن پھر بھی ایک دیوار تھی جو اس خوشی کے مابین حائل تھی۔

"مگر میں آپ کی بجھی آنکھیں دیکھ کر خوش نہیں ہوں۔میرے سسرال والوں کی طرف سے کچھ ہوا ہے یہ بات میں جانتی ہوں۔کیا ہوا ہے بس یہ نہیں جانتی......" ابا نے اسے تعجب سے دیکھا تو اس نے ایک گہری سانس لی۔

"جب میں جارہی تھی تو ممتاز بھائی ملے تھے۔

مجھ سے جھوٹ نہیں بولا گیا تو میں نے بتا دیا کہ میں ٹرپ پہ جا رہی ہوں۔"

ابا وہ سب دہرانا نہیں چاہتے تھے کہ ان کو بیٹی کو دی گئی آزادی پہ کیا کیا سننے کو ملا تھا۔

"ایسی ہوتی ہیں اچھے گھرانوں کی بچیاں جو اتنے دور اکیلے چل پڑتی ہیں وہ بھی لڑکوں کے ساتھ۔" اس کی ساس اسی دن شام میں آ گئی تھیں اور اس کے گھر نہ ہونے کی تصدیق کر کے شروع ہو گئیں۔ شمشاد بھی ساتھ ہی آیا تھا۔ امی تو بس سر جھکائے کھڑی رہی تھیں کہ وہ تو اس حق میں تھیں ہی نہیں کہ فاطمہ کالج ٹرپ پہ جائے لیکن ابا مناسب الفاظ میں بات سمجھانا چاہتے تھے۔

"سب ہی بچیاں گئی ہیں۔ وہ اکیلی نہیں ہے۔ پھر کالجز میں تو یہ سب چلتا ہی ہے۔"

"کیا آپ جانتے ہیں ان بچیوں کو جن کے ساتھ وہ گئی ہے۔۔۔؟ ان لڑکوں کو جو ساتھ محافظ بن کر گئے ہیں۔۔۔؟ کیا آپ نہیں جانتے آئے دن یونیورسٹیوں کے کیسے کیسے کیس سامنے آتے ہیں۔ وہاں پڑھائی کے نام پہ کیا ہوتا ہے۔ کتنا گند بھرا ہوا ہے ان جگہوں پہ۔ بچیوں کی عصمت کیسے تار تار ہو جاتی ہے۔ پھر بھی آپ نے کئی دن کے لیے اسے بھیج دیا۔"

"پہلی اور آخری بار گئی ہے۔" یہ سچ بھی تھا کہ بہت گھومنے پھرنے کے شوق کے باوجود وہ بھی کسی اسکول کالج کے ٹرپ پہ نہیں گئی تھی۔

"حادثات پہلی بار ہی ہوا کرتے ہیں اور اکثر آخری ثابت ہوتے ہیں۔" ان کی بات پہ ابا تڑپ اٹھے۔ امی نے بھی شکوہ بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا جو ایسے سفاک جملے بول رہی تھیں۔ خدا ناخواستہ کہ ان کی بچی کو کچھ ہوتا۔

"ایسی آزادی ہمارے خاندان میں کبھی کسی لڑکی کو نہیں ملی جیسی آپ نے اپنی بچی کو دے رکھی ہے۔ بیٹیوں کے والدین تو سکون سے سو تک نہیں سکتے اور آپ اسے اکیلے بھیج کر یہاں مزے سے بیٹھے چائے کا لطف اٹھا رہے ہیں۔" سامنے تپائی پہ پڑی چائے کی پیالیوں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا گیا۔

شمشاد خاموش رہا۔ ماں کی بات سے یقیناً وہ متفق ہی ہوگا تبھی انہیں خاموش نہیں کروا رہا تھا۔

"بہن دراصل......"

انہوں نے ہاتھ ہوا میں دیوار کی مانند کھڑا کر کے انہیں بات کرنے سے روک دیا۔

"آپ نے جو کرنا تھا کر لیا، اب آپ میری بات سنیں۔" اور اگلی بات جو انہوں نے کی تو ابا بالکل گنگ رہ گئے۔

"لیکن بہن۔" ان کی بات کاٹ کر انہوں نے دوٹوک کہا۔

"بس...... یہ میرا فیصلہ ہے۔"

بات وہیں تمام ہو گئی۔ فیصلہ ہو گیا۔

ابا نے ایک سرد آہ بھر کر اسے دیکھا جو جاننا چاہتی تھی کہ ہوا کیا تھا۔ جو فیصلہ ہو چکا تھا، وہ زیادہ دیر چھپایا نہیں جا سکتا تھا۔

"اس جمعے کو تمہارا اور شمشاد کا نکاح ہے۔" وہ ابا کی بات پہ بت بن گئی۔

"نکاح......" الفاظ ادا ہو کر بھی بنا آواز ہی رہے۔

"ابا......" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ بے یقینی سے باپ کو دیکھ رہی تھی۔

"بیٹا! جو کام کل ہونا ہے وہ اب ہو جائے تو اس میں کیا غلط ہے؟ کون سا رخصتی ہو رہی ہے۔"

"مگر ابا...... یوں...... ایک دم......"

"ہم لڑکی والے ہیں فاطمہ۔ زیادہ بحث کرنا رشتے کو خراب کر سکتا ہے۔ اور سات سال کی اس منگنی کو میں اس موقع پہ جا کر خراب نہیں کرنا چاہتا۔"

ابا سچ مچ بیٹی کے باپ لگ رہے تھے۔ بے بس اور مجبور۔۔۔ لڑکے والوں کے فیصلے سے نہ چاہ کر بھی متفق اور بیٹی کو تسلی دیتے ہوئے۔

"میں شمشاد سے بات کروں گی۔ وہ میری بات سنے گا۔"

سامنے پڑا امی کا موبائل اس نے اٹھالیا اور کمرے کی طرف چل دی اور ابا نے اسے روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

موبائل میں اس انسان کا نمبر ہونے کے باوجود، جس سے اس کی منگنی کو سات سال ہو چکے تھے، اس نے کبھی رابطہ نہیں کیا تھا، اب وہ اسے پہلی مرتبہ خود سے کال ملا رہی تھی۔ دوسری طرف دوسری بیل پہ ہی فون اٹھالیا گیا تھا۔

"میں فاطمہ بات کر رہی ہوں۔" اس کے پاس ان دنوں موبائل نہیں تھا۔ امی کا نمبر ہی زیر استعمال تھا۔

"سورج کو دیکھا تو نہیں تھا صبح نکلتے ہوئے لیکن نکلا تو مشرق سے ہی تھا۔"

"کچھ ضروری بات کرنا تھی۔"

"تو واپس آچکی ہیں آپ؟" وہ جانتا تھا کہ وہ واپس آکر، نکاح کی خبر سننے کے بعد ہی اسے یہ کال ملا رہی تھی۔ اور وہ اس کی طرف سے کی جانے والی مزاحمت کے لیے تیار بھی تھا۔

"میں صرف آپ سے درخواست کرنا چاہتی ہوں شمشاد۔"

"ان سات سالوں میں یہ پہلی بار ہے جب آپ نے یہ کہا کہ میں درخواست کر رہی ہوں، شرط نہیں رکھ رہی۔ ان سات سالوں میں پہلی مرتبہ آپ نے مجھے میرے نام سے پکارا ہے۔ ان سات سالوں میں پہلی مرتبہ مجھے کال کی ہے۔ آج تو واقعی کوئی انوکھا ہی دن ہے میری زندگی کا۔ عجب طرح کی خوشی ہو رہی ہے۔" اس کا لہجہ مخمور تھا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اس سے کوئی رومانوی باتیں کرنے نہیں بیٹھی۔ پھر بھی وہ مسکرا رہا تھا۔

"پلیز اس نکاح کو فی الحال روک دیں۔" اس کی بات پہ وہ سنجیدہ ہوا۔ مسکراہٹ سمٹ گئی۔

"میرے بس میں نہیں ہے یہ۔ ہر بات میرے اختیار میں نہیں ہوتی فاطمہ ورنہ آپ جانتی ہیں کہ میں آپ کی بات ٹالتا نہیں ہوں۔ آپ نے جب جب جو کہا، تعمیل کی ہے لیکن یہ ماما کا فیصلہ ہے۔"

"آپ انہیں منا سکتے ہیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے اس رشتے کے لیے منایا تھا۔" اس کی بات پہ وہ چونکا تھا۔

اس نے رشتے کے لیے کیسے منایا تھا یہ بات وہ کیسے جانتی تھی؟ خود فاطمہ کو کچھ عرصے پہلے ہی ہمدان نے بتایا تھا کہ چاچو نے دادی کو ان سے رشتے کے لیے بھوک ہڑتال کر کے منایا تھا۔ اور چاچو کے اس کبوتر کو خود یہ بات کچھ دن پہلے معلوم ہوئی تھی جب اس نے گھر کے کسی بڑے کے منہ سے برسبیل تذکرہ سن لیا تھا کہ شمشاد تو دو وقت کے کھانے کی بھوک ہڑتال پہ بیٹھ جائے تو اماں تو اس کی ہر بات مان جاتی ہیں ...... اب بڑوں کو کیا پتا تھا کہ اس گھر میں 'لمحہ بہ لمحہ خبر' دینے والا رپورٹر موجود ہے۔

"فاطمہ ...... ایسا ممکن نہیں ہے ......" اس کا دوٹوک لہجہ اس بات کا غماز تھا کہ وہ خود بھی یہی چاہتا تھا تو وہ کیوں اس بات سے اپنے بڑوں کو منع کرتا۔ "میں چاہتا ہوں کہ ہم ایک مضبوط رشتے میں بندھ جائیں تاکہ پھر کوئی پابندی حائل نہ ہو۔" فاطمہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس کے پیر پڑ جائے کہ کسی طرح یہ نکاح موخر ہو جائے۔

"شمشاد پلیز ......"

"اتنا اچھا لگتا ہے تمہارے منہ سے میرا اولڈ فیشن نام۔" وہ شرارت سے مسکرا دیا تو فاطمہ نے کال کاٹ دی۔ موبائل ایک طرف ڈال دیا۔ وہ نہیں مانے گا وہ جان گئی تھی کیونکہ وہ تو خود بھی یہی چاہتا تھا۔

"تو یہ وہ شرط تھی شمشاد، جس کا تم نے ذکر کیا تھا کہ تم بھی بھی نا بھی اپنی شرط منواؤ گے۔" بیتی باتوں کو یاد کرتے اس نے کرب سے سوچا۔ اور وہ جانتی نہیں تھی کہ یہ وہ شرط نہیں تھی جو شمشاد نے منوانا تھی۔

اور چند دن جو ایک سکون، ایک خوشی، ایک

انجانا سا احساس وہ پہاڑوں کے دامن میں محسوس کر کے لوٹی تھی اب وہ بے پایاں درد میں بدل گیا تھا۔ اس رات وہ روتی رہی، سو نہیں سکی۔ اللہ کے آگے گڑگڑاتی رہی کہ کوئی معجزہ ہو جائے اور یہ نکاح رک جائے۔ اس سے اگلے دن وہ کالج نہیں گئی اور کمرے میں ہی بند رہی۔

امی کو زیادہ پروا نہیں تھی لیکن ابا کئی چکر کمرے کے لگا گئے تھے۔ اسے بہت طریقے سے سمجھانے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ بس بت بنی رہی۔

"بیٹا! جب کل بھی ایک کام ہونا تھا تو اس پہ کیوں اتنی پریشانی ہے۔۔۔؟"

اسے ابا سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ان کے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔

"تمہاری پڑھائی پہ کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ تم کیوں فکرمند ہوتی ہو۔ اس نے تمہاری پڑھائی کے لیے ہمیشہ قربانی دی ہے۔ تمہاری تعلیم کے رستے میں کبھی نہیں آیا۔ تمہیں سپورٹ کیا ہے جتنا کر سکتا تھا۔ حتیٰ کہ۔" ابا کی زبان یک دم خاموش ہوگئی۔

"حتیٰ کہ؟" اس نے سوالیہ نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔ ابا مشکل میں پھنس گئے تھے۔

"وہ ماہانہ تمہارے لیے مجھے تعلیم کے لیے رقم دیتا تھا تاکہ تمہیں کوئی پریشانی نہ ہو۔" ابا کی اس بات نے اس کے جسم سے جان نکال دی تھی۔

"ابا......" وہ بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگی۔

"اف......ابا......" اس نے اپنی سلگتی ہوئی کن پٹیوں کو مسلا۔

"میں نہیں لیتا تھا بیٹا۔ وہ یونہی میز پہ چھوڑ جاتا تھا۔ اسے بہت کہتے کہ ایسا مت کرے مگر۔۔۔ ہونے والا داماد تھا، نامناسب طریقے سے تو نہیں کہہ سکتے تھے۔۔۔ کیا کرتے پھر۔۔۔؟ تمہاری امی رکھ لیتی تھیں کہ اپنی ہونے والی بیوی کو ہی تو دے رہا ہے۔"

"یہ آپ نے کیا کیا ابا؟" اس کا دل کیا وہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ "یہ کیا کر دیا آپ نے میرے ساتھ۔" اس کی انا، خودداری جن کے لیے وہ کتنے سالوں سے جتی ہوئی تھی، دو کوڑی کی ہوگئی تھیں۔

"فاطمہ! وہ تمہارا ہونے والا شوہر ہے۔"

"مجھے اس کا احسان نہیں چاہیے تھا آپ کو بتایا تھا میں نے۔ پھر کیوں کیا ایسا؟ اف...... کاش کہ مجھے پتا ہوتا تو میں مر جاتی مگر اس کی مالی مدد نہ لیتی۔"

وہ اٹھ کر کمرے میں ادھر سے ادھر بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ دل تو دیواروں سے ٹکریں مارنے کا تھا لیکن خود کو روک لیا۔

"اس نے منع کیا تھا کہ تمہیں نہ پتا چلے۔ اسے تمہاری خودداری کی پروا تھی فاطمہ، تو ہی اس نے ایسا کیا۔ نہ ہوتی تو جتا نہ دیتا تمہیں۔ لیکن اسے ہماری مجبوریوں کا بھی پتا تھا۔"

"میں دو تین ٹیوشنز مزید لے لیتی لیکن اس کی مدد نہ لیتی۔ کاش کہ مجھے پتا ہوتا۔" وہ رونے لگ گئی۔ ہتھیلیوں سے ماتھا رگڑنے لگ گئی۔ ابا نادم تھے۔ انہیں اسے بتانا نہیں چاہیے تھا لیکن اس لیے بتایا کہ شاید اس کی پریشانی کم ہو جائے اور وہ سمجھ سکے کہ جو شخص اس کی تعلیم کی اتنی پروا کرتا ہے وہ بھلا اس کو ادھورا کیسے رہنے دے گا لیکن وہ مزید پریشان ہوگئی تھی۔

"اب میں کبھی اس کے سامنے سر اٹھا کر نہیں جی سکتی۔" اس نے اپنے آنسو پونچھے۔

"میاں بیوی میں کیا سر اٹھانا اور کیا جھکانا۔"

"عزت نفس میاں بیوی کی بھی ہوتی ہے۔"

"وہ تمہیں کبھی نہیں جتائے گا۔ وہ ایسا نہیں ہے کہ تمہاری عزت نفس کو پامال کرے۔"

"میں خود تو جانتی ہوں نا ابا۔ میں خود کیسے اس بات کو بھول کر جی سکتی ہوں۔"

"فاطمہ تم ضرورت سے زیادہ حساس ہو رہی ہو۔"

اس نے ابا کو تاسف سے دیکھا اور تاسف سے سر ہلایا۔ وہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ یہ بات کہ وہ اپنے بل بوتے پہ، اپنے دم پہ دنیا فتح کر رہی ہے کا زعم مٹی

مٹی ہو گیا تھا۔

ابا اٹھ کر باہر چلے گئے۔ اس کے دکھ میں مزید کئی ٹن کا اضافہ ہو گیا۔

شام کو مسز ممتاز ہمدان کے ساتھ آئی تھیں اس کے نکاح کا جوڑا اور دیگر چیزیں لے کر لیکن اس نے ملنے سے منع کر دیا۔ اس وقت وہ ہمدان کا سامنا بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس سے وضع وضع کے سوال کرے گا اور وہ کسی سوال جواب کا سامنا نہیں چاہتی تھی۔

امی نے نجانے انہیں کیسے ٹالا لیکن ان کے جانے کے بعد وہ چیزیں اس کے کمرے میں چھوڑ گئیں کہ وہ دیکھ لے۔ اس نے انہیں دور سے دیکھا لیکن چھوا تک نہیں۔۔۔۔ سات سال ایک شخص کے نام سے جڑی رہی لیکن کیوں کبھی اس شخص کے لیے اس نے دل میں وہ سب محسوس نہیں کیا جو اس رشتے کے حوالے سے اسے کرنا چاہیے تھا۔ سات سال کسی کا نام صبح شام ساتھ جڑا رہے تو محبت ہو ہی جاتی ہے، جانور سے بھی انسیت ہو جاتی ہے پھر اس انسان سے کیوں نہیں جو ہونے والا جیون ساتھی ہو۔ شاید انسیت ہو ہی گئی تھی لیکن اب جو سات دن میں ہوا تھا تو اس نے اس شخص کی انسیت کو دل سے زائل کر دیا تھا۔ محبت تو پہلے بھی نہیں تھی اور اب تو۔ تب ہی اس پہ یہ عقدہ کھلا کہ اچانک نکاح کا دکھ نہیں تھا یہ، یہ تو ایک لاحاصل کا دکھ تھا جو اسے رلا رہا تھا۔ اس جذبے کی موت کا دکھ جو چوری سے دل میں گھر کر گیا تھا لیکن بے فائدہ تھا۔

کاش کہ وہ ٹرپ پہ نہ گئی ہوتی۔ نہ یہ سب ہوتا اور نہ وہ سب ہوتا جس کا ادراک اب ہو رہا تھا۔

جمعے کا دن تھا اور جمعے کی نماز کے بعد نکاح تھا۔

گلی کے پارلر سے ہی بیوٹیشن امی نے بلوائی تھی۔ وہ اپنا جوڑا لے کر تبدیل کرنے اندر گئی۔

"لگتا ہے آپ نے زندگی میں بہت محنت کی ہے؟" وہ آبشار پہ ٹھہرے ہوئے تھے اور وہ اس کے ہاتھوں پہ نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔ آئینور نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا جو کام کر کر کے پتھریلے اور سخت ہو چکے تھے۔ وہ کتنی ہی کریمیں اور ٹوٹکے استعمال کر چکی تھی لیکن یہ وہ محنت کی نشانیاں تھیں جو اللہ نے اس کے ہاتھوں پہ ثبت کر دی تھیں۔

"لڑکیوں کے ہاتھ تو بہت نرم و نازک ہوتے ہیں۔ ایسے ہاتھ تو کسی محنت کش کے ہی ہو سکتے ہیں۔" اس کی حیرت پہ اس نے تجزیہ پیش کیا۔ وہ بالکل گم صم رہ گئی۔

"محنتی ہونا دنیا کی عظیم ترین خوبیوں میں سے ہے۔"

اور وہ پہلا شخص تھا جو بنا دیکھے، بنا بتائے اس کی محنت کو جان گیا تھا...... کیسے؟ وہ کیسے اس کے بارے میں اتنی ٹھیک قیاس آرائی کر لیتا تھا۔ وہ کیسے سب سے خود کو چھپائی اس لڑکی کو جان لیتا تھا۔ وہ کیسے پیاز کی پرت در پرت چھپی اس آئینور کی تمام پرتوں کو اتار لیتا تھا۔ وہ ساحر تھا، جادوگر تھا یا کوئی نجومی تھا۔

لباس بدلتے دل کی حالت بھی بدل گئی۔ دو آنسو ٹوٹ کر سفید فراک کی کڑھائی میں جذب ہو گئے۔

"بالکل نہیں۔ آپ ذمہ داری ہیں میری۔۔۔ آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

"ساتھ تو چھوٹ گیا عباد۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

دو آنسو اور تیزی سے بہہ نکلے جسے اس نے رگڑ کر صاف کیا۔ وہ اتنی کمزور نہیں تھی کہ کسی کے سامنے روتی۔ اسے اب تیار ہونے بیوٹیشن کے سامنے جانا تھا اور وہ ہرگز اپنے آنسو کسی کے سامنے نہیں بہا سکتی تھی۔

وہ متورم ناک کے ساتھ باہر آئی۔ اپنے کمرے کے صوفے پہ بیٹھ گئی۔

بیوٹیشن نے اس کا میک اپ شروع کیا۔

"اگر آپ بددماغ اور مغرور ہوتی نا آئینور تو اس ہوٹل والے چھوٹو کی عزت نفس کی اتنی پروا نہ کرتیں کہ کاغذ میں لپیٹ کر اسے پیسے دیتیں۔ مغرور

لوگ صرف اپنی پروا کرتے ہیں۔ دوسروں کے لیے
کبھی اتنا نہیں سوچتے۔"
اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔
"آپ کی آنکھوں میں پانی آ رہا ہے۔"
بیوٹیشن نے ہاتھ روک لیا۔
"چبھن ہو رہی ہے......" چبھن تھی مگر دل کی
جس کا کوئی علاج نہیں تھا۔
"آپ کو میک اپ سے الرجی تو نہیں ہے؟"
"پتا نہیں۔ میں نے کبھی میک اپ نہیں کیا۔"
بیوٹیشن نے حیرت سے اسے دیکھا کہ وہ لڑکی اس
زمین سے ہی تعلق رکھتی ہے.....؟ مگر یہی سچ تھا۔
اس نے کبھی میک اپ استعمال نہیں کیا تھا۔ اس نے
زندگی کو بالکل سادہ بنا کر جیا تھا۔ سادہ لباس، سادہ
خوراک، سادہ طرزِ زندگی۔
"آپ دوبارہ ٹرائی کریں۔" اس نے خود کو
ایک گہری سانس لے کر نارمل کرتے کہا۔
"آئینور فاطمہ گل! تم اپنی اوقات یاد رکھو کہ تم
صرف دسویں پاس ایک معمولی لڑکی تھیں جس کے
آگے تمام رستے بند تھے۔ تمہارے سارے رستے
اللہ نے کھولے اور تمہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ تم
یہ سب کیا اپنا کمال سمجھتی ہو.....؟ یہ تمہارا کمال نہیں
ہے۔ یہ سب خدا کی دین ہے۔ اس کی توفیق ہے۔
اسے کبھی اپنی کامیابی مت سمجھنا۔ اور وہ شخص جو تمہارا
ہونے والا شوہر ہے وہ تمہارا محسن ہے جس نے تم پہ
اتنا خرچ کیا کہ تم یہاں تک پہنچ سکو۔ اسے کبھی کمتر
مت سمجھنا۔ تم آئینور فاطمہ گل ہو اور ابا کہتے ہیں تم
رطابہ سے الگ ہو..... تمہیں رطابہ نہیں بننا۔ شمشاد
کو کبھی کمتر نہیں سمجھنا۔ کسی انسان کی قدر اس کی
اوصاف اور اس کا دل ہوتا ہے، اس کی تعلیمی قابلیت
نہیں۔ بھلے وہ کم پڑھا لکھا ہے اور تم ڈاکٹر مگر وہ ایک
اچھا انسان ہے۔ اس اچھے انسان کے لیے دل میں
کبھی کوئی حقیر خیال مت لانا۔" انسان خود اپنا ناصح
بنے تو سب سے بہترین طور پہ سمجھا سکتا ہے۔
"ہر بار لڑ کر تم تقدیر نہیں بدل سکتیں آئینور.....
بار جو چاہتی ہو وہ پا نہیں سکتیں۔ ہر شے پہ تمہارا نام
نہیں لکھا جو تمہیں تمہارے چاہنے سے مل سکے۔ اس
لیے لڑائی بند کرو اور دل کو پرسکون ہو جانے دو۔ خود
پہ مزید ظلم مت کرو۔ جو شخص تمہارا ہونے جا رہا ہے وہ
کسی معاملے میں بھی برا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ
بھی برا مت کرو۔"
اپنی سوچوں کے آگے ایک باڑھ لگا لی تھی۔
اب اس باڑھ کو کوئی نہیں پھلانگ سکتا تھا۔
سادہ سے میک اپ میں ہلکا پھلکا سا زیور پہنے
وہ تیار تھی اور اتنی منفرد لگ رہی تھی کہ نظریں نہیں ٹھہر
رہی تھیں۔
اس کی بہنیں نہیں آئی تھیں۔ رامین ان دنوں
اپنے شوہر کے ساتھ کراچی میں تھی اور رطابہ کا کوئی
امتحان تھا جس کی تیاری میں وہ بے حد مصروف تھی۔
اس نے ابا کو صاف سنا دی تھی کہ اتنے ہنگامی بنیادوں
پہ نکاح رکھیں گے تو کوئی آ پائے گا کوئی نہیں۔ ابا نے
اس سے بحث نہیں کی تھی۔ وہ یوں بھی فاطمہ سے
شدید خار کھاتی تھی۔ جب سے اس کا میڈیکل میں
ایڈمیشن ہوا تھا رطابہ کا مارے حسد کے برا حال تھا ابا
جانتے تھے۔ اس لیے بہتر تھا کہ وہ نہ آئے۔ دانش
اذکار کو لے کر آیا تھا۔ اذکار محبت سے خالہ کے ساتھ
چپکا بیٹھا تھا۔ وہ کم کم ہی نانکے آیا کرتا تھا۔ اس کی
ماں کا اپنے گھر کی آسائش چھوڑ کر میکے آ کر رہنے کا
دل جو نہیں کرتا تھا۔
"ہائے میرے چاچو کی دلہن اتنی حسین ہے۔"
ہمدان سب سے پہلے اس کے کمرے میں چلا آیا تھا۔
اسے بھلا کون روک سکتا تھا۔
فاطمہ اس کی بات پہ مدہم سا مسکرا دی۔
"کبھی سادہ سی لپ اسٹک بھی نہیں لگائی اور
اب اچانک اتنا میک اپ۔ جنت کی حور لگ رہی ہیں
قسم سے۔" وہ اس کی کرسی کے گرد گھوم گھوم کر طوافِ
کر رہا تھا۔ خود شیروانی میں وہ کسی دولہا سے کم
نہیں لگ رہا تھا۔
"چاچو ہیں بڑے لکی ویسے۔" فاطمہ کی

مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔

نکاح نامہ لیے ابا اور دانش ہی اس کے کمرے میں آئے تھے۔ تب اذکار اور ہمدان کو باہر بھیج دیا گیا۔

ابا کیا پوچھ رہے تھے، کیا کہا جا رہا تھا اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ حق مہر کے نام پہ کافی ساری رقم اور زیورات کی بات ہو رہی تھی جو سن کر بھی اسے سنائی نہیں دیا۔۔۔ وہ بس میکانکی انداز میں سامنے پڑے کاغذات پہ دستخط کرنے لگی۔

ابا امی دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ لیکن وہ بت بنی بیٹھی رہی۔

کچھ کہانیاں ایسے شروع ہوتی ہیں کہ ان کے آغاز کی خبر تک نہیں ہوتی اور جب خبر ہوتی ہے تو کہانی تمام ہو چکی ہوتی ہے۔ آئینور فاطمہ گل اور سموئیل عباد کی کہانی بھی ایسی ہی کہانی تھی۔

نکاح کے بعد ایک ہجوم تھا جو اسے دیکھنے، سراہنے اندر آیا تھا۔ سب خواب سا تھا۔ حقیقت لگ ہی نہیں رہا تھا۔

"شمشاد تم سے ملنا چاہتا ہے فاطمہ۔" مسز ممتاز اس کی انگلی میں انگوٹھی پہناتے ہوئے کان میں کہہ رہی تھیں۔ اس نے دل کو ٹٹولا۔ نکاح کے بول کے بعد بھی دل خالی ہی تھا۔

سب لوگوں سے کمرا خالی کروا لیا گیا کہ دلہا اپنی دلہن سے ملنا چاہتا ہے۔

وہ سر جھکائے بیٹھی تھی جب وہ [illegible] کے سر پہ پہنچ کر [illegible]

"نکاح مبارک ہو۔" اس نے سر کو ہولے سے جنبش دی۔ وہ مسکرا دیا۔

"یقین نہیں آ رہا کہ تم میری ہو چکی ہو ورنہ ان سات سالوں میں دل ڈرتا رہتا تھا کہ کہیں کچھ ہو نہ جائے۔"

وہ چپ رہی۔ وہ عین اس کے سامنے صوفے پہ بیٹھ گیا۔ دونوں مدمقابل تھے۔ وہ مبہوت سا اسے دیکھ رہا تھا جبکہ اس نے نظر اٹھا کر بھی اسے نہیں دیکھا

"دانی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مس حور لگ رہی ہیں۔" اس تعریف پہ اس کے گال لال پڑے۔

"میں زیادہ وعدے شعدے نہیں کرتا تم سے لیکن بس اتنا کہوں گا کہ ہمیشہ تمہیں خوش رکھنے کی کوشش کروں گا۔" وہ ہنوز چپ تھی۔ اس نے صوفے کا کشن اٹھا کر اس کے سامنے زمین پہ رکھا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ فاطمہ نے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا جسے تھام کر اس نے ایک ہیرے کی نازک سی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دی۔

"سج گئی ہے تمہارے ہاتھ میں جا کر۔" اس کا ہاتھ تھامے ہی رکھا اور وہیں بیٹھ گیا۔ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"تم کچھ نہیں کہو گی؟" اکیلے بولے چلے جانا اسے شاید عجیب لگا تھا۔

"میں کم بولتی ہوں۔" یہ سچ بھی تھا۔

اس نے سر ہلایا۔

"جانتا ہوں۔ دانی بتاتا ہے مجھے۔۔۔ مجھے کم گو لڑکیاں پسند ہیں۔ لڑکیوں کو اتنا ہی باوقار ہونا چاہیے جتنا کہ تم ہو۔"

وہ اپنے دوپٹے پہ لگی گوٹے کناری کو کھرچنے لگی۔ بوکھلاہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ یہ سب کتنا نیا اور جدا تھا اس کا احساس اب ہو رہا تھا۔

"ایک بات پوچھوں؟" وہ چونکی۔ اس کی طرف دیکھا تو وہ [illegible] اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"نکاح پہ کیا اعتراض تھا تمہیں؟" اس نے [illegible] جھکا لیا۔ وہ کیا بتاتی کہ کیا اعتراض تھا [illegible] بات تو خود اسے کل رات معلوم ہوئی تھی کہ اعتراض نکاح پہ نہیں کچھ اور تھا۔

"مطلب ہم سات سال سے منگیتر ہیں۔ اب اگر نکاح ہو رہا تھا تو تم کیوں چاہتی تھیں کہ نہ ہو؟"

"میں سکون سے پڑھنا چاہتی تھی۔ آخری سال میں ایسا کچھ نہیں چاہتی جس سے میری پڑھائی

متاثر ہو۔"

"میں تمہارے سکون میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالوں گا۔ اگر میں نے ایسا کرنا ہی ہوتا تو پہلے ہی کر چکا ہوتا۔"

وہ خاموش رہی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے کچھ نہیں جتا رہا لیکن وہ کیا کرتی کہ اس کا دل چور بن گیا تھا کہ وہ اس کی مالی مدد سے اپنے تعلیمی سفر پہ خرچ کرتی رہی ہے۔

"تم کچھ پوچھنا چاہتی ہو؟" وہ چاہتا تھا کہ وہ بھی اس سے کوئی بات کرے۔ سات سال میں کیا کبھی کوئی بات اس کے دل میں نہیں آئی تھی جو وہ اس سے کہنا چاہتی ہو۔

"آپ نے مجھ سے شادی کا فیصلہ کیوں کیا؟" ہاں یہ سوال تھا جو اسے چبھتا تھا۔ جب سے اس کی ہونے والی ساس نے یہ بات کی تھی کہ شمشاد کی خواہش تھی کہ اس کی بیوی پڑھی لکھی ہو، ڈاکٹر ہو۔ کئی وسوسے سر اٹھاتے رہے تھے۔

"جانتی ہو جس دن تم سے شرٹ پہ لڑنے آیا تھا اور تم نے اتنی مضبوطی سے اپنی طرف کے دلائل دیے اور یہ بتایا کہ تم کیوں اتنی محنت کر رہی ہو صرف اور صرف اپنے مشن کو پانے کے لیے، اسی دن دل جھک گیا تھا تمہارے آگے۔ تمہاری مخلصی اور محنت نے مجھے متاثر کیا تھا۔" اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی جیسا اس کی ماں نے کہا تھا

"میں نے ہمدان کے لیے تمہاری محنت دیکھی تھی۔ تم کتنا مخلص [illegible] جو دل سے پڑھاتی تھیں ہم سب جانتے تھے۔ ٹیوشن [illegible] ہر کوئی پڑھا لیتا ہے لیکن مخلص کوئی کوئی ہوتا ہے اپنے بچوں سے۔ تب ہی سوچ لیا تھا کہ مجھے بس تم ہی چاہیے ہو۔ جو اپنے شاگرد سے اتنی مخلص ہے، وہ اپنے رشتوں میں کتنی مخلص ہو گی۔"

آئینور فاطمہ گل کے اندر کچھ چبھا تھا۔ کاش کہ وہ سچ میں اس سے مخلص ہو کر محبت کر پاتی۔ کاش کہ یہ سب اس کے بس میں ہوتا تو۔

"بس؟" اس کے منہ سے پھسلا۔ کیا وہ اس کی مخلصی کی وجہ سے اس سے شادی کر رہا تھا۔

"تو اور کیا؟" وہ ہنس دیا۔ "تمہیں کیا لگا تھا؟" اس نے سر نفی میں ہلایا۔ اس کے کمرے کا دروازہ بجا۔

"بھابھی ہوں گی۔"

تب ہی دروازہ کھول کر مسز ممتاز اندر داخل ہوئیں۔

"ملاقات کا وقت ختم ہوتا ہے۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ویسے ہمارے خاندان میں شمشاد نے نئے ریکارڈ قائم کیے ہیں۔ وہ وہ کیا ہے جو پہلے کسی نے نہیں کیا۔" وہ چھیڑنے والے انداز میں کہہ رہی تھیں۔

"اب ہم میاں بیوی ہیں۔ کسی کی مجال کہ کوئی ایسی دلیل لا کر دکھا دے جو ہم پہ پابندی لگا سکے۔"

"اچھا مولانا۔ چلیں اب۔" وہ اسے دھکیل رہی تھیں۔ وہ بھی ہنستا ہوا ان کے ساتھ جاتے ہوئے بھی فاطمہ کو ہی دیکھ رہا تھا۔ دروازے تک پہنچ کر اس نے پھر سے مڑ کر اسے دیکھا اور باہر نکل گیا۔

اپنی انگلی میں پہنی انگوٹھی پہ اس کی نظریں ٹک سی گئیں۔ یہ انگوٹھی اس شخص نے پہنائی تھی جو اب اس کا شوہر تھا، جو کچھ دیر پہلے اس سے اپنی محبت کا اظہار کر کے گیا تھا اور اس سے بھی محبت کا اظہار چاہتا تھا۔ پہلے وہ اس سب کو ذہن سے جھٹک سکتی تھی کہ بات منگیتر کی تھی اور منگنی اس کے نزدیک کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اب وہ [illegible] ذہن سے [illegible] پاس جو نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اب وہ اس کا شوہر تھا۔ تمام حقوق [illegible] اپنے کروا چکا تھا۔

وہ اس کی مخلصی کی وجہ سے اس سے رشتہ جوڑنا چاہتا تھا اور وہ کیا سوچ رہی تھی۔ کسی کے نکاح میں ہو کر، کسی اور کو سوچنا رشتے کے اخلاص کو میلا کرنا تھا۔ اور اسے ایسا نہیں کرنا تھا۔ وہ کبھی اللہ کے فیصلوں کی منکر نہیں ہوئی تھی، اب بھی نہیں ہونا چاہتی تھی۔ جہاں جس کا مقام ہو، اسے وہیں رکھنا چاہیے۔ یہ سنجوگ قدرت میں لکھا تھا وہ اسے رد نہیں کر سکتی تھی۔ دل پہ زور نہیں تھا لیکن سوچیں اس کے

قابو میں تھیں۔ وہ کسی ایسے انسان کے بارے میں نہیں سوچ سکی جو کبھی اس کا نہیں ہو سکتا تھا اور اسے اسی انسان کو سوچنا تھا جواب صرف اور صرف اسی کا تھا۔ انگوٹھی والا ہاتھ اس نے بھینچ کر لبوں سے لگا لیا۔ کچھ آنسو بھی ٹوٹ کر گرے۔

"پیپرز کب سے ہیں؟" اس کے سوال پہ وہ حال میں لوٹی۔

"دو ہفتے بعد۔"

گاڑی گیٹ کے سامنے روک دی تھی۔ اب اسے کسی محلے والے کا ڈر نہیں تھا کہ کوئی ان پہ بات کرے گا کیونکہ سب جانتے تھے کہ وہ میاں بیوی ہیں۔

"ایک ریکویسٹ کرنا تھی کہ میرے پراف میں پلیز مجھے ڈسٹرب مت کریے گا۔ آپ جانتے ہیں میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔" شمشاد نے سر کو خم دیا۔

"بے فکر رہو۔ ہماری طرف سے کوئی ڈسٹربنس نہیں آئے گی۔" اس کے چہرے اور آنکھوں میں چمک جاگی تھی۔ اسے اچھا لگتا تھا کہ جو لڑکی پہلے بس شرائط رکھتی تھی اب درخواست کرنے لگ گئی تھی۔

پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا۔

"کچھ بتانا تھا۔ ذہن سے نکل گیا۔" وہ اس کی طرف ہی متوجہ تھی۔

"میں اگلے مہینے دبئی جا رہا ہوں اپنے بزنس کے لیے۔" وہ چونکی۔

"یوں اچانک؟"

"اچانک تو نہیں ہے۔ بہت پہلے کا سوچا ہوا تھا بس کبھی بتایا اس لیے نہیں کہ ایسا کوئی تعلق کبھی بن نہیں پایا ہمارے درمیان۔ سو چا اب بتا دوں۔"

"آپ دبئی شفٹ ہونا چاہتے ہیں۔۔۔؟"

اس کا دل کانپ اٹھا۔ وہ یہاں سے کہیں نہیں جانا چاہتی تھی۔ اسے ہمیشہ ملک سے محبت رہا تھی [illegible] اسی مٹی [illegible] [illegible] رہنا چاہتی تھی۔ اپنے دیگر کلاس فیلوز کی طرح اسے کوئی دوسرے ملک جانے کا خبط نہیں تھا۔ اس میں وفا تھی، اخلاص تھا تو رشتوں کے علاوہ مٹی سے بھی تھا اور وہ اسے بھی ایمان داری سے

نبھانا چاہتی تھی۔

"یہاں بھائی جان ابا کا بزنس دیکھ رہے ہیں۔ میں کسی دوسرے ملک میں اپنا بزنس شروع کرنا چاہتا ہوں۔ بزنس وہاں شروع کروں گا تو شفٹ تو ہونا ہی پڑے گا۔"

"مگر وہ تو آپ یہاں بھی سیٹ کر سکتے ہیں۔"

"یہاں کیا رکھا ہے؟"

اور آئینور فاطمہ کل ایک ایسے انسان کی شکل دیکھتی رہ گئی جو اس سے کہہ رہا تھا کہ یہاں کیا رکھا ہے؟ وہ ایسے ہر انسان کا منہ توڑ دینے کی خواہش رکھتی تھی جو کہتا تھا کہ پاکستان میں کیا رکھا ہے۔ سامنے بیٹھا وہ شخص اس کا شوہر تھا جو یہ بات کہہ رہا تھا اور اسے بے حد دکھ ہوا تھا۔ ان دونوں کی سوچ تھی الگ سمتوں میں چلتی تھی۔

"میں چاہتا ہوں کہ شادی سے پہلے اپنا بزنس اسٹیبلش کر لوں۔ اگر تم دبئی کی بجائے کسی اور ملک میں رہنا چاہتی ہو تو بتاؤ۔"

"صرف پاکستان میں۔" دوسرا، تیسرا کوئی نام نہیں تھا سوائے اس ایک نام کے۔

اس نے تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور گھر کے کھلے گیٹ سے اندر چلی گئی۔ شمشاد اسے دیکھ کر رہ گیا۔

پراف کے دنوں میں کہیں سے کوئی ڈسٹربنس نہیں تھی لیکن وہ دو نگاہوں سے مسلسل زچ ہو رہی تھی جو اسے خود پہ محسوس ہوتی تھیں۔ اور وہ تھیں سوئیل عباد کی۔۔۔ جب وہ سر اٹھا کر دیکھتی تو وہ اس کی طرف متوجہ نہ ہوتا لیکن اسے لگتا کہ وہ کچھ دیر پہلے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے دوبارہ کبھی آئینور کو مخاطب کرنے کی کوشش بھی نہیں کی اور کبھی جو وہ اس کے گروپ سے بات کر [illegible] تو اسے یوں نظر انداز کر دیتا جیسے وہ وہاں ہو ہی نہیں۔ اسے وجہ نہیں معلوم تھی لیکن آئینور کا وجود عباد کے سامنے سے مٹ چکا تھا۔۔۔ اسے اب کوئی فرق بھی نہیں پڑتا تھا کہ وہ دونوں کون سا ایک رستے کے مسافر تھے۔ اس کے رستے شمشاد سے نکاح کے بعد سے ہی الگ ہو چکے

تھے۔ لیکن وہ چھپ کر اسے پھر کیوں دیکھتا تھا کہ وہ اس کی نظروں کی حدت اپنے وجود پہ صاف محسوس کر سکتی تھی۔ بس کبھی پکڑ نہیں سکی۔ اسے اس احساس سے الجھن ہوتی تھی۔

اس دن اس کا آخری وائیوا تھا۔ وہ پیپر دے کر نکل کر اپنے گروپ کو ڈھونڈنے نکلی ہی تھی کہ ریچل سامنے سے ٹکرا گئی۔

''تم نے تحریم وغیرہ کو دیکھا ہے؟'' آئینور نے اس سے پوچھا۔

''تمہارے گروپ کو تو نہیں دیکھا البتہ گیٹ پہ کسی کو دیکھا ہے جو تمہارا منتظر ہے۔۔۔''

اپنا بیگ کاندھے پہ ڈالتی آئینور چونکی۔

''میرا منتظر؟ کون؟''

''وہی تمہارا بوائے فرینڈ جو اکثر تمہیں لینے آتا ہے۔'' ریچل کی بات پہ اس کا رنگ سیاہ پڑا۔

''مائنڈ یور لینگویج ریچل۔ وہ میرا بوائے فرینڈ نہیں ہے۔'' اس نے سختی سے اسے ڈپٹا۔

''کیا ہوا؟ سب ٹھیک ہے؟'' سمیرا بھی اس کے برابر آ کر کھڑی ہوئی۔ باقی دونوں غائب تھیں۔

''میں نے اسے بتایا کہ اس کا بوائے فرینڈ اسے لینے آیا ہے تو یہ غصے میں آ گئی۔ اب اس میں غصہ کرنے والی بات کیا ہے۔ وہ بھائی تو ہے نہیں اس کا تو بوائے فرینڈ ہی ہوا نا۔'' ریچل یک دم معصوم دکھائی دینے لگی۔

''میں نے کہا نا کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ اپنا منہ بند کرو۔'' آئینور کا مارے ہتک کے چہرہ سرخ پڑ گیا۔

''تو پھر کیسا ہے آئینور۔ تم بتا کیوں نہیں دیتی کہ تمہارے اور اس کے بیچ کیا چل رہا ہے۔ کیوں وہ تمہیں لینے آتا ہے؟'' سمیرا نے ہر دوسرے دن [illegible] ٹھنڈے ٹھار لہجے میں میٹھا میٹھا طنز کیا۔

آئینور اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ اس کی دوست ہو کر کس طرف تھی، آج اس پہ کھل گیا تھا۔

''وہ میرا...... کزن ہے۔'' شوہر کہتے کہتے لبوں میں ہی رہ گیا۔

ریچل عجب طریقے سے ہنس دی۔

''کزن کے ساتھ گھومو پھرو تو عزت پہ کوئی حرف نہیں آتا کیا؟ ویسے وعدے کزن سے کر رکھے تھے تو کسی اور کو کیوں امیدیں دلاتی رہی ہو۔'' ریچل کی بات پہ وہ چونکی۔

''میں نے کبھی کسی کو کوئی امید نہیں دلائی۔''

''اچھا!!!!...... واقعی؟'' آئینور نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

''عباد اور تمہارا سین نہیں سیٹ تھا؟'' آئینور کا رنگ اڑا۔

''ایسا کچھ نہیں تھا۔''

''مگر عباد تو کچھ اور کہتا ہے؟'' آئینور کو یقین نہیں آیا کہ عباد اس کے اور اپنے بارے میں کچھ ایسا بھی کہہ سکتا ہے۔

''اب اسے ہری جھنڈی دکھا کر کسی اور کے ساتھ چل پڑی ہو۔ شرم نہیں آتی تمہیں۔۔۔؟''

''مائنڈ یور لینگویج ریچل...... وہ کوئی اور نہیں، میرا شوہر ہے۔ میرا نکاح ہو چکا ہے اس سے۔'' اس سے زیادہ وہ اپنے کردار پہ نہیں سن سکتی تھی۔ سمیرا اور ریچل ہکا بکا سی اس کی صورت دیکھنے لگیں۔

غصے کا ایک ابال آئینور کے وجود میں اٹھا اور اس نے تیزی سے گراؤنڈ میں کھڑے عباد کی طرف رخ کیا جو موبائل پہ کسی سے بات کرتا ہوا ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔

''کیا میں نے کبھی آپ سے کچھ ایسا کہا جس پہ آپ کو لگا ہو کہ ہمارے درمیان کوئی تعلق ہے؟'' بنا کسی تمہید کے وہ اس پہ پھٹ پڑی۔ اس نے کال کاٹ کر حیرت سے اسے دیکھا۔ ایسی کسی چڑھائی کے لیے وہ ہرگز تیار نہ تھا۔

''اگر میں نے کہا ہے تو بتائیں ورنہ یہ جھوٹے [illegible] غصے کا [illegible] ''اندر بہت [illegible] ڈرامے کرنا بند [illegible] کر پک رہا ہو تو ہلکی سی رگڑ درکار ہوتی ہے زمین سے پھٹنے میں۔ وہ رگڑ لگ چکی تھی۔

''میں نے کون سا ڈرامہ کیا ہے؟'' اس نے

نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

"یہ آپ ان سے جا کر پوچھیں جنہیں آپ ہماری سیٹنگ کے قصے سناتے رہے ہیں۔" وہ نہیں جانتا تھا کہ کیا ہوا تھا لیکن اس کا یوں چلانا عباد کو ناگوار گزرا تھا۔

"آئینور فاطمہ گل! میں اتنا گرا ہوا نہیں ہوں کہ کسی لڑکی کو مفت میں بدنام کروں۔ دو دن ٹھیک سے بات کرنے اور خیال رکھنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہماری سیٹنگ ہو گئی۔ اور جب کچھ ایسا تھا ہی نہیں تو میں کیوں کسی کے سامنے ایسی کوئی بات کروں گا۔ آپ کو حق ہے جس مرضی کے ساتھ گھومیں پھریں، یہ آپ کی لائف ہے جیسے مرضی جئیں۔ آپ نے اپنے معیار بدل دیے ہوں گے، میں نے کبھی اپنا معیار نہیں بدلا اور نہ اس سے نیچے آتا ہوں۔ آپ میرے لیے بس ایک کلاس فیلو ہیں، صرف اور صرف ایک عام سی کلاس فیلو جیسے باقی سب ہیں، بالکل ویسے ہی۔ اس سے زیادہ نہ کبھی تھیں اور نہ ہی ہیں۔ سمجھیں آپ؟" اس کی نظروں سے نظریں ملائے، کچھ برہمی سے، کچھ شکستہ خوردہ ہو کر، کچھ چوٹ کھائے ہوئے، کچھ ٹوٹے اعتبار اور ٹوٹے دل سے اس نے وہ سب کہا اور ایسے الفاظ میں کہا جو اسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ لیکن ان الفاظ میں، اس لہجے میں اتنی ہتک تھی کہ آئینور فاطمہ گل کے گال دہکنے لگے۔ دل کیا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ کاش کہ زمین پھٹ ہی جاتی اور وہ کسی کو نظر نہ آتی۔

وہ اس سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ تمہاری کوئی حیثیت ہے ہی نہیں اور تم یہاں کیا حیثیت جتانے آئی ہو۔ وہ اسے یہ کہنا چاہتا تھا کہ اپنی شکل آئینے میں جا کر دیکھو اور سوچو کہ تم میں ایسا کیا ہے کہ میں تمہیں اہمیت دوں گا جب میں نے کلاس کی کسی دوسری لڑکی کو کبھی اہمیت نہیں دی تو۔ وہ اس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ خواہ مخواہ کس خوش فہمی میں مبتلا ہو رہی ہے، وہ تو کبھی اس کے بارے میں سوچتا بھی نہیں ہے۔ وہ اس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ معیار سے گر چکی ہے اسی لیے نجانے کس کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے اور ایسی گری ہوئی لڑکی سے محبت اس کا معیار نہیں ہے۔ نہیں وہ اس سے یہ سب کہنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس سے یہ سب کہہ چکا تھا۔

آئینور نے تھوک نگلا۔ دل میں بہت درد اٹھا۔ آنکھوں میں شدید جلن ہوئی لیکن اس نے آنکھوں کی نمی کو روکا۔ منہ سے بلند ہونے والی سسکی کو روکا۔ سامنے کھڑا وہ شخص اس کو دو کوڑی کا کر چکا تھا۔ اس نے خود کو دو کوڑی کا ثابت نہیں کرنا تھا۔ اس کے پاس اپنا نسوانی پندار ہی تو سب کچھ تھا جس پہ آنچ تو آ ہی چکی تھی لیکن وہ اسے پاش پاش نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ اسے اپنی ذات کا غرور سنبھالنا تھا۔ اپنے وقار کو قائم رکھنا تھا۔

"سمجھ گئی......" اس نے تیزی سے پلکوں کو جھپکا۔

"سوری......" بہ مشکل اس نے کہا اور وہیں سے تیزی سے پلٹی۔

کتنوں نے یہ سب سنا ہو گا، کتنوں نے دیکھا ہو گا وہ نہیں جانتی تھی۔ اسے بس یہ لگا کہ سارا زمانہ اس پہ ہنس رہا ہے کیونکہ وہ ایک شخص کے ہاتھوں ہتک اٹھا چکی تھی۔ اس شخص کے ہاتھوں جس پہ کبھی دل بے اختیار ہوا تھا۔ کیوں ہوا تھا، اسے افسوس ہوا۔

تیزی سے گیٹ کی طرف جاتی آئینور فاطمہ گل کی آنکھ سے قطرہ ٹپکا اور گھاس میں جذب ہو گیا۔ دوسرا ٹپکا اور اس آستین میں جذب ہوا، جس سے اس نے گال کو رگڑا تھا۔ تیسرا قطرہ نہیں ٹپکا تھا۔ وہ اس کے دل پہ وہاں گرا تھا جہاں کبھی وہ شخص بسا تھا اور اب اس قطرے نے جا کر اس دروازے کو ہمیشہ کے لیے بند کر کے سیل کر دیا تھا تاکہ وہاں سے کسی جذبے کا گزر نہ ہو۔

محبت کا وہ باب جو کبھی کھلا تھا، کبھی نیم وا ہوا تھا، وہ باب اب بند ہو گیا تھا۔

زمین نہیں پھٹی تھی، وہ اس میں نہیں دھنسی تھی لیکن دنیا کی نظروں سے آئینور فاطمہ گل پھر ایسی اوجھل ہوئی کہ پھر کبھی کسی کو دکھائی نہیں دی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

جویریہ مریم

نسبت

"بھئی ہم نے اپنے اسامہ کا نکاح ایسے نہیں کرنا جیسے سب لوگ کر دیتے ہیں۔ شادی ہالوں میں یا وہاں جہاں ٹینٹ لگا کے بارات کا انتظام کیا ہوتا ہے۔ ہم تو بھئی مسجد ابراہیم لاہور میں نسبت لینے جائیں گے بزرگوں کی۔ ایسے اس نکاح کے ساتھ برکت اور عافیت جڑ جاتی ہے۔ لوگوں کے گھروں میں آئے دن جو جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں ناں شادی کے فوراً بعد تو بس وہ اسی کا نتیجہ ہے کہ لوگ ایسی باتوں پہ دھیان نہیں دیتے۔ اور عام جگہوں پہ بیٹھ کے عام سے مولویوں سے نکاح پڑھوا لیتے ہیں۔ بھئی نسبت لینی چاہیے بزرگوں کی۔ لوگ ناچ، گانا شروع کر دیتے ہیں۔ شادیوں میں اور نتیجہ فوراً لڑائی، جھگڑوں اور بے سکونی کی شکل میں سامنے آنا شروع ہو جاتا ہے۔"

ابا نے تقریر ہی کر ڈالی تھی فخریہ لب و لہجہ میں اور حقہ گڑگڑانے لگے۔

"ہاں، ہاں کیوں نہیں اللہ خیر رکھے ایسا ہی ہوگا۔"

اماں نے خوشی سے لبریز لہجے میں ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ تب ہی اسامہ کان سے موبائل لگائے گھر میں داخل ہوا تھا۔ ڈھیلے ڈھالے سے ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس ہنستا مسکراتا۔ وہ پھپو کی چھوٹی بیٹی نمرہ سے بات کر رہا تھا۔

"میں ادھر بازار آیا ہوں۔ تم لوگوں سے بس دس منٹ کے فاصلے پر ہیں ہم، بازار میں ابا اماں بھی ساتھ ہیں۔"

"مخول کی عادت نہیں جائے گی اس کی ذرا برنہ ہو تو۔"

اماں، ابا کی طرف دیکھ کے ہنسی تھیں۔ ابا بھی مسکرا دیے۔ اسامہ نے اسپیکر کھول دیا تھا۔

"لو اتنے قریب آئے ہوئے ہیں آپ لوگ تو آ جائیں ہمارے گھر بھی..... شادی کی شاپنگ کر رہے ہوں گے ہے ناں؟" نمرہ سچ سمجھ رہی تھی۔

"ہاں، ہاں شادی کی شاپنگ کے لیے ہی ......آں یہ بتاؤ کہ پکایا کیا ہے تم لوگوں نے؟ ہم چائے ہی نہیں کھانا بھی......"

"ہم نے آلو لگائے ہیں۔" نمرہ اس کی بات کاٹ کر فوراً بولی تھی۔

اماں اور ابا مسکرا رہے تھے۔

"لو اب بھلا ہم آلو کھانے آئیں گے۔ بھئی ہم نہیں آ رہے۔ ہم تو ادھر سے ہی واپس جا رہے ہیں۔ آلو کھانے ہیں تو بندہ گھر میں بھی کھا سکتا ہے مہمان بن کے جائے تو بس گوشت ہی ہونا چاہیے۔" اسامہ نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا تھا۔ اماں، ابا ہنس پڑے تھے۔

"کیوں مخول پہ مخول کیے جا رہا ہے، لا ادھر دے میں بھی بات کر لوں۔" اماں نے ہنستے ہوئے اس سے موبائل لے لیا تھا۔

☆☆☆

چند ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اماں نے نند کو بتایا کہ وہ کس شان سے اسامہ کا نکاح ابراہیم مسجد میں کریں گے اور نسبت لیں گے بزرگوں کی۔ فرداً فرداً تقریباً سب رشتہ داروں کو بتایا گیا کہ وہ عام طریقے سے نہیں بلکہ خاص طریقے سے نکاح پڑھوائیں گے اپنے اسامہ کا۔ عام جاہل لوگوں کی طرح ناچ گانا کرتے کرتے عام مولوی کو بلوا کر نکاح نہیں پڑھوائیں گے۔ مانو دھوم مچا کے رکھ دی تھی اماں ابا نے۔ نسبت، نسبت کی گردان نہ تھمتی تھی۔

سب رشتہ داروں کو ایک خاص قسم کا اشتیاق ہو رہا تھا کہ کیا کرتے ہیں یہ لوگ، کیا شان ہو گی نسبت لینے کی؟ سب کو تنقید کا نشانہ بنائے رکھا تھا ابا نے کہ تم لوگوں نے کیسے عام اور بے ڈھنگے طریقے سے اپنے

بچوں کے نکاح کردیے تھے۔

☆☆☆

انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئی تھیں۔ اور ابا گردن اکڑائے سب رشتے دار مردوں کو ہمراہ لیے ابراہیم مسجد پہنچ گئے تھے۔ مگر وہاں جا کے پتا چلا کہ ابا نے تو وہاں کی قاری عالم سے بات تک نہیں کی ہوئی تھی بس ویسے ہی اٹھ کے چلے گئے تھے۔ مسجد کا امام تو ادھر موجود بھی نہیں تھا کسی وجہ سے۔ گاؤں کی مسجد کا امام بھی دور پار کی رشتہ داری کی وجہ سے ان کے ساتھ تھا۔ اسی نے نکاح پڑھایا اور چھوہارے کھانے کی باری آئی تو پتا چلا کہ ابا صاحب چھوہارے لائے ہی نہیں تھے۔

"بھئی نسبت لینے کے چکروں میں بھول گیا تھا میں۔" ابا نے بغیر شرمندہ ہوئے وجہ بتائی تھی۔

نکاح میں بس وہ ہی لوگ موجود تھے جو ساتھ آئے تھے۔ نکاح ہوا اور وہ مسجد سے باہر نکلے تو ڈھول والے باہر منتظر کھڑے تھے۔ جو ابا نے انوائٹ کیے ہوئے تھے پھر بس وہ ڈھول ڈھما کا ہوا کہ کسی کو نہ کچھ سنائی دے رہا تھا نہ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا۔

"اوئے حمزہ...... ناچ آگے آ کے۔ بڑے بھائی کی خوشی میں شامل ہو۔ اوئے تیمور تو کہاں مر گیا ہے تجھے اچھا خاصا ناچنا آتا ہے۔" ابا اپنے چھوٹے بیٹوں پہ غصہ ہو رہے تھے۔ وہ بھائی کی خوشی میں بھنگڑا شروع کر چکے تھے اور ساتھ ساتھ ابا بھی۔

سارے رشتہ دار انگلیاں دانتوں میں دبائے کھڑے اس منظر کو دیکھ رہے تھے، حیران پریشان سے۔ کسی کو غصہ آ رہا تھا کسی کو ہنسی اور کچھ خاموشی دیکھے جا رہے تھے بس۔

اس کام سے فارغ ہو کر ابا کو ٹائم ملا تو وہ فخر سے گردن اکڑائے سب کے درمیان آ کھڑے ہوئے تھے۔

"بھئی نسبت بہت بڑی چیز ہوتی ہے۔ یہ سمجھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں ہر بندہ نہیں۔ بس کرم ہے اللہ کی ذات کا کہ ہمیں نسبت دلوادی ابراہیم مسجد کی۔"

"بالکل بالکل۔" سب نے معنی خیز مسکراہٹوں اور نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا اور ابا خوش!

☆☆



مہوش افتخار

دامنِ سحاب

اکتیسویں قسط

پشت پہ ہاتھ باندھے اسفند کے قدم مسلسل کمرے کا طول و عرض ناپ رہے تھے۔ بے چینی اس کے روم روم سے ہویدا تھی۔ بلکہ اب تو یہ اضطراب، یہ وحشت مستقل طور پہ اس کی روح میں ٹھکانہ کر گئی تھی۔ نہ دن کو قرار تھا نہ رات کو سکون۔ سوچوں کے خارزار سے اٹا اذیت اور صدمے کا ایسا لق و دق صحرا تھا جس میں وہ پچھلے تین دن سے تنہا کھڑا جل رہا تھا۔ دور تک نہ کوئی سایہ تھا اور نہ ہی کسی کے ہونے کا احساس۔ بس بے وفائی اور بے مہری کی چلچلاتی ہوئی دھوپ تھی جس نے اس کا پور پور جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ نہ نیند بچی تھی اور نہ بھوک پیاس کا کوئی احساس۔ وہ جیسے اپنی ہی پرچھائیں میں تبدیل ہو کر رہ گیا تھا۔

اس کی حالتِ زار نے زمرد کے ساتھ ساتھ اس کی ماں، بہنوں کو بھی تڑپا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اس کا ہر درد، ہر غم سمیٹنے کے لیے بے چین ہو گئی تھیں۔ لیکن ہر زخم سلنے کے لیے نہیں ہوتا۔ نہ ہی ہر درد بانٹا جا سکتا ہے۔ کچھ صلیبیں انسان کو تنہا ہی اپنے شانوں پر اٹھانی پڑتی ہیں اور ملک اسفندیار بہادر کے نصیب میں بھی دھوکے اور فریب، ذلت و رسوائی کی ایسی ہی ایک صلیب لکھ دی گئی تھی۔





سارے خاندان میں اس کی اور سلویٰ کی طلاق کی خبر پھیل چکی تھی۔ ہر ایک کی زبان پر یہی قصہ تھا۔ ہر ایک کی زبان پر یہی بات تھی۔ جس کے علم میں جو بھی آیا تھا، جتنا بھی آیا تھا وہ اسے نمک مرچ لگا کر آگے پہنچانے پہ تلا ہوا تھا۔ کیونکہ بڑے سرکار نے سب گھر والوں کو اس بارے میں بات کرنے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے اور اپنے گھرانے کی مزید رسوائی نہیں چاہتے تھے۔ لیکن پھر بھی باتیں نا صرف نکلی تھیں بلکہ خوب اچھالی بھی جا رہی تھیں۔ ان کے منہ پر نہ سہی پیٹھ پیچھے ہی سہی۔

گاؤں میں بھی ہر طرف چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ اسفند کے لیے یہ تمام حالات بے حد اذیت ناک اور صبر آزما تھے۔ ایسے میں زمرد کی باتوں سے اس کے دل میں جو ملال نے اک چنگی سی بھری تھی، وہ غصے اور نفرت کی شدید لہر تلے دب کر، اپنا احساس کھو چکی تھی۔ سلویٰ جیسی بے حس اور بے رحم عورت کے لیے اب اس کے اندر اور باہر سوائے جلتے ہوئے انگاروں کے اور کچھ نہیں بچا تھا جس نے انتہائی سنگ دلی سے اپنی ہی پیدا کردہ اولاد کی پوری زندگی پر اک سوالیہ نشان کھڑا کر دیا تھا۔ اسے ایک ایسی ماں کا بیٹا ہونے کا اعزاز بخش دیا تھا جو اپنے یار کے ساتھ اپنی رات رنگین کرتے ہوئے سرے عام پکڑی گئی تھی۔ جس کی رسوائی کا تماشا پوری حویلی نے دیکھا تھا اور جس پر اب ایک زمانہ ہنس رہا تھا۔

اسفند کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اس منحوس دن کو کسی سیاہ باب کی طرح اپنی زندگی سے نکال پھینکے جس نے اس سے اس کی عزت، اس کا مرتبہ، اس کی شان، اس کا سکون ہر چیز چھین لی تھی۔ جس نے اس کی ہنستی بستی زندگی کو ایک بھیانک خواب میں تبدیل کر دیا تھا۔ سب گھر والوں کا اصرار تھا کہ وہ کچھ عرصے کے لیے زمرد اور فخر کو لے کر اس ماحول سے دور چلا جائے۔ لیکن اسفند نے ان کی بات کو سختی سے رد کر دیا تھا۔ حالات سے گھبرا کر بھاگنا بزدلوں کا شیوہ ہوا کرتا ہے اور بزدلی اس کی سرشت میں شامل نہ تھی۔ وہ جان تو دے سکتا تھا لیکن اپنے ہی علاقے سے مجرموں کی طرح منہ چھپا کر نکلنا اسے کسی طور گوارا نہ تھا۔

اس نے اپنے دل میں اپنی غلطی کو سدھارنے کا تہیہ کیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ سلویٰ کو تلاش کر کے اسے سرعام گولیوں سے چھلنی کرے گا۔ وہ اپنی غیرت کی جانب اٹھنے والی ہر انگلی توڑ کر رکھ دے گا تاکہ دوبارہ کوئی مائی کا لال اس کی ذات یا اس کے گھرانے کے بارے میں اپنی زبان کھولنے کی جرأت نہ کر سکے۔ اس کے حکم پر اس کے بندے جگہ جگہ عاشی اور اس کے شوہر کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ اس وقت بھی وہ اپنے محافظوں اور قریبی بندوں کے ساتھ اپنے ڈیرے پر موجود تھا جب ملازم نے آ کر اسے اس کے خاص آدمی 'سلطان' کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ اس کے قدموں سے لپٹا اضطراب کا بھنور اپنے آپ ساکت ہو گیا تھا۔

"بھیجو اسے۔" سپاٹ سے لہجے میں کہتا وہ صوفے پر جا بیٹھا۔ دل کی بے چینی اچانک ہی دو چند ہو گئی تھی۔

چند لمحوں بعد ایک اونچا لمبا انتہائی خطرناک سے حلیے والا آدمی دروازے میں نمودار ہوا تو اسفند کی نگاہیں بے اختیار اس کے بڑی بڑی مونچھوں سے سجے چہرے پر جا ٹھہریں۔

"سلام سرکار۔" وہ مؤدب سا اندر چلا آیا۔

"وعلیکم سلام۔ کیا خبر ہے؟" اسفند نے صوفے کی پشت پہ بازو پھیلاتے ہوئے ٹانگ پر ٹانگ جمائی۔ سلطان نے ایک جھجکتی ہوئی نظر سامنے بیٹھے مالک پر ڈالی، جو منتظر نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کا حلق اچانک ہی خشک پڑ گیا۔

"کج۔ کج پتا نئی (نہیں) لگ سکا سرکار۔ ہم نے پورا علاقہ چھان مارا لیکن ان دونوں کا کہیں کوئی سراغ نئی ملا۔" وہ نادم سا بولا تو اسفند کے پیروں سے لگی اور سر پہ بجھی۔ وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا۔

"کیا بکتا ہے؟" وہ گرج کر بولا۔ "زمین کھا گئی انہیں یا آسمان نگل گیا؟ میں نے تجھے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک ہر قیمت پر چاہیے۔ پھر تیری جرأت کیسے ہوئی [illegible] لٹکائے چلے آنے کی؟"

اس کی آنکھوں سے لپٹیں سی نکل رہی تھیں۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ سامنے کھڑے شخص کی گردن اڑا دے۔
سلطان کو اپنی پیشانی پر پسینہ پھوٹتا محسوس ہوا۔ وہ بے اختیار ہاتھ باندھ گیا۔
"معاف کر دیں حضور۔ یقین جانیں میں نے کوئی کسر نئی چھوڑی۔ ان کے پرانے گھر سے لے کر ان کے رشتے داروں، آنڈ گوانڈ (آس پاس، ہمسائے) یار دوستوں تک ہر جگہ دیکھ لیا، سب سے پوچھ لیا۔ حتیٰ کہ باغ بغیچے (باغیچے)، کھیت کھلیان بھی چھان مارے۔ لیکن کوئی سراغ نئی ملا۔ کج پتا نئی لگ سکا۔ سوائے ایک گل (بات) کے۔ اب پتا نئی کہ وہ سچ ہے یا بتانے والا یونہی بک رہا ہے۔ لیکن گل (بات) ہے بڑی عجیب۔"
"کیا؟" اسفند نے تنے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔
"وہ پوشٹ ماشٹر (پوسٹ ماسٹر) کا پتر قادر بتا رہا تھا کہ کل شام وہ کسی کام سے نال آلے پنڈ (ساتھ والے گاؤں) گیا تھا۔ اور وہاں اس نے عاشی کے شوہر، ارشاد کو بخت چوہدری کے ڈیرے میں جاتا دیکھا تھا۔ یا اسے لگا تھا کہ وہ عاشی کا شوہر ہے۔ کیونکہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ تھا اور سورج وی ڈب (ڈوب) رہا تھا۔"
"کیا؟ بخت چوہدری؟" اسفند نے بری طرح چونکتے ہوئے آنکھیں سکیڑیں۔
"جی سرکار۔"
"لیکن بخت چوہدری کا عاشی کے شوہر سے کیا کام؟" وہ پیشانی پہ بل لیے الجھا الجھا سا بولا۔
"یہی تو میری سمجھ میں بھی نئی آرہا حضور۔ لیکن جس طرح وہ میاں بیوی راتوں رات بی بی کو لے کر یہاں سے غائب ہوئے ہیں۔ وہ کوئی مامولی گل (معمولی بات) نئی۔ کج نہ کج گڑبڑ ضرور ہے سرکار۔ انہیں کسی نہ کسی کی مدد ضرور حاصل ہے۔"
وہ کھٹکتے ہوئے لہجے میں بولا تو اسفند کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ وہ آنکھوں میں سوچ کے گہرے سائے لیے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا گیا۔ سلطان ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہ واقعی ہی بڑا عجیب وغریب انکشاف تھا جس نے نا صرف اسے حیران کر دیا تھا بلکہ ایک پل کے لیے اس کا ذہن بھی بالکل ماؤف ہو گیا تھا۔
"اس عاشی کو حویلی میں کون لے کر آیا تھا؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے اپنی پرسوچ نظریں اٹھائیں۔
"ماسی صغریٰ۔"
"ہوں......" اسفند نے ہنکارا ابھرا۔ اس کا ذہن بہت تیزی [illegible] حکمت عملی [illegible] رہا تھا۔ "ماسی صغریٰ کو فوراً [illegible] یہاں لے کر آؤ۔ ساتھ [illegible] اس کے بیٹوں یا شوہر میں سے جو بھی ہاتھ لگے اسے بھی اٹھاؤ۔ [illegible] اپنے پیاروں کی جان کو تو ضرور زبان کھولے گی۔" اس کا لہجہ نہایت سرد اور بے رحم تھا۔
سلطان کی آنکھوں میں چمک در آئی۔
"ابھی حاضر کرتا ہوں سرکار۔" وہ مستعدی سے کہتا پلٹ کر باہر نکل گیا۔
اسفند کی انگلیاں سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئیں۔ اگر یہ بات سچ تھی تو سلوٰی کی ایک غیر مرد کے ساتھ جان پہچان اور اس کے گھر میں موجودگی صرف ایک ہی بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ اسفند کا مجرم، اس کا گنہگار وہیں کہیں تھا۔ اور اگر ایسا تھا تو آج بخت چوہدری اور اس کی نسل کو اس کے اعتاب سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔
وہ غراتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی رگ رگ میں جیسے آگ سما گئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا پورا وجود کسی سرخ آندھی کی لپیٹ میں آ گیا ہو جس نے اس کے گرد موجود ہر منظر، ہر شے کو خون میں نہلا دیا تھا۔ وہ سختی سے لب بھینچے کمرے میں چکرانے لگا۔ انتظار کے یہ لمحے جیسے اس کے لیے سزا بن گئے تھے۔ نتیجتاً جس وقت صغریٰ کے شوہر، شکور، کو سلطان نے لا کر اس کے قدموں میں پھینکا تھا اسفند خود پہ سے ہر اختیار کھو بیٹھا تھا۔ اس کی کاری ضربوں کے آگے نہ شکورے کی چیخیں بند باندھ پائی تھیں اور نہ ہی صغریٰ کی آہ و فغاں۔ وہ اسے بری

طرح پیٹتا رہا تھا یہاں تک کہ ماسی اپنے شوہر کی جان بخشی کو بلکتی ہوئی اس کے پیروں میں آ پڑی تھی۔

☆☆☆

"اے لے لے میری پیاری سی شہزادی۔ پیاری سی گڑیا۔ روتے نہیں ہیں بیٹا۔" شاہ مخدوم نے ننھی منی سی عنایہ کو بازوؤں میں جھلاتے ہوئے اسے چپ کروانے کی ایک اور کوشش کی۔ "اچھا یہ دیکھو۔ یہ کیا ہے؟"

انہوں نے پاس پڑی تسبیح اٹھا کر اس کے سامنے ہلائی تو وہ روتے روتے اچانک چپ ہو گئی۔ اگلے ہی لمحے اس نے ہاتھ بڑھا کر ہلتی ہوئی تسبیح کے دانوں کو تھام کر منہ میں لے لیا تو شاہ صاحب کے لبوں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ اس کے ساتھ توتلی زبان میں باتیں کرتے ہوئے کھیلنے لگے جس کا جواب وہ غوں غاں کی آوازوں کے ساتھ خوب ہاتھ پاؤں چلا کر دے رہی تھی۔ تب ہی لاؤنج کا داخلی دروازہ کھلا اور جرار اور ہادی آگے پیچھے چلتے اندر داخل ہوئے۔ عنایہ بی بی کو اپنے پردادا کی گود میں لاڈ اٹھواتا دیکھ کر دونوں دہلیز میں ہی رک گئے۔ یہ عنایہ صاحبہ کا ہی کمال تھا جو بڑے غصے سے آقا جان کی گود میں استراحت فرماتی پائی جاتی تھیں ورنہ شاہ مخدوم اور بچے؟

دونوں بھائیوں نے پلٹ کر ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے اندر چلے آئے۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔" شاہ صاحب نے سر اٹھایا۔

"ویسے یہ کتنی بڑی زیادتی ہے ناں آقا جان۔ دادا آپ ہمارے ہیں لیکن ہمیں تو بچپن میں آپ نے کبھی اپنے نزدیک تک پھٹکنے نہیں دیا تھا۔ کھانے کی میز تک پر آپ کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی اور اب ان محترمہ کو کیسے آپ اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں۔ کیوں؟ اس میں کون سے ایسے سرخاب کے پر لگے ہیں جو ہم بے چاروں کے پاس نہیں تھے؟" ہادی جلے دل کے پھپھولے پھوڑتا ہوا بولا تو شاہ صاحب مسکرا دیے۔

"برخوردار، اس میں سرخاب کے پر نہیں لگے بلکہ یہ خود پورا سرخاب ہے۔ تم اگر بچپن میں اتنے پیارے ہوتے تو میں تمہیں بھی یونہی اٹھائے اٹھائے پھرتا۔" انہوں نے مزے سے عنایہ صاحبہ کے چاچو کی بے عزتی کر ڈالی تو جرار بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ہادی نے خفگی سے دادا کو دیکھا۔

"دس از ناٹ فیئر آقا جان۔ میں یہ بے عزتی کبھی نہیں بھولوں گا۔" اس نے دھمکی جاری کی۔

"اچھی بات ہے۔ اب کم از کم میری چاندی کی گڑیا کا کبھی مقابلہ نہ کرو گے۔"

وہ پروا کیے بنا گویا ہوئے تو جرار نے ہنستے ہوئے بھائی کے شانے پہ ہاتھ مارا۔

"چلو جی چھٹی ہوئی۔"

"ایسے ہی چھٹی ہوئی......"

وہ تلملا کر پلٹا۔ "میں بھی مقابلے میں ایسے ایسے سرخاب لاؤں گا ناں کہ سب دیکھتے رہ جائیں گے۔"

وہ چمک کر بولا تو جرار کے ساتھ ساتھ اب کے شاہ مخدوم بھی قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ انہیں یوں کھل کر ہنستے ہوئے شاذ و نادر ہی کبھی کسی نے دیکھا تھا۔ ان سب کی جاندار ہنسی حیا اور زینب کو بھی لاؤنج تک کھینچ لائی۔

"کیا ہوا؟ یہ آپ سب کیوں اتنا ہنس رہے ہیں؟" حیا آنکھوں میں خوش گوار حیرت لیے بولی۔

"کچھ نہیں بیٹا، یہاں بس سرخاب لائے جا رہے ہیں۔"

شاہ صاحب آنکھوں میں آئی نمی صاف کرتے ہوئے شرارت سے بولے تو ہادی اور جرار کے چھت پھاڑ قہقہوں نے بے چاری عنایہ کو ڈرا دیا۔ حیا نے مسکراتے ہوئے سر جھٹکا اور آگے بڑھ کر روتی ہوئی بیٹی کو آقا جان کی گود سے لے لیا۔

لڑکوں کی ہنسی تھی کہ رکنے میں نہیں آ رہی تھی تب ہی لاؤنج کے دروازے پر کھٹکے سا ہوا اور اگلے ہی پل دروازہ کھول کر حاتم اور سبحان گردیزی اندر داخل ہوئے۔ سب کی نگاہیں ایک ساتھ ان دونوں پر آٹھہریں۔

"یہ آپ دونوں بھائی اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے؟" جرار نے ہلکے پھلکے لہجے میں پوچھا۔ "میں نے کتنی بار آپ کے نمبرز......"

اسے ایک جھٹکا سا لگا اور وہ اپنی بات مکمل کرنا بھول گیا۔ چہرے پہ چھائی خوشگواری اور لبوں پہ کھیلتی مسکان لمحوں میں دھواں بن کر ہوا کا حصہ بن گئی۔ وہ دم سادھے آنکھیں پھاڑے اپنے باپ اور چچا کے پیچھے نمودار ہونے والے چہرے کو دیکھتا رہ گیا جو اسے اپنے کسی بھیانک خواب کا حصہ لگ رہا تھا۔ جسے وہ نجانے کب کا فراموش کر چکا تھا اور جسے وہ اپنی زندگی میں دوبارہ کبھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

"یہ۔یہ......" شاہ مخدوم پتھرائے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کی بے یقین نگاہیں اپنی دونوں بہوؤں کے سہارے کھڑے بے جان اور شکستہ حال سے وجود پر جمی تھیں۔ جس پر انہیں اپنی پوتی کا گمان ہو رہا تھا۔ اس پوتی کا جس نے ان کے گھرانے کو رسوائیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیلنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ جو ان کی عزت، ان کی نیک نامی کی قاتل تھی۔ اور جسے وہ زندہ زمین میں گاڑ دینے کے خواہش مند تھے۔

"جی آقا جان، ہماری، ہماری سلویٰ لوٹ آئی ہے۔"

حاتم گردیزی جذبات سے پُر آواز میں بولے تو شاہ مخدوم کو لگا جیسے کسی نے ان کی غیرت پر پاؤں رکھ کر پوری طاقت سے دبا دیا ہو۔ ان کا چہرہ لہو رنگ ہو گیا اور انگلیاں اس سختی سے ہتھیلیوں میں پیوست ہوئیں کہ ہاتھوں کی رگیں تک ابھر آئیں۔

"تمہاری اتنی جرأت کہ تم اس ناپاک و نامراد لڑکی کو اٹھا کر میرے گھر لے آئے؟" وہ آنکھوں میں شعلے لیے بھڑک کر بیٹے کی جانب بڑھے۔ "یہ بے غیرتی بھرا قدم اٹھانے سے پہلے تم مر کیوں نہ گئے حاتم!" الفاظ تھے یا سنسناتا ہوا تیر۔ حاتم صاحب کا چہرہ مارے ضبط کے سرخ ہو گیا۔

"مر تو میں اسی دن گیا تھا آقا جان، جس دن آپ نے میرے پیروں میں مصلحتوں کی زنجیر باندھی تھی۔ مجھے اپنے دشمنوں کی اینٹ سے اینٹ بجانے سے روکا تھا۔" وہ تلخی سے بولے تو شاہ مخدوم کے پیروں سے لگی اور سر پہ بجھی۔

"بکواس بند کرو! اور اس ذلیل لڑکی کو لے کر ابھی کے ابھی یہاں سے چلے جاؤ۔ میرے گھر میں ایسی آوارہ اور بدچلن کی کوئی جگہ نہیں۔"

"معذرت کے ساتھ آقا جان لیکن سلویٰ کہیں نہیں جائے گی۔ اس گھر پہ اس کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ باقی سب کا۔" باپ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ان کا لہجہ بے حد قطعیت لیے ہوئے تھا۔

"اسے اندر لے جاؤ۔ اس کی طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں۔" وہ اچانک بیوی اور بھابھی کی جانب پلٹے تو شاہ صاحب کا ضبط جیسے جواب دے گیا۔

"اپنی حد میں رہو حاتم! مت بھولو کہ ابھی بھی یہ گھر میرا ہے۔"

ان کا کرب زدہ لہجہ پہ حاتم گردیزی کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ وہ چند لمحے کھڑے بے تاثر نظروں سے باپ کا چہرہ دیکھتے رہے اور پھر ایک جھٹکے سے پلٹ کر دروازے کی جانب بڑھ گئے۔

"چلو۔"

"ل۔ لیکن ہم کہاں جا رہے ہیں؟" پریشان کھڑی طیبہ کے منہ سے اچانک نکلا۔

"ہم سب ابھی کے ابھی یہ گھر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔"

"کیا؟" سب ہی بھونچکے کھڑے رہ گئے۔

حاتم صاحب پلٹے اور بنا کسی کی جانب دیکھے آگے بڑھ گئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ان کے قدم دہلیز پار کرتے کسی نے ان کا بازو پیچھے سے تھام لیا۔ حاتم گردیزی تیزی سے پلٹے اور اپنے سامنے بیٹے کو کھڑا دیکھ کر وہ

ایک پل کو تھم سے گئے۔

"کیوں؟ کیوں کر رہے ہیں آپ ایسا؟" جرار نے شکایت آمیز نگاہوں سے باپ کو دیکھا۔ "اور وہ بھی اس لڑکی کے لیے؟" اس نے نفرت سے سلویٰ کی جانب اشارہ کیا۔ "جس نے اس گھر کی، خاص کر آپ کی اور آپ کے بیٹے کی عزت کو داؤ پر لگانے سے پہلے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا۔ جس نے مجھ پر ایک انجان اور غیر شخص کو فوقیت دی۔ جس نے بھرے خاندان میں میرا تماشا بنا دیا۔ مجھے پوری دنیا کے سامنے رسوا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اور آپ اس کی خاطر اپنا گھر چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ کیوں؟ کس لیے؟" وہ غصے سے بولا۔ "کیا آپ کو مجھ سے کوئی ہمدردی، کوئی محبت نہیں؟ کیا میں آپ کی اولاد نہیں؟" اس کا چہرہ شدتِ جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔

حاتم صاحب کی آنکھوں میں درد آ ٹھہرا۔

"کیوں نہیں۔ تم میری آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سکون ہو۔ تم مجھے کتنے عزیز ہو یہ مجھے تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن سلویٰ بھی میری اپنی بچی، میرا اپنا خون ہے بیٹا، اور میں اسے اس حال میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔"

"اس کا یہ حال اپنے ہاتھوں ہوا ہے پاپا۔ ہم میں سے کوئی اس کا ذمہ دار نہیں۔" جرار کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کر گزرے۔

حاتم صاحب کی آنکھوں میں موجزن درد کچھ اور گہرا ہو گیا۔ انہوں نے ایک شکایت بھری نظر اپنے آقا جان پر ڈالی۔

"ہم ہی ذمہ دار ہیں بیٹا۔ اس نے ہمارا ہی بویا کاٹا ہے۔" وہ بوجھل سے لہجے میں بولے تو جرار کو اک جھٹکا سا لگا۔

"کیا مطلب؟" اس نے ٹھٹک کر باپ کا چہرہ دیکھا۔ باقی سب بھی بری طرح چونک گئے۔ ماسوائے ایک شاہ صاحب کے۔ جن کی رنگت پل بھر میں متغیر ہوئی۔ وہ تیزی سے آگے آئے۔

"خاموش ہو جاؤ حاتم۔ خبردار جو ایک لفظ بھی مزید کہا تو۔"

حاتم گردیزی کی نگاہوں میں تاسف پھیل گیا۔ انہوں نے ملال سے شاہ مخدوم کو دیکھا جو اب بھی ساری حقیقت سب کو بتانے سے گریزاں تھے۔ جو اب بھی سارا الزام صرف سلویٰ پر دھر دینا چاہتے تھے۔ حالانکہ جو کچھ بھی ہوا تھا اس میں وہ سب کہیں نہ کہیں شریک جرم تھے۔ پھر سزا صرف سلویٰ کو کیوں دی جاتی؟ کیوں ساری ذلت، ساری لعن طعن اسی کے حصے میں آتی؟ کوئی نہ کوئی حرفِ ملامت، تھوڑی بہت ندامت تھوڑا سا احساسِ جرم ان سب کے حصے میں بھی تو آنا چاہیے تھا ناں۔ وہ چند پل لب بستہ سے باپ کو تکتے رہے اور پھر طیبہ کی جانب پلٹے۔

"اسے اپنی طرف لے جاؤ۔"

"لیکن......"

"میں نے کہا لے کر جاؤ۔" وہ سختی سے بولے تو طیبہ کی سہمی ہوئی نظریں سسر پر آ ٹھہریں۔ جو خلافِ توقع کچھ کہنے کے بجائے بیٹے کو غصے سے گھورتے لب بھینچے کھڑے تھے۔

طیبہ لب دبائے پلٹیں اور سلویٰ کو لیے آگے بڑھنے لگیں جو اس تمام عرصے میں مزید نڈھال ہو گئی تھی۔ منیرہ نے تڑپ کر بیٹی کے پیچھے جانا چاہا لیکن حاتم صاحب نے انہیں روک دیا۔

"منیرہ تم یہیں رکو...... حیا بہن کے ساتھ جاؤ۔"

حیا نے ایک نظر شوہر کو دیکھا جس کا چہرہ باپ کے حکم پر تن گیا تھا لیکن وہ خاموش کھڑا رہا تھا۔ حیا کو حوصلہ سا ہوا۔ اس نے سرعت سے آگے بڑھ کر سلویٰ کو تھاما اور ماں کو ساتھ لیے باہر نکل گئی۔ لاؤنج میں گہرا سناٹا چھا گیا یوں جیسے کوئی ذی النفس موجود نہ ہو۔

"کیوں آقا جان، آپ کچھ کہیں گے یا پھر میں بولوں؟" اچانک حاتم صاحب کی سرد و سپاٹ آواز اس

خاموشی میں ابھری تو شاہ مخدوم جیسے چیخ اٹھے۔

"فضول گوئی بند کرو! بہت ہو گیا تماشا۔"

"یہی تو میں بھی کہنا چاہ رہا ہوں کہ بہت ہو گیا تماشا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم سچائی کا سامنا کریں آقا جان۔"

"کیسی سچائی؟ کس چیز کا سامنا؟ آخر آپ لوگ سیدھی بات کیوں نہیں کر رہے؟" سبحان گردیزی جھنجلائے ہوئے سے آگے آئے۔ "بھائی جان، آپ کو میرے سر کی قسم ہے، مجھے بتائیں کہ سلوی آپ کو کیسے ملی؟ کہاں سے ملی اور۔ اور اس کی یہ حالت......" فرط جذبات سے ان کی آواز لرز اٹھی تو وہ لب دبائے بے اختیار نگاہوں کا زاویہ بدل گئے۔

حاتم صاحب کے دل میں اک ٹیس سی اٹھی۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی کے جذبات، ان کے احساسات اور ان کی اذیت کا باخوبی اندازہ کر سکتے تھے جس میں وہ اس پل جلا تھے۔

اسپتال میں سلوی کو اچانک اپنے روبرو پا کر ان کی جو حالت ہوئی تھی وہ ان کے چہرے سے عیاں تھیں۔ وہ کسی پتھر کے بت کی مانند اپنی جگہ پر ایستادہ رہ گئے تھے۔ ایک دم جلد، بالکل ساکت۔ منیرہ تو ماں تھیں۔ کھوئی ہوئی اولاد کو اپنے روبرو پا کے اس کی ہر غلطی بھلا بیٹھی تھیں۔ ان کے تڑپتے دل اور ویران آنکھوں کے لیے یہی بہت تھا کہ مرنے سے پہلے انہیں ایک بار اپنی بچی کو دیکھنے، اسے اپنے سینے سے لگانے کا موقع مل گیا تھا۔ لیکن سبحان گردیزی باپ تھے۔ ایک ایسے باپ جنہیں ان کی زندگی کا سب سے بڑا دھوکا، سب سے بڑا صدمہ کسی پرائے سے نہیں بلکہ ان کی اپنی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی سے ملا تھا۔ وہ بیٹی جو ان کا فخر، ان کا مان اور ان کی جان تھی۔ جس کے لیے انہوں نے ہمیشہ سب کچھ کیا تھا اور آگے بھی بہت کچھ کر سکتے تھے اگر وہ انہیں ایک موقع دیتی تو۔ لیکن اس نے اپنے باپ پہ بھروسا کرنے کے بجائے ایک غیر پر اعتبار کیا تھا۔ اس کی محبت پہ اندھا یقین کیا تھا اور ایک ایسا بہیمانہ قدم اٹھایا تھا جسے کسی بھی حال میں جائز قرار نہیں دیا جا سکتا اور جس نے ان دونوں میاں بیوی کو جیتے جی مار ڈالا تھا، زندہ درگور کر دیا تھا۔

ان کے لیے اپنی عزت، غیرت اور شرافت پہ لگائی گئی اس کاری ضرب کو بھلانا اتنا آسان نہ تھا۔ اس ہزیمت، اس رسوائی اور اس تکلیف کو بھلانا اتنا آسان نہ تھا جو انہوں نے اس روز بھرے خاندان کے درمیان جھیلی تھی۔ اس کمرے کی چار دیواری میں بس گئی تھی جہاں انہوں نے خود کو قید کر لیا تھا کہ وہ خود میں دنیا کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پاتے تھے۔ اس لیے اس اچانک ہونے والے سامنے پر وہ بالکل خاموش ہو گئے تھے۔ ان کا ذہن مکمل طور پہ ماؤف ہو گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بیٹی کی زبوں حالی پر آنسو بہائیں یا اسے کوئی سزا سنائیں۔

اس کا رونا، اس کی چیخیں اور اس کا تڑپنا ان کے سینے میں شگاف ڈال رہا تھا، روح میں حشر برپا کر رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس ان دیکھے شخص کے ٹکڑے اڑا دیں جس نے ان کی منتوں مرادوں سے مانگی گئی بیٹی کا یہ حال کیا تھا۔ لیکن وہ خود پہ ضبط کے کڑے پہرے بٹھائے اپنی برداشت کی آخری حد پر کھڑے رہے تھے یہاں تک کہ حاتم صاحب نے انہیں پکڑ کے بیٹی کے روبرو لا کھڑا کیا تھا۔ انہیں اپنے سامنے پا کے سلوی جیسے دیوانی ہو گئی تھی۔ بے تابی سے ان کے ہاتھ چومتی وہ ان کے سینے سے لگ کر اس وحشت سے دھاڑیں مار مار کر روئی تھی کہ کمرے کے در و دیوار تک ہل گئے تھے پھر بھلا ان کا کمزور اور زخم خوردہ دل کیا معنی رکھتا تھا؟

ان کے بازو اپنے آپ اس کے گرد حصار بنا گئے تھے اور شفیق چہرہ اس کے سر کا بوسہ لینے کو آن جھکا تھا۔ وہ لمحوں میں اس پہ کسی گھنے شجر کی طرح سایہ فگن ہو گئے تھے جو اس کے حصے کی ساری دھوپ، ساری تمازت اور ساری سختی ایک بار پھر خود پہ لینے کے لیے تیار تھا۔ ایسے میں اس نئے پنڈورا باکس نے ان کے تنے ہوئے

اعصاب کو بری طرح جھنجھنا کر رکھ دیا تھا۔ ان کا صبر، ان کا حوصلہ جواب دے گیا تھا اور وہ اپنے بھائی کے روبرو آ کھڑے ہوئے تھے۔

"دلاور ملک اور اس کے بیٹے کا کیا دھرا ہے یہ سب۔" حاتم گردیزی کی بوجھل اور دل گرفتہ سی آواز لاؤنج کی ساکت فضا میں ابھری تو سبحان صاحب کو لگا جیسے انہیں کسی کرنٹ نے چھو لیا ہو۔

"دلاور...... دلاور ملک؟" آنکھیں سکیڑے انہوں نے دھچکے کی سی کیفیت میں بھائی کا چہرہ دیکھا۔ کچھ ایسی ہی حالت پیچھے کھڑیں منیرہ کی بھی تھی جن کی سانس ان کے سینے میں اٹک گئی تھی۔

حاتم گردیزی کے لبوں سے اک تھکی تھکی سی سانس نکلی۔

"ہاں۔ سلویٰ کو بہکانے والا، اسے اپنے خاندان کے خلاف کھڑا کرنے والا کوئی اور نہیں بلکہ دلاور ملک کا بیٹا ملک اسفندیار بہادر ہے۔ اسی خبیث نے اپنے باپ کے ساتھ مل کر ہمارے خلاف یہ گری ہوئی سازش رچائی اور ہماری بچی کو نشانہ بنایا۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولے تو ان دونوں میاں بیوی پہ جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ منیرہ نڈھال سی قریبی صوفے پر گر سی گئیں جبکہ سبحان گردیزی کی کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والی کیفیت ہو چلی تھی۔ ان کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا جبکہ لب اس سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہوئے گویا اب کبھی نہ کھلیں گے۔

جرار کی پریشان نظریں بے اختیار ہادی کی نگاہوں سے جا ٹکرائیں جو اسی کی طرح الجھا ہوا اور حیران کھڑا تھا۔ یہ کیا معاملہ تھا اور یہ کن لوگوں کا ذکر تھا، وہ دونوں اس بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے لیکن انہیں اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ یہ جو بھی تھے انتہائی گرے ہوئے اور گھٹیا لوگ تھے جن کی نہ تو کوئی اخلاقی حدود تھیں اور نہ ہی کوئی خاندانی اقدار۔ ورنہ کوئی مرد اپنی دشمنی میں عورتوں اور بچوں کو گھسیٹنے سے پہلے زمین میں گڑ جانا زیادہ بہتر سمجھتا ہے۔

"آپ...... "سبحان صاحب نے بامشکل تمام اپنے منتشر ہوتے حواس کو سنبھالا۔ "آپ کو یہ سب کیسے پتا چلا؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے اپنے بڑے بھائی کو دیکھا جو اس سوال پہ بے اختیار خاموش سے ہو گئے تھے۔

"مجھے فون آیا تھا۔ دلاور نے اپنی جیت کا اعلان مجھے فون کر کے سنایا تھا۔"

شاہ صاحب کی رعب دار آواز اچانک بلند ہوئی تو سبحان گردیزی کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ حیران سے باپ کی جانب پلٹے۔

"کب؟"

"تمہاری لاڈلی کے کارنامے کے اگلے روز۔"

"اور آپ نے مجھے بتانے تک کی زحمت نہیں کی؟" انہوں نے دھچکے کی سی کیفیت میں ان کا چہرہ دیکھا۔ "کیوں آقا جان؟ کیوں اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی؟ کیوں؟" مٹھیاں بھینچے وہ مارے کرب کے چلا اٹھے تھے۔ شاہ مخدوم کا چہرہ انگارے کی مانند دہک اٹھا۔

"اس لیے کہ میں ایک قیامت کے بعد دوسری قیامت اپنے گھر پہ نہیں توڑ سکتا تھا۔ میں اس بے حیا لڑکی کی خاطر اپنے بچوں کو خون میں نہیں نہلا سکتا تھا۔"

"آپ کے بچے۔" انہوں نے دکھ سے دہرایا۔ "اور میری بیٹی؟ کیا وہ آپ کی اولاد، آپ کا خون نہیں تھی جو آپ نے اسے ظالموں کے شکنجے سے چھڑانا ضروری نہیں سمجھا؟"

"کیسا شکنجہ؟" شاہ صاحب کی پیشانی کے بل گہرے ہو گئے۔ "تمہاری بیٹی کو کسی نے اغوا نہیں کیا تھا بلکہ وہ اپنی رضا، اپنی خوشی سے اس لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگی تھی۔ اس لڑکے کے ساتھ عشق و عاشقی کی پینگیں اس نے خود بڑھائی تھیں۔ اس بدبخت کے کردار کی کمزوری نے ہمارے دشمنوں کے ارادوں کو مضبوطی بخشی۔ ورنہ ان بے غیرتوں کی کیا مجال تھی کہ ہماری دستار کی طرف میلی نظر سے بھی دیکھ جاتے۔" وہ نفرت سے بولے تو سبحان

صاحب اپنی جگہ پر سن ہو گئے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہ سب اپنے باپ کے منہ سے سن رہے تھے۔ ان کے چہرے پہ زردی گھلتی دیکھ کر حاتم گردیزی تیزی سے آگے آئے۔

"خدا کا واسطہ ہے آقا جان بس کر دیں۔ یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔"

"کیوں نہیں؟" وہ ایک جھٹکے سے ان کی جانب پلٹے۔ "بہت شوق ہے ناں تمہیں سچائی کا سامنا کرنے کا۔" انہوں نے ایک قہر آلود نظر بیٹے کے چہرے پر ڈالی۔ "تو پھر اب کس لیے بزدلوں کی طرح آنکھیں اور کان بند کر رہے ہو؟ کیوں اس حقیقت سے نظریں چرا رہے ہو کہ کھوٹ ہمارے سکے میں تھا، کمی ہماری اولاد میں تھی۔"

ان کی بات پہ حاتم صاحب کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ وہ چند لمحے تاسف بھری نظروں سے انہیں دیکھتے رہے اور پھر اک گہری سانس لیتے ہوئے بولے۔

"مانتا ہوں کہ سلویٰ نے جذبات میں آ کر ایک بہت غلط قدم اٹھایا تھا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے آقا جان کہ اسے اس نہج پر پہنچانے والے بھی ہم ہی تھے۔ اپنی اولادوں کے لیے جو فیصلے ہم نے ان کے بچپن میں کیے تھے انہیں ان پر مسلط کرنے کے بجائے اگر ہم ان سے ایک بار ان کی رضا، ان کی خوشی بھی پوچھ لیتے تو شاید ہمارے بچوں کو اپنی خواہشوں کے حصول کے لیے یوں چور راستے نہیں تلاشنے پڑتے۔ کیونکہ کسی کو شرافت کے دائرے میں رہ کر پسند کرنا میرے نزدیک کوئی غلط بات نہیں۔ ہم نے اگر اپنی بیٹی کو اتنا اعتبار، اتنا اعتماد دیا ہوتا کہ وہ ہم سے بلا جھجک اپنے دل کی ہر بات کہہ سکتی تو شاید آج جیت اتنی آسانی سے ہمارے دشمن کا مقدر نہ بنتی۔"

ان کی آواز پچھتاوے کے بوجھ تلے دب کر بوجھل اور دلگرفتہ سی ہو گئی تو لاؤنج میں ایک پل کو سناٹا چھا گیا جس میں منیرہ کی سسکیاں رہ رہ کر ارتعاش سا برپا کر رہی تھیں۔ یہ ارتعاش ان سب کے دلوں پہ چھائی سوگواری میں اضافہ کر رہا تھا، ان کی تھکاوٹ کو بڑھا رہا تھا کہ بہرکیف جو کچھ بھی ہوا تھا اس کی اذیت، اس کے درد کو ان سب ہی نے اپنی اپنی جگہ پر جھیلا تھا، برداشت کیا تھا اور وہ تاحال اس نقصان کے اثر سے نکل نہ پائے تھے۔

"میں نہیں جانتا کہ اس سارے قصے میں اصل قصوروار کون ہے؟ لیکن مجھے اس بات کا احساس ضرور ہے آقا جان، کہ آج سلویٰ کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ صرف اور صرف ہماری وجہ سے ہوا۔ اس نے ان ذلیل اور کمینے لوگوں کے ہاتھوں وہاں جتنے بھی دکھ اٹھائے، جو بھی تکلیفیں سہیں وہ صرف اور صرف ہماری بیٹی ہونے کے جرم میں سہیں۔ ورنہ اس معصوم کا تو اپنا کوئی قصور نہ تھا۔ اس نے تو محض اپنے دل کی خوشی چاہی تھی ایسے میں ہماری سالوں پرانی عداوت کی آگ کب اور کیسے اس کے دامن سے آلپٹی وہ بے چاری کیا جانے؟ اس لیے میرے نزدیک اب یہ حساب برابر ہوا۔ اگر سلویٰ ہماری گنہگار ہے تو ہم سب بھی اس کے اتنے ہی مجرم ہیں۔ اس لیے انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے کیونکہ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو اللہ کے حضور جواب دہ ہوں گے اور میں اپنے رب کی پکڑ میں نہیں آنا چاہتا۔ کسی صورت نہیں، کبھی نہیں۔"

باپ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انہوں نے قطعیت سے نفی میں سر ہلایا تو شاہ مخدوم کے تنے ہوئے چہرے پر شکستگی کے آثار در آئے۔ وہ چند لمحے کھڑے انہیں ساکت نظروں سے تکتے رہے اور پھر پلٹ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

ان کے جاتے ہی پیچھے سناٹا چھا گیا ایسے جیسے طوفان کے بعد کی سی خاموشی چاروں اور چھا گئی ہو۔ حاتم صاحب کی نگاہیں بے اختیار اپنے بھائی پر آ ٹھہریں جو جھکے شانوں اور غم زدہ چہرے کے ساتھ اپنی عمر سے کئی گنا بڑے لگ رہے تھے یوں جیسے لمحوں میں صدیوں کا سفر طے کر آئے ہوں۔ ان کے دل پہ ہاتھ سا پڑا۔ وہ دھیرے سے آگے بڑھے اور نرمی سے انہیں بازو سے تھام لیا۔

"آؤ سبحان، بیٹی کے پاس چلو۔ اسے اس وقت تمہاری اشد ضرورت ہے۔"

ان کے شفیق لہجے پہ سبحان گردیزی نے اپنی جھکی نظریں اٹھائیں۔ سامنے ہی حاتم صاحب کا پرخلوص، بے غرض اور بے ریا چہرہ مایوسی کے اس عمیق اندھیرے میں روشنی کی کرن بن کر جگمگا رہا تھا۔ سبحان صاحب کا دل پانی بن کر بہنے لگا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ ان کے بڑے بھائی نے زندگی کے ہر موڑ پر ان کا ساتھ بڑے احسن طریقے سے نبھایا تھا۔ وہ ان کے دوست بھی تھے اور ان کے رہنما بھی۔ ان کے بھائی بھی تھے اور ان کے ساتھی بھی لیکن آج جو کچھ انہوں نے ان کی اولاد اور ان کی ذات کے لیے کیا تھا وہ ان کی زمین، ان کا آسمان بن گئے تھے۔ وہ ان کی کل کائنات، ان کا جہان بن گئے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں ان کے باپ، ان کا سائبان بن گئے تھے اور اپنے اس سائبان کو دینے کے لیے ان کے پاس آنسوؤں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

ان کی آنکھ سے نکلنے والا پہلا قطرہ حاتم صاحب کو چونکا گیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے سبحان گردیزی کسی ٹوٹے ہوئے شہتیر کی طرح ان کے سینے سے آ لگے تھے اور اس طرح بلک کر روئے تھے کہ وہاں موجود ہر آنکھ اشک بار اور ہر دل غم سے چور ہو گیا تھا۔

☆☆☆

گاؤں کی کچی پکی سڑک پر تین گاڑیاں اندھا دھند ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتی دھویں اور مٹی کے گہرے بادل اڑاتی چلی جا رہی تھیں یوں جیسے اپنی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو اڑا کر رکھ دیں گی۔ ان کی دہشت دیکھنے والوں پر ایک خوف طاری کر رہی تھی۔ صاف دکھ رہا تھا کہ سواروں کے ارادے کی صورت نیک نہ تھے۔ وہ بنا رکے، بنا سنبھلے ہوا سے باتیں کرتی چلی گئی تھیں یہاں تک کہ منزل بالکل قریب آ گئی تھی۔

اسفند کے مسلح بندے ایک ہی جست میں اوپن جیپوں سے اتر کر بخت چوہدری کے ڈیرے میں داخل ہو گئے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے وہاں موجود تمام بے خبر ملازمین کو نہایت ہوشیاری اور خاموشی سے اپنی بندوقوں کی زد پہ لے لیا تھا۔ اسفند نے ایک فاتحانہ نظر احاطے میں کھڑے بے دست و پا افراد پر ڈالی تھی اور شانِ بے نیازی سے چلتا ہوا اندر کی جانب چلا آیا تھا۔ اس کی اطلاع کے مطابق اس وقت بخت چوہدری اپنے ڈیرے پر ہی موجود تھا۔ بیٹھک کے سامنے پہنچ کر اس نے درمیان میں حائل دروازے کو ایک زوردار ٹھوکر لگائی تھی۔ نتیجتاً دروازہ دھاڑ کی آواز کے ساتھ پورا کا پورا کھل گیا تھا اور وہ اپنے مجرموں کے روبرو آ گیا تھا۔

"تم؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" اسفند کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی بخت چوہدری ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھے تھے۔ کچھ ایسا ہی ردِعمل وہاں موجود باقی افراد کا بھی تھا جن میں بلند سمیت اس کے باقی دونوں بھائی، بخت چوہدری کا منشی اور عاشی کا شوہر ارشاد شامل تھا۔

عجیب اتفاق تھا کہ وہ سب اس وقت وہاں بیٹھے اسی موضوع پر بات کر رہے تھے۔ بخت چوہدری اور ان کے منشی کے علاوہ کوئی بھی سلویٰ گردیزی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس لیے جب انہوں نے بیٹوں کو ساری حقیقت کھول کر بتائی تھی تو وہ اپنی جگہ پر حیران رہ گئے تھے۔ سلویٰ ولد ملک کے بیٹے اسفندیار کے ساتھ بھاگی تھی انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہی نہیں، ماضی میں جو کچھ بھی دونوں گھرانوں کے درمیان ہوا تھا اور اب جس حالت میں ارشاد اور اس کی بیوی سلویٰ کو لے کر بخت چوہدری کے پاس پہنچے تھے اس نے انہیں گنگ کر دیا تھا۔

ایسے میں اسفند کی اچانک آمد نے نا صرف ان سب کو چونکا دیا تھا بلکہ ان کے جذبات کو بھی مزید بھڑکا ڈالا تھا۔ اس پہ مستزاد اس کا یوں بنا اجازت ان کے ڈیرے میں گھس آنا۔ بخت چوہدری کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسے گولیوں سے بھون کر رکھ دیں۔

"تمہاری جرأت کیسے ہوئی ہماری جاگیر میں قدم رکھنے کی۔ ہاں؟" بلند نے سرعت سے جیب میں رکھی پسٹل نکال کر اسفند پہ تانی۔

اسفند کی بے نیاز نظریں اس کے ہاتھ میں پکڑی پستول سے ہوتیں اس کے چہرے پر آ ٹھہریں جو مارے غضب کے سرخ ہو رہا تھا۔ بے اختیار اس کے لبوں پہ ایک طنزیہ مسکراہٹ آٹھہری۔

"میں اگر تمہاری جگہ ہوتا تو یہ بے وقوفی کرنے سے پہلے ایک بار اس کمرے سے باہر ضرور جھانک لیتا۔ کیا پتا حالات میرے حق میں ہوتے بھی یا نہیں؟"

اس کی چوٹ پر بلند کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ اس نے اسفند پر سے نگاہیں ہٹائے بنا منشی کو اشارہ کیا تو وہ سرعت سے باہر نکل گیا۔

"چھوٹے سرکار، ہمارے سارے بندے ان کے نشانے پر ہیں۔"

اگلے ہی پل بدحواس سے منشی نے آکر خوف زدہ سی آواز میں اطلاع دی تو بلند کے ساتھ ساتھ باقی سب کی رگوں میں بھی گردش کرتا خون ایک لمحے کو رک سا گیا۔

اسفند نے ایک تمسخرانہ نظر ان سب پر ڈالی۔ جو اولین جھٹکے کے بعد اب خوں خوار نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنی برداشت کی آخری حد پہ کھڑے تھے۔ وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور مضبوط قدموں سے چلتا صوفے کے وسط میں آبیٹھا۔ بلند نے کسی تلخ گھونٹ کی طرح اپنا ہاتھ نیچے کر لیا حالانکہ اپنی یہ پسپائی اسے مارے دے رہی تھی۔

"تمہیں یہ بدمعاشی بہت مہنگی پڑے گی ملک اسفند یار۔" اس نے دانت پیسے۔

"بدمعاشی؟ ابھی تو میں نے بدمعاشی شروع بھی نہیں کی چوہدری بلند بخت۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا سرد لہجے میں بولا تو بخت چوہدری کا ضبط جواب دے گیا۔

"بکواس بند کرو، اور سیدھے طریقے سے بتاؤ کہ تمہاری اس گھٹیا حرکت کا کیا مطلب ہے؟"

"سیدھا طریقہ؟" اسفند نے بھنویں اچکائیں۔ "تو چلو پھر تم پہلے یہ بتاؤ کہ یہ چوہا تمہارے بل میں کیا کر رہا ہے؟" صوفے کی پشت پہ بازو پھیلاتے ہوئے اس نے پرسکون سے انداز میں، پیچھے دیوار کے ساتھ چپکے کھڑے ارشاد کی طرف اشارہ کیا تو اس کا تھر تھر کانپتا وجود دہلیز میں نہا گیا۔

بخت چوہدری نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ یقیناً اسے کسی بات کی بھنک پڑ گئی تھی لیکن وہ جلد بازی میں کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتے تھے اسی لیے انجان بن گئے۔

"تمہیں اس سے کیا؟" وہ رکھائی سے بولے۔

"ہونہہ...... یہ بھی خوب کہی۔"

اس نے استہزائیہ انداز میں ہنکارا بھرا۔ "لیکن وہ کیا ہے ناں چوہدری صاحب کہ اگر یہ چوہا تمہارا پالا ہوا ہے تو پھر یہ میری حویلی میں کیا کر رہا تھا؟"

گہری نظروں سے انہیں دیکھتا وہ معنی خیز انداز میں بولا تو ایک پل کے لیے بخت چوہدری کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے کیا جواب دیں۔

"یہ ہمارا پالا ہوا نہیں۔" بلند اچانک سے بولا تو اسفند کی نگاہیں بے اختیار اس پہ آٹھہریں۔ "اسے کام کی ضرورت تھی سو ہم نے اسے رکھ لیا۔" اس نے شانوں کو خفیف سی جنبش دی، یوں جیسے یہ کوئی بڑی عام سی بات ہو۔

"کمال ہے۔" اسفند نے مصنوعی حیرت سے ٹھوڑی کھجائی۔ "کیونکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے تو اسے نوکری سے نہیں نکالا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا تو بلند کے لب ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

اسفند نے ایک برفیلی نظر ان چاروں باپ بیٹوں پر ڈالی اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"تو اب آتے ہیں سیدھی بات پر...... سلوئی کہاں ہے بخت چوہدری؟" سرسراتے لہجے میں کہتا وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ان کے مقابل آکھڑا ہوا تو بخت چوہدری نے بھی سارا حساب بے باک کر لینے کی ٹھان لی۔

"وہیں جہاں اسے ہونا چاہیے تھا۔" وہ بنا کسی ردوکد کے بولے۔ اسفندیار کے لبوں پہ اک زہریلی سی مسکراہٹ آکر غائب ہوگئی۔

"تمہارا مطلب ہے کہ تمہاری خواب گاہ میں؟ یا پھر تمہارے بیٹوں میں سے کسی ایک کے بستر......"

"اسفند!" وہ غرا کر اس پر جھپٹ پڑے۔ لیکن اسفند نے ایک ہی جھٹکے میں انہیں خود سے دور کر دیا۔

"چلاؤ مت۔ میرے گھر میں نقب لگا کے تم لوگوں نے کیا سوچا تھا کہ میری نظر سے بچ جاؤ گے؟" وہ غصے سے گرجا۔ "نہیں بخت چوہدری نہیں۔ تم لوگ اگر پاتال میں بھی چھپ کر بیٹھے ہوتے ناں تو میں نے وہاں سے بھی تم سب کو ڈھونڈ نکالنا تھا۔ پھر بھلا یہ دو قدم کا فاصلہ کیا معنی رکھتا تھا۔"

"مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم اپنی بیوی کے متعلق اتنی گری ہوئی بات بھی کہہ سکتے ہو۔ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟" بخت چوہدری غصے سے لال بھبوکا چہرہ لیے بولے۔

"ہاں ہو گیا ہے میرا دماغ خراب۔ بتاؤ۔ بتاؤ تم میں سے کس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کی ہے؟ کون ہے وہ بدذات جو چوروں کی طرح رات کے اندھیرے میں سلوئی سے چھپ چھپ کر ملنے کے لیے آتا رہا ہے؟ بولو۔ جواب دو!"

وہ حلق کے بل چلایا تو بلند خود پہ سے ہر اختیار کھو بیٹھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اڑ کر اسفند کو اس کے گریبان سے پکڑ لیا۔

"ذلیل، کمینے آدمی! یہ تم باپ بیٹے کی اب کون سی نئی چال ہے ہاں؟"

اس کی جرأت اسفند کا دماغ گھما گئی۔ اس نے ایک جھٹکے سے خود کو بلند کی گرفت سے چھڑایا۔

"چالیں چلنا ہمارا نہیں تمہارا کام ہے۔ شریف لوگوں کی عزتوں پر منہ مارنے والے گندے کتے ہو تم۔ میں تم سب کا اور تمہاری اس رکھیل......"

"بس!" بخت چوہدری اس غضب سے دھاڑے کہ کمرے کے در و دیوار ہل گئے۔ "اگر تم نے میری بیٹی کے بارے میں مزید ایک بھی گرا ہوا لفظ استعمال کیا یا کوئی غلط بات کہی تو خدا کی قسم میں تمہیں زمین میں زندہ گاڑ دوں گا ملک اسفند!"

"بیٹی!" اسفند استہزائیہ انداز میں بولا۔ "یہ جھانسا کسی اور کو دینا چوہدری۔"

وہ نفرت سے پھنکارا تو بخت چوہدری اسے تاسف سے دیکھ کر رہ گئے۔

"تم لوگ اپنی دشمنی میں اس حد تک گر جاؤ گے کہ رشتوں کی حرمت، ان کی شرم تک بھلا دو گے ایسا میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔"

"دشمنی؟ ہماری تم سے کبھی بھی کوئی دشمنی نہیں رہی چوہدری۔ لیکن اب شاید یہ تاریخ بھی بدل جائے گی۔"

"تاریخ تو اسی روز بدل گئی تھی اسفندیار، جب تم نے بدلے کے نام پر اپنے باپ کے ساتھ مل کر سلوئی کو پھنسانے کی گندی چال چلی تھی۔"

"کیا؟ یہ تم کس بدلے کی بات کر رہے ہو؟" اسفند نے الجھ کر بخت چوہدری کو دیکھا۔

"بنومت۔ ہم ساری حقیقت جانتے ہیں۔" وہ نفرت سے بولے تو اسفند کی الجھن دوچند ہو گئی۔

"کون سی حقیقت؟ کیسی چال؟ میں نے کبھی سلوئی کے ساتھ کوئی چال نہیں چلی۔ اور یہ تم کس رشتے کی بات کر رہے ہو؟ سلوئی کے ساتھ بھلا تمہارا کیا رشتہ ہے؟"

"یا تو تم واقعی انجان ہو یا پھر بہت اچھے اداکار ہو۔ لیکن وجہ چاہے کچھ بھی ہو ملک اسفند، میری ایک بات کان کھول کر سن لو اور جا کر اپنے اس مکار اور عیار باپ کو بھی بتا دینا کہ اب تم دونوں باپ بیٹوں کا کھیل ختم ہوا۔ تم لوگوں نے اس بچی پر جتنا ظلم کرنا تھا کر لیا، اسے اس کے اپنوں کے خلاف جتنا استعمال کرنا تھا کر لیا۔ لیکن اب مزید نہیں۔ کیونکہ میں سلوٹی کو اس کے گھر والوں کے حوالے کر آیا ہوں۔ اور اب تمہیں اس تک پہنچنے کے لیے اس کے پورے خاندان کے آگے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ سمجھے!"

"اس کے گھر؟ لیکن تم اس کے گھر والوں کو کیسے جانتے ہو؟ اور یہ تم کس لیے بار بار میرے باپ کا نام لے رہے ہو؟ ان کا بھلا اس سارے قصے سے کیا تعلق ہے؟" اسفند پیشانی پہ بل لیے ایک قدم آگے آیا۔ اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ آنِ واحد میں اس گتھی کو سلجھا کر رکھ دیتا جس کا کوئی سرپیر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"زیادہ پردے ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ تمہارے باپ نے خود سلوٹی کے دادا کو فون کر کے تمہاری اور اپنی چال کا اعتراف کیا تھا۔ انہیں اپنی جیت اور ان کی ہار کا پیغام دیا تھا۔ اس لیے اب یہ انجان بننے کا ڈھکوسلا بند کرو۔ کیونکہ ہم سب جانتے ہیں ملک اسفندیار بہادر، کہ تم اپنے باپ کے آلۂ کار ہو۔ تم نے اس کے ساتھ مل کر سلوٹی کو اپنی نام نہاد محبت کے جال میں صرف اس لیے پھنسایا تھا تاکہ تم گردیزیوں سے اپنے باپ کی بے عزتی، اس کی ہار کا بدلہ لے سکو۔ انہیں سبق سکھا سکو۔ اور تین دن پہلے تم نے بالآخر وہ کر دکھایا۔ تم نے جس کسمپرسی کے عالم میں اپنی بیوی کو مار پیٹ کر رات کے اندھیرے میں اپنے گھر سے نکالا وہ اس بات کا ثبوت ہے ملک اسفند، کہ تم انسان نہیں جانور ہو۔ تم اپنے باپ کے ہاتھ کی صرف ایک کٹھ پتلی ہو۔ جس نے اپنے مالک کے اشاروں پر ناچ کر اسے آخر کار سرخرو کیا اور اپنی بیوی کی اندھی محبت اور اس کے یقین کا سر ہمیشہ کے لیے نگوں کر ڈالا۔ اس لیے اب اپنا یہ ڈرامہ سمیٹو اور یہاں سے چلتے بنو کیونکہ تم جس کی تلاش میں یہاں آئے ہو وہ اب تمہاری پہنچ سے بہت دور جا چکی ہے۔ سمجھے!"

اور اسفند جو دم سادھے انہیں سن رہا تھا اپنی جگہ پر کسی بت کی طرح استادہ رہ گیا۔ یہ کیسے انکشافات تھے؟ یہ تصویر کا کون سا رخ تھا؟ اسے لگ رہا تھا کہ اگر وہ کچھ دیر اور یہاں کھڑا رہا تو شاید چکرا کر گر پڑے گا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے باہر چلا آیا۔ اس کا دماغ بالکل سن اور اعصاب شل ہو رہے تھے۔ وہ ہر طرف سے بے خبر گاڑی میں آ بیٹھا۔ اس کے بیٹھتے ہی تینوں گاڑیاں ایک بار پھر فراٹے بھرنے لگیں۔

اسفند نے تھکے تھکے سے انداز میں اپنا سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔

"تمہارے باپ نے خود سلوٹی کے دادا کو فون کر کے تمہاری اور اپنی چال کا اعتراف کیا تھا۔ انہیں اپنی جیت اور ان کی ہار کا پیغام دیا تھا۔"

"وہ ایسی لڑکی نہیں ہے بہادر۔ اس کے دل، اس کی روح، اس کی ہر ایک سانس میں صرف آپ بسے ہیں۔ صرف آپ۔"

"میں اتنی جلدی کم از کم اتنا بڑا فیصلہ نہ کرتی۔"

"میں اتنی جلدی کم از کم اتنا بڑا فیصلہ نہ کرتی۔"

مختلف آوازیں بازگشت بن کر اس کے گرد گونج اٹھیں تو اس نے تڑپ کر دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔ کچھ غلط ہونے کا احساس بہت شدت سے اس کے اندر جاگا تھا۔ اس نے بے اختیار اپنی آنکھیں سختی سے میچ لیں۔

"یا اللہ! مجھے کسی پچھتاوے میں مبتلا نہ کرنا میرے مولا۔" اس کے ڈوبتے دل نے بڑی عاجزی سے اپنے رب کے حضور التجا کی تھی یہ جانے بغیر کہ ہر دعا کے نصیب میں قبولیت کی سند نہیں ہوتی۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نازنین فردوس

روشنا اور منشا کا رشتہ

وہ اپنے فون میں مگن تھی جب ثانیہ اس کے قریب آئی تھی۔

"منشا۔منشا"۔ وہ اس کے کانوں میں آ کر چلائی تو منشا نے اپنے کانوں سے ہینڈفری ہٹائی۔

"کیا ہوا۔" اس نے کان میں انگلی پھیر کر پھر اسے چڑ کر دیکھا۔

"کل شام لڑکے والے آ رہے ہیں تمہیں دیکھنے۔ احتیاطی طور پر بتا رہی ہوں۔ کافی ہنگامی صورت حال ڈیئی ہے کل تو۔" ثانیہ اس کا اطمینان سے کہتا تھا اور منشا کا اطمینان رخصت ہوا۔

"ان لڑکے والوں کو کچھ کام وام نہیں ہوتا، ہر دوسرے دن نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ لڑکیوں کو دیکھنے۔" اس نے فون قریب بیڈ پر پھینک دیا تھا اور خود آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی

"کافی فارغ قوم ہوتی ہے اس قسم کے لوگوں کی۔ سب کو چوبیس گھنٹے ملتے ہیں۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ ان لوگوں کو دو تین گھنٹے ایکسٹرا مل جاتے ہیں جس میں یہ فضول کام کرنے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔" ثانیہ بھی جلی بھنی بیٹھی تھی۔

"اگر میرا بس چلے تو میں ان کا بائیکاٹ کر دوں۔ لڑکی دیکھنا تو آج کل بہت ہی اہم نازک موضوع ہے۔ جب لال سنگھ چڈھا جیسی فلموں کا بائیکاٹ کر سکتے ہیں تو پھر لڑکی دیکھنے کا بائیکاٹ کرنا چاہیے۔" منشا جوش و خروش سے بول رہی تھی۔

"کل تمہیں دیکھنے آ رہے ہیں اس کے بعد جو کرنا ہے کر لینا۔ لیکن کل کے دن کوئی ہنگامہ نہیں۔ سمجھ گئیں تم دونوں۔" امی اچانک بن بوتل کے جن کی طرح کہیں سے نکل کر بولیں۔ تو منشا کے جوش پر ٹھنڈا پانی سا پڑ گیا۔

"جی امی۔" اس نے گردن جھکا دی تھی۔

☆☆☆

"ارے یہ منشا پاشا کو کیا ہو گیا۔ کافی منہ سوجا ہوا ہے۔" لاریب نے اسے دیکھتے ہی کہا تو وہ ساری ساری کی ساری اس کی طرف گھومیں۔ وہ لوگ فرسٹ پیریڈ اٹینڈ کر کے ادھر کالج کے لان میں آ گئی تھیں۔ منشا کا موڈ تو خراب ہی تھا۔ اپنی مخلص دوست کی ہمدردی ملتے ہی وہ پھٹ پڑی۔

"آپ کی منشا پاشا کو لڑکے والے دیکھنے آ رہے ہیں۔"

"اوہو ہو۔" وہ سب ہنسنے لگیں۔

"لیکن موڈ کیوں بگڑا ہوا ہے؟۔" لاریب اس کی سنجیدہ شکل سے کچھ اخذ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"تو کیا کروں۔ ہمیشہ کی طرح سج سنور کر، سر جھکا کر ان کے لیے چائے لے جاؤں اور پھر ان کے بے تکے سوالوں کا جواب دوں۔ اور آخر میں وہ چکن رولز، سموسے، چکن پیٹیز سے پیٹ بھر کر "ہم گھر جا کر جواب دیں گے"۔ یہ سننے کے لیے تیار رہوں۔"

"ایک منٹ بھاؤ۔ وہ لوگ سارے چکن رولز پیٹیز، کھا جاتے ہیں۔ تمہارے لیے کچھ نہیں رکھتے......" یہ ثمرہ تھی کھانے کی بے انتہا شوقین۔

"اس کے لیے تم غصہ میں ہو۔" اس کی بات پر وہ سب اسے گھور کر رہ گئیں۔

"ثمرہ۔ ہر بات میں کھانا، کھانا نہیں کیا جاتا۔" فاطمہ نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سوری کہہ کر سر جھکا گئی۔

"منشا۔ یار، یہ تو لڑکیوں کا ایسا مسئلہ ہے کہ کوئی



اس پر سوچتا تک نہیں کہ اس سے لڑکیاں ہرٹ ہوتی ہیں۔" عائشہ نے بھی قلق سے کہا۔

"اور نہیں تو کیا۔ پرسوں میری آپی کو لڑکے والے دیکھنے آئے۔ آپی نے ہلکا سبز رنگ کا سوٹ پہنا تھا۔ لڑکے کی ماں نے کہا۔ ذرا ساڑھی پہن کر دکھائیں۔ آپی انہیں حیرانی سے دیکھتی رہ گئیں کہ انہیں ساڑھی میں دیکھ کر کیا کرنا ہے۔ خیر بھابھی نے انہیں ساڑھی پہنائی اور بٹھا گئیں۔ اب دیکھو۔ نند کی فرمائش۔ ذرا چل کر دکھائیں۔ آپی بے چاری ساڑھی کبھی پہنی نہیں تھی ساڑھی پہن کر چلنے لگیں تو سامنے لڑکے کی ماں سے جا ٹکرائیں۔ لڑکے کی ماں چائے کا کپ لیے بیٹھی تھیں گرم چائے ان پر گری تو وہ چیخیں کہ حد نہیں۔ آپی گرتے پڑتے واپس جانے لگیں تو پیر نند سے جا ٹکرایا اور وہ نند صاحبہ دھڑام سے ٹی ٹیبل پر جا گریں۔ اس کے بعد تو پوچھو مت۔ جو ہنگامہ ہوا۔ ہاہاہا۔ میں نے تو بعد میں آپی کو خوب شاباشی دی کہ کیا کام کردیا۔ مدتوں یاد رکھیں گی۔"

فاطمہ کی اس بات پر تو سارا گروپ ہنسنے لگا۔ منشا کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آگئی تھی۔

"تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب ایسی سچویشن آئی تو گرم چائے سے اچھی طرح تواضع کرنی چاہیے۔" لاریب کی اس شوخی پر وہ سب ہنسنے لگیں۔

"نہیں۔ میں صرف گرم چائے سے بدلہ نہیں لوں گی۔ میں ضرور کچھ الگ کروں گی۔ منشا نے کہا۔

"اچھا کچھ الگ کیا کریں گی آپ۔" لاریب کو کھد بد ہوئی۔

"کچھ ایسا کہ مدتوں یاد رکھیں گے۔" منشا نے عزم سے کہا اور وہ سب اگلے پیریڈ کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

☆☆☆

"ارے بھیا۔ یہ کریم لگالیں۔" سعد نے ایک کریم اس کے آگے بڑھائی۔

"یہ لڑکیوں کی ہے گدھے۔ یہ لگاؤں گا میں۔" اس نے کریم بیڈ پر پھینکی۔

"ہاں۔ تو مردوں والی ختم ہو گئی تھی۔ اب ایمرجنسی میں باجی کے پاس سے یہی ملی۔" سعد نے بھولے پن سے کہا تو اس کے ساتھ کھڑا فہد ہنسنے لگا۔

"یار روشا۔ تم اور تمہارا بھائی دونوں نمونے ہو۔"

"آج کل تو ہر لڑکے کا اپنا شیونگ کٹ ہوتا ہی ہے جس میں ہیر جیل ہیر ڈائی اور کریمز وغیرہ ہوتی ہیں۔ کمال ہے تمہارے پاس وہی روایتی شیونگ بلیڈز اور شیونگ کریم بس۔" فہد حیرانی سے اس کے سامنے پڑے شیونگ کٹ کو ٹٹول رہا تھا۔

"ہاں، اب ہمارے ابا کو کون سمجھائے کہ زمانہ بدل گیا ہے۔ لڑکوں کو بھی میک اپ کٹ کی ضرورت پڑ رہی ہے اور وہ استعمال بھی کرتے ہیں۔ ابا تو آج تک بال بنانے کے پیسے بھی سو طعنے مار کر دیتے ہیں۔" روشا اپنے بالوں کو الگ الگ انداز میں سیٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بال سامنے سے تھوڑے گھنگریالے سے تھے جس کی وجہ سے اس کا ہیر اسٹائل ٹھیک سے جمتا ہی نہیں تھا۔

"ہاں تو ہر جوان لڑکے کی طرح سبزیوں گوشت سے روپے چرانے کا آزمودہ نسخہ استعمال کر لیتا۔" فہد نے مشورہ دیا۔

"کوشش کی تھی میرے بھائی۔ مگر ابا کی تو ہر سبزی فروش ہر قصاب سے ایسی علیک سلیک ہے کہ مجھ سے پہلے وہ سبزیوں کی قیمت بتا دیتے ہیں۔ وہ تو باقاعدہ اخبار سے روزانہ کے نرخ بتانے لگتے ہیں۔ آج انڈے چالیس روپے اور درجن ہوں تو دو سو بیس روپے۔ اسی طرح سبزیوں کے بھی قیمتیں پتا ہوتی ہیں۔ ایک بار میں نے ٹماٹر جان بوجھ کر سو روپے کہہ دیا تو مجھے گھور کر دیکھا اور کہا۔

"کیا سو روپے کی بولی وہاں تم لگا کر آئے تھے۔ اس کا ریٹ تو اسی روپے فی کلو ہے۔" اور میں شرمندگی سے زمین میں نظریں گاڑ کر رہ گیا۔"

روشا نے بلاآخر اپنے بالوں کو سیٹ کر لیا تھا۔ اور اب اپنے چہرے کو ہر زاویے سے دیکھ رہا تھا۔

"کیسا لگ رہا ہوں۔" اب اس نے فہد اور

سعد کو دیکھا سعد موبائل میں کینڈی کرش کھیل رہا تھا۔ جبکہ فہد اب اس کے کپڑوں پر ناقدانہ نظریں ڈالے ہوئے تھا۔

"تم اب لڑکی والوں کے سامنے جینز پہنے کر جاؤ گے۔"

"ہاں۔ کیوں، کیا برائی ہے، اس جینز میں؟" روشا ابھی بھی آئینے کے سامنے ہی کھڑا تھا۔ اس نے روایتی بلیو جینز پہنے تھی جو چست بھی تھی۔

"یار۔ یہ جینز اور وہ بھی اتنی تنگ۔ تم یہ پہن کر لڑکی والوں کے سامنے جاؤ گے تو وہ تو دیکھتے ہی تمہیں "چھچھورا لڑکا" کہہ کر ریجیکٹ کر دیں گے۔ تمہیں پتا نہیں جینز لڑکی والوں کے سامنے پہلی بار بھی نہیں پہنتے۔ سیدھے چھچھورے کہلاؤ گے اور اگر تارن جینز پہنی تو سمجھو پورے آوارہ کہلاؤ گے۔" فہد اسے معلومات پہنچا رہا تھا۔

تو کیا اب مولویوں والا ڈھیلا ڈھالا پاجامہ پہن لوں۔" وہ چڑ کر بولا۔

"ارے ایسا غضب مت کرنا۔ لڑکی نے دیکھ لیا تو وہ تو جھٹ سے انکار کر دے گی کہ نو پاجامہ۔"

یہ "نو پاجامہ" کیا ہے" روشا اب پلٹ کر اسے استعجاب سے دیکھ رہا تھا۔

"ہمارے ایک رشتہ کے بھائی کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ لڑکا شریف تھا۔ کرتا پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ بس لڑکی نے دیکھ لیا اور ماں سے کہا۔ "اوہ۔ ممی نو پاجامہ۔" فہد بول کر خود ہی ہنس پڑا۔ اور روشا جل گیا۔

"کبھی کبھی دل چاہتا ہے ان لڑکیوں کے دماغ ٹھکانے لگا دوں۔۔ جینز پہنو تو ابا کو اعتراض "پاجامہ پہنو تو لڑکی کو اعتراض۔ ایسے میں ہم لڑکے کیا کریں۔" روشا غصہ سے اپنی شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے بولا تھا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ اب چلو۔ ورنہ تمہارے ابا کی پکار شروع ہو جائے گی"۔ فہد اس کے غصہ پر نرمی سے بولا۔

وہ نیچے ڈرائنگ روم میں آیا تھا۔ فہد خود اوپر ہی رک گیا تھا۔ سعد بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔

دس پندرہ منٹ بعد روشا اپنا بر دکھاوا نمٹا کر اوپر آیا تو ہمیشہ کی طرح اس کا منہ سوج گیا تھا۔

"کیا ہوا......"

"وہی جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔" وہ اپنی گھڑی ہاتھ سے اتارتے ناراض سے لہجے میں بولا۔

"یعنی......!"

"لڑکی کے پھوپھا کو میرا قد کم لگا۔ جبکہ لڑکی کے خالو نے ذاتی گھر نہ ہونے کا اعتراض کیا۔ جبکہ لڑکی کی خالہ نے میری چار بہنوں کے ہونے پر ناک بھوں چڑھائی۔" وہ سعد کو دھکیل کر خود اس کے قریب لیٹ گیا۔

"اوہ۔ پھر یار ایسا کرو گھر میں ہی کوئی کزن وغیرہ ہو تو وہیں معاملہ سیٹ کر لو۔" فہد نے مشورہ دیا جو روشا کو ایک آنکھ نہ بھایا۔

"اگر سب تمہاری طرح خوش قسمت ہوتے تو کیا بات تھی۔۔ میرے ابا کی کوئی بہن نہیں۔ اور ماموں خالاؤں نے قسم کھائی تھی شاید کہ صرف لڑکے پیدا کرنے ہیں تو سب میرے جیسے یا مجھ سے بڑے لڑکے پیدا کر کے چین کی بانسری بجا رہے ہیں۔ اور جو ایک آدھ لڑکی پیدا کی بھی تو وہ سب مجھ سے بڑی ہیں اور سب میرے شعور میں آنے تک اپنے اپنے سسرال سدھار بھی گئیں۔

میرے سائز کی تو کوئی بھی موجود نہیں۔ تف ہے یار ایسی رشتہ داری پر۔"

اس کی بات پر فہد ہنس ہی پڑا۔

"اگر تمہیں لڑکی نہیں مل رہی تو اس میں تمہاری امی کی شرط بھی وجہ ہو سکتی ہے کہ لڑکی کماؤ پوت بھی ہو۔

"ہاں۔ امی کو کماؤ پوت اور بہنوں کو خوب صورت لڑکی چاہیے۔ تو جن کی لڑکی خوب صورت ہو اور کماؤ پوت بھی تو وہ مجھ معمولی سے ماسٹرز کیے ہوئے کو لڑکی کیوں دیں گے۔ اپنی بیٹی کے لیے شہزادہ نا ڈھونڈ لیں۔" اس نے ایمانداری سے تجزیہ کیا تو فہد کو ماننا پڑا۔ کہ وہ بھی صحیح تھا۔

☆☆☆

روشا اپنی عمر کی اٹھائیس ویں منزل پر تھا۔ ماسٹرز کرنے کے باوجود ابھی تک نوکری کی تلاش میں تھا۔ بلکہ اچھی نوکری کی تلاش میں۔ چار بہنوں کا بھائی جس میں تین بہنوں کو تو ابا نے بیاہ دیا تھا۔ چھوٹی بہن پہلے ہی ماموں زاد سے انگیجڈ تھی اس کی بھی اگلے دو سال میں شادی طے تھی۔ اسی لیے امی نے روشان احمد عرف روشا کے لیے بھی لڑکی دیکھنے کی مہم کا آغاز کیا۔ بقول امی کے۔ نوکری کے ساتھ ساتھ چھوکری بھی ڈھونڈنی چاہیے دونوں میں سے کوء ایک بھی مل جائے تو وارے نیارے ہی ہو جائیں گے۔ لیکن انہیں ساتھ ہی یہ بھی دکھ تھا کہ ان کے بیٹے کو جو بھی جاب ملتی۔ اس کی تنخواہ اتنی کم ہوتی کہ روشا بمشکل اپنے خرچے پورے کرتا۔ اسے لیے امی کا ماننا تھا کہ لڑکی بھی کمانے والی ہو تو دونوں اپنی۔ زندگی کی گاڑی اچھی طرح چلا پائیں گے۔ ورنہ تو اس کی تنخواہ میں ایک اچھے برانڈ کا کپڑا بھی نہ آئے۔

"تو میں برانڈڈ کپڑے کیوں لاؤں گا۔ امی۔ وہی پہناؤں گا سیل والے پانچ سو کے جوڑے۔" وہ آس پاس سے سن کر بول پڑتا۔

"پھر تو تمہاری گاڑی کو بریک ہی لگ جائیں گے اور گاڑی آگے بڑھنے سے انکار کردے گی۔"

"تو میں جو گاڑی کے پیچ کسنا سیکھ چکا ہوں۔ وہ کس دن کام آئے گا۔ دو منٹ میں دماغ کے ڈھیلے پرزے کس دوں گا۔" اس معاملے میں روشا ذراسخت تھا۔

"ہاں مگر پہلے ملے تو"۔ بہنیں ہنس ہنس کر ٹکڑا لگاتیں۔

"ہاں پہلے ملے تو۔" روشا نے ایک ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

☆☆☆

"منشا منشا۔ یہ سوٹ نکال کر رکھا ہے۔ آج یہی پہن لینا"۔ وہ نہا کر آئی تو امی بیڈ پر اس کا شاکنگ پنک ڈریس لیے بیٹھی تھیں۔

"امی۔ یہ تو میں نے اپنی سالگرہ میں پہننے کے لیے رکھا تھا۔ اس نے اپنے نئے نکور سوٹ کو دیکھا۔

"ہاں تو ابھی پندرہ دن ہیں۔ آج پہنو گی تو پرانا تھوڑی ہی ہو گا۔" امی نے اطمینان سے کہا تو وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی تھی۔

اب وہ اپنی امی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں تھی۔ جہاں مہمان پہلے ہی سے بیٹھے تھے۔

"آپ کا نام کیا ہے بیٹے۔" ایک نے اپنے لہجہ میں مصنوعی مٹھاس بھر کر پوچھا۔

اس نے اپنا نام بتا دیا۔

"اپنا نام لکھنا آتا ہے؟"

"لو لکھ لکھ کر ہاتھ گھس گئے۔ یہ پوچھ رہی ہیں اپنا نام لکھنا آتا ہے۔" اس نے دل ہی دل میں جل کر کہا۔

"جی"۔

"نماز قران وغیرہ تو پڑھتی ہو۔"

"نہیں جی مسلمان تو صرف آپ لوگ ہیں۔ ہم جیسے کہاں نماز پڑھتے ہیں" وہ پھر دل میں بڑبڑائی۔

"اچھا" ایک مرد بزرگ نے پوچھا۔ "حساب میں دلچپی ہے۔"

"جی"

اس کی جی پر اگلی فرمائش، "اچھا اے پلس بی ہول اسکوائر کا فارمولا تو سناؤ۔"

ہیں۔ آپ کو اس فارمولا کا اچار بنانا ہے۔ دل تو چاہا کہ یہ کہے مگر وہ چپ رہی تھی پھر کہا تو اتنا "جی بس دو اور دو چار اور ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔ اتنا ہی جانتی ہوں حساب۔"

"بیٹی! اخبار وغیرہ پڑھ لیتی ہو۔" اب ساس صاحبہ میدان میں آئیں۔

"جی اخبار بھی پڑھ لیتی ہوں اور آپ جیسے لوگوں کی نیت بھی۔" وہ دبے دبے لہجے میں کہہ گئی.

امی ہلکے سے کھنکار کر رہ گئیں۔

"پکوان سے دلچپی؟"

"نہیں جی، بس کھانے میں ہی دلچپی ہے"۔

اس نے دل کڑا کر کے کہا تھا۔ اور ساتھ پانی کا گلاس بھی اٹھایا۔ امی کی شعلہ صفت نظروں کے باعث گھبراہٹ سے پیاس سی محسوس ہوئی۔

"میرے خیال میں تو آپ کی بیٹی کو فریج کے پانی کی عادت ہے۔ ان سے سادہ پانی پیا نہیں جا رہا "۔ ایک موٹی سی آنٹی نے تاڑا۔

"نہیں نہیں آنٹی۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں سادہ پانی تو بہت شوق سے پی لیتی ہوں۔ "اس نے جلدی سے تصحیح کی تھی اور پانی کا پورا گلاس ختم کر دیا تھا۔

"اف! گرمی بہت ہے۔ اے سی نہیں ہے آپ کے پاس!" متوقع ساس صاحبہ ہاتھ سے اپنا پنکھا جھلانے لگیں۔

"نہیں بہن۔ اے سی تو نہیں لگایا۔ کبھی اتنی ضرورت محسوس نہیں ہوئی"۔ امی نے یوں شرمندگی سے سر جھکا لیا جیسے اے سی کا گھر میں نہ ہونا گناہ ہو۔

"اچھا۔ جانے دیں۔ آپ کو تو پتا ہو گا میرا بیٹا بھی تو انجینئر ہے انجینئر۔ ایسے اے سی تو وہ دس بٹھا لے گھر میں۔" وہی آنٹی نے فخریہ کہا۔

"ہیں کیا یہ انجینئر ہو کر گھروں میں اے سی لگاتے ہیں۔ "منشا کی جھکی گردن بری طرح ہل گئی۔

"میرا مطلب کہ اگر ایک بار گورنمنٹ جاب لگ جائے تو پھر تو پیسے بارش کی طرح برسنے لگیں گے۔ لیکن اس کے لیے دس لاکھ کی ضرورت ہے۔ اگر آپ دس لاکھ کا انتظام کر دیں تو۔ "ان کی ادھوری بات اب جا کے مکمل ہوئی تھی۔

منشا نے ایک جھٹکے سے سر اوپر کیا تھا۔ چہرہ پر غم و غصہ کی کیفیت تھی۔

"اور باقی شادی تو آپ معیاری ہی کریں گے۔ ہے ناں۔ "انہوں نے اب ساڑھی کا پلو برابر کیا تھا۔

"جی شادی تو ہم معیاری ہی کریں گے۔ اللہ کا دیا کافی ہے ہمارے پاس۔ "امی کا لہجہ دھیما تھا مگر بکھرا بکھرا سا۔

"جی جی۔ اللہ کا دیا تو ہمارے پاس بھی بہت ہے دولت ہے شہرت ہے۔"

" مگر شاید عزت نہیں ہے۔ "منشا نے طنزیہ انداز میں ان کی ٹون میں ٹون ملائی تھی۔

" آپ لوگ جوس وغیرہ لیں۔ "امی کو منشا کی باتوں سے ان کا دھیان ہٹانے کا یہی طریقہ سوجھا۔

"امی۔ آپ کو جو بھی لینا ہو لیں۔ مگر میری فرمائش تو آئی فون ہے۔ وہ ضرور دینے کے لیے کہیں۔ یہ انجینئر کا پہلا جملہ تھا جو جوس کا گلاس پکڑے ہوئے تھا۔

منشا کی تو حیرت سے آنکھیں پھٹیں۔

"تو یہ محترم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔ مگر کاش کہ نہ ہی رکھتے"۔ وہ دل ہی دل میں کوستی رہ گی۔

"ارے بیٹا، یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ وہ تو شادی میں کسی بھی سالے کی طرف سے تحفہ ہوتا ہے۔ اس کی کیا ڈیمانڈ کرنا۔ "ایک اور آنٹی کہہ کر ہنسیں۔

" آپ نے انجینئرنگ کتنے سال میں پاس کی۔ " منشا نے یکا یک لڑکے سے ہی سوال کر دیا۔ وہ کالج یونی میں کئی ڈیبیٹ میں حصہ لے چکی تھی۔ اس لیے کافی پراعتماد تھی۔ "مطلب۔ آپ نے کتنے سال میں انجینئرنگ پاس کی۔ تین سال یا پانچ سال"۔ آپشنز دیتے ہوئے اس کے چہرہ پر شرارت سی تھی۔

"جی تین سال میں"۔ لڑکے نے گردن اکڑا کر کہا تو منشا بے ساختہ ہنس کر امی کو دیکھنے لگی۔

"امی۔ انہوں نے تین سال میں انجینئرنگ پاس کی ہے اور شاید یہ ملک کے پہلے انجینئر ہوں گے جنہوں نے تین سال میں اپنی ڈگری لی ہو گی۔ "۔ اب وہ بہت نڈر نظر آ رہی تھی۔ امی کی التجا میں نظر انداز کرتی پھر سے ان خاتون کی جانب دیکھنے لگی تھی۔

" آنٹی جی! آپ اگر اپنے بیٹے کی بولی لگانا ہی چاہتے ہیں تو کہیں اور لگائیں ہم کھوٹے سکے خریدنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ آپ کے بیٹے کو پندرہ لاکھ تو کیا، کوڑیوں کے مول بھی کوئی نہ خریدے "۔ اب منشا کی آواز کچھ تیز تھی۔

"منشا! کیا کر رہی ہو۔ " امی اب اسے غصہ سے دیکھتے ہوئے اسے وہاں سے اٹھانے لگیں۔

"چلو جی۔آپ کی بیٹی تو دل میں بغض بھر کر بیٹھی ہے۔خواہ مخواہ کی بے عزتی ہم کیوں کروائیں۔ اٹھو فہمی۔اب ایک پل بھی یہاں نہیں رکنا ہے"۔وہ سب غصہ سے منہ بناتے ہوئے اٹھنے لگی تھیں۔

"اٹھ فہمی۔"اب آنٹی لڑکے سے مخاطب ہوئیں۔

"امی!جوس تو ختم کرنے دیں"۔وہ جوس منہ سے لگائے بولا تھا۔

"ہم جا رہے ہیں۔اچھی بے عزتی کر ڈالی آپ نے لیکن میں بھی کچھ کم نہیں۔آپ کو آپ کے سارے خاندان میں بدنام کر دوں گی۔کیا سمجھتے ہیں خود کو۔"ان کا غصہ سے برا حال ہو چکا تھا۔

"آپ جا سکتی ہیں آنٹی۔آپ ہمیں کیا بے عزت کریں گی۔میں نے ساری گفتگو ریکارڈ کی ہوئی ہے۔اب اسے انسٹا پر لگاؤں گی۔"لڑکی دیکھنا منع ہے"۔کے ہیش ٹیگ کے ساتھ۔دیکھتے ہیں کون بدنام ہوتا ہے اور کس کی عزت جاتی ہے۔"وہ اٹھ چکی تھی"۔امی بس اسے گھورنے میں مصروف تھیں۔

"آپ نے تو غلط آپشنز دیے تھے جی۔ انجینئرنگ تو چار سال کی ہوتی ہے۔"فہمی نام کے عجوبے نے جوس ختم کر لیا تھا اور اب اس کی بیٹری ری چارج ہو گئی تھی۔

"جی۔شکر ہے آپ کو یاد آیا۔آگے جہاں بھی جائیں۔یاد کر کے جائیں۔کوئی پوچھے تو جواب تو دینا آنا چاہیے۔"منشا کی خود اعتمادی عروج پر تھی۔امی کو لگ رہا تھا منشا کے اندر کی چڑیل جاگ گئی ہے۔

"جواب تو ہم آپ کو دیں گے۔"آنٹی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ منشا کو کھری کھوٹی سنائیں۔

"جی۔لیکن ہمارا جواب بھی سنتے جائیں۔ہمارا جواب نہیں ہے۔آپ کے فرزند کے لیے آپ کسی اور منڈی میں چلے جائیں۔شاید دام اچھے مل جائیں۔"منشا چڑیل یہ کہتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب بڑھی تھی۔اس کے بعد کیا ہوا منشا کو پتا نہیں۔

☆☆☆

"یہ لڑکی تو اچھی لگ رہی ہے۔بس یہاں بات بن جائے۔

"امی ایک فوٹو اپنی بڑی بیٹی کو دکھاتے بولیں تھیں۔

یہ رشتہ مجھلی بیٹی کے توسط سے آیا تھا۔لڑکی خوب صورت بھی تھی اور گورنمنٹ ٹیچر بھی۔اس لیے امی کا دل اس لڑکی پر آ گیا تھا۔

"کل آئیں گے۔وہ لوگ۔تم بھی تیار ہو جانا۔"اپنے کمرے کی جانب بڑھتے روشا کو دیکھا تو انہوں نے اونچی آواز میں کہی۔

"بیوٹی پارلر نہ چلا جاؤں۔"روشا کو لفظ تیار پر تپ چڑھی۔بہن کے بچے ہنسنے لگے۔

"ماما۔آپ سیلون چلی جائیں۔وہ آپ کو مکمل تیار کر کے بھیجیں گے۔"بارہ سالہ گڈو اسے مشورہ دے رہا تھا۔

"اور اس کا بل جو ہزاروں میں ہوگا۔وہ کون بھرے گا۔"

"ارے پیسوں پر یاد آیا ذرا ایک ہزار تو دینا۔ کل کے مہمانوں کے لیے بیکری سے کچھ کیک وغیرہ منگوالوں۔"امی کو جیسے ہی یاد آیا وہ اس کے سر پر جا کھڑی ہوئیں۔

"ہزار روپے۔امی صرف سموسے منگوالیں نکڑ والی دکان سے اور چائے۔فضول خرچی نہ کریں۔" پیسوں کا سن کر تو وہ اور بدک گیا۔

"گورنمنٹ جاب ہولڈر لڑکی ہے۔کسی طرح بھی یہ رشتہ ہاتھ سے جانے نہیں دینا۔"امی نے ہاتھ اٹھا کر اسے خبردار کیا۔

"چاہے میں جان سے چلا جاؤں مگر رشتہ نہیں جانا چاہیے ہاتھ سے واہ۔"وہ برے برے منہ بناتا اب اوپر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

☆☆☆

"اس وقت ڈرائنگ روم میں کل چھ لوگ

تھے۔ جس میں روشا اس کے ابو بھی شامل تھے۔ لڑکی والوں میں لڑکی کی پھوپھو، خالہ وغیرہ الگ روم میں بیٹھی تھیں اس وقت ڈرائنگ روم میں صرف مرد حضرات بیٹھے تھے۔ ٹی ٹیبل پر بکھرے سامان سے لگ رہا تھا کہ سب نے سیر ہو کر کھا لیا تھا اور اب چائے کا انتظار تھا۔ روشا نے ٹیبل کی درگت دیکھ کر سعد کو آواز لگائی تھی۔

کچھ دیر بعد سعد معنی خیزی سے روشا کو گھورتا سارے برتن سمیٹ لے گیا تھا۔ اس کی بے وقت کی مسکراہٹ نے روشا کو ایک اور بار جلایا تھا۔ مگر کیا کرتا ان لڑکی والوں کے نرغے میں پھنسا تھا جو بے تکے سوالات سے اسے زچ کر رہے تھے۔

"گریجویشن کے بعد آگے نہیں پڑھا آپ نے!" لڑکی کے والد نے کھنکار کر اس سے براہ راست پوچھا۔

"پڑھنا تو چاہ رہا تھا مگر ابا نے منع کر دیا کہ اب جاب دیکھ لو۔ آگے پڑھ کر کیا کرنا ہے۔" وہ صاف گوئی سے بولا تھا۔ جو سچ تھا وہ سچ تھا۔

ابا اسے خوں خوار نظروں سے دیکھ کر لب کچکچا گئے تھے۔

"اچھا۔ آپ کے پچھلے پیپرز تو کلیر ہیں نا۔" یہ لڑکی کے پھوپھا تھے جو روایتی گھر کے داماد والا انداز اپنا کر لیے دیے انداز میں بیٹھے تھے۔

"کلیر ہیں تب ہی تو جاب ملی ہے گو عارضی ہے ابھی مگر پاس ہوں ہر سبجیکٹ میں۔" روشا گو پاس تھا مگر امتیازی نمبروں سے تو نہیں تھا اس لیے اس کی آواز دھیمی ہی تھی۔

اچھا۔" پھوپھا معنی خیزی سے اسے گھورنے لگے۔

ان کی طنزیہ "اچھا" پر روشا کا دل جل کر کباب ہو گیا۔

"کون سی یونیورسٹی سے کیا ہے ماسٹرز۔" وہ پھر پوچھ بیٹھے۔

اس نے یونیورسٹی کا نام بتا دیا دیا۔

"کون سے سال؟"

اس نے سال! بھی بتا دیا۔ مگر اس پر وہ مطمئن نہیں لگے۔

"پیدائش کا سال" ایک اور انکل جن کو روشا نہیں جانتا تھا بیچ میں کود پڑے۔

اب روشا کی برداشت مانو ختم ہو گئی۔

"اپنا شناختی کارڈ اور مارکس کارڈ لا کر دوں۔ سب دیکھ لیں۔ ڈیٹ آف برتھ سے لے کر ہر چیز درج ہے۔ کب پیدا ہوا۔ کون سے سال پاس ہوا کونسے سال فیل۔ اور کس سبجیکٹ میں بقول آپ کے پیپر رہ گے۔ وہ سب درج ہے۔"

"بیٹا۔ برا مان گئے تم تو۔ ہم تو بس تسلی کے لیے پوچھ رہے ہیں۔ آخر لڑکی کی پوری زندگی کا سوال ہوتا ہے۔" ایک اور پوپلے منہ کے چچا نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں۔ اور لڑکے کی زندگی تو بس فری میں ملی ہوتی ہے جیسے۔" وہ دل ہی دل میں بڑبڑ کرنے لگا تھا۔

کچھ دیر خاموشی کا وقفہ رہا شاید روشا کے چہرے کے بگڑتے تیور سے وہ کچھ خائف ہو گئے تھے لیکن دس منٹ بعد لڑکی کے انکل جو جانے کون سے انکل تھے وہ شروع ہو گئے۔

"ذاتی مکان نہیں ہے آپ کا بھائی صاحب!"

"دراصل چار بیٹیوں کی ذمہ داری سر پر تھی جسکی وجہ سے ذاتی مکان لینے کا خیال ہی نہیں رہا۔" ابا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"بیٹیوں کی ذمہ داری واقعی بہت بڑی ہوتی ہے۔ لیکن بچیاں کہاں ہیں نظر نہیں آ رہیں؟" ایک معقول سے شخص نے اطراف میں نظریں دوڑائیں۔

"میری بہنیں بار بار میکے نہیں آتیں۔ آپ بالکل تسلی رکھیں۔" روشا تو آخر روشا تھا۔ ابا نے ایک اور بار گھورنا فرض سمجھا۔

دراصل تینوں بہنوں نے مشترکہ طور پر آج نہ آنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ کیونکہ اگر تینوں بہنیں اپنی

فیملی سمیت ادھر آ جاتیں تو اس وقت ڈرائنگ روم مچھلی بازار کا نمونہ پیش کرتا۔

"اچھا مذاق کر لیتے ہو بیٹے"۔ لڑکی کے ایک اور چچا ہنسے۔

اب دونوں انکل مل کر روشا پر ریپڈ فائر شروع کر چکے تھے۔

"کاروبار کیوں نہیں کیا؟"

"مجھے کاروبار بالکل پسند نہیں۔ کاروبار کا مطلب ہی "رو بار بار" ہے۔ کیونکہ جتنا پیسہ لگاؤ کاروبار ڈاؤن ہی رہتا ہے۔ اس لیے بار بار رونا ہی پڑتا ہے۔ روشا نے اپنے دل کی سچی بات کی تھی۔

"سگریٹ کا شوق ہے کیا۔"

"نہیں جی بالکل نہیں۔ دراصل میرے پاس اتنے پیسے بچتے ہی نہیں کہ سگریٹ وغیرہ کا اضافی خرچ برداشت کروں"۔ روشا نے اپنا دکھڑا رو دیا۔ ابا کے گھورنے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"بائیک تو ہے نا۔ یا آٹو یا بس سے کام پر جاتے ہو۔"

"میری اپنی بائیک ہے گو سیکنڈ ہینڈ ہے مگر مائلیج اچھا دیتی ہے۔ چھوٹا بچہ تھوڑی ہوں جو بس سے جاؤں۔ ہونہہ!"

"یار دوست کتنے ہیں۔ اور کہاں رہتے ہیں۔" اس سوال پر تو روشا کو فہد یاد آیا۔ وہ اس موقعہ پر اکثر موجود رہتا تھا۔ آج اپنے ذاتی مصروفیت کی وجہ سے وہ یہاں موجود نہیں تھا۔

"بہت ہیں۔ اکثر کا تعلق ہمارے محلے سے ہے۔"

"ہوں۔ محلے کے لچے لفنگوں سے یارانہ ہے!" لڑکی کے شرلاک ہومز جیسے پھوپھا نے آنکھیں گھمائی تھیں اور روشا کا دماغ گھوم گیا تھا۔

"توبہ کریں۔ سب معقول ہیں۔ بس میں ہی نامعقول ہوں۔ کچھ کچھ۔" روشا طنزیہ ہنسا تو سب ہی ہنسنے لگے۔

"ماشاء اللہ۔ تمہاری حس مزاح تو کمال کی ہے۔"

"جی۔ بس آپ لوگوں کی مہربانی ہے۔" روشا نے شرما کر سر جھکا دیا۔

کچھ دیر بعد وہ سب بھی جانے کے لیے اٹھ گئے تو روشا کی بھی جان چھوٹی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ یہ رشتہ کامیابی کی سیڑھی چڑھے گا۔ اور ایک ہفتہ بعد جب لڑکی والوں کا جواب حسب توقع آیا کہ انہیں لڑکا کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ ایک تو لڑکے کا قد کم ہے اور دوسرے لڑکا زبان کا بہت تیز ہے۔ ایسے لڑکے آگے چل کر سسرال والوں کا ناک میں دم کرتے ہیں اس لیے معافی چاہتے ہیں۔

اس انکار پر روشا تو بھڑک اٹھا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ ابا بھی اس پر چلائے تھے کہ

"کیا ضرورت تھی اتنی صاف گوئی سے بات کرنے کی۔ ذرا نرم خو نہیں بن سکتے تھے۔ خود کی نوکری عارضی۔ لڑکی گورنمنٹ ٹیچر تھی ساٹھ ستر ہزار تو ہر مہینے کے تھے۔ سونے کا انڈا دینے والی مرغی تھی۔ کچھ خیال کر لیتے۔"

"کہاں کہاں سے ڈھونڈ لاتے ہیں یہ ابا بھی محاورے۔ سونے کا انڈے دینے والی مرغی۔" وہ سوچ کر ہی ہنس پڑا تھا۔ "مگر افسوس۔ یہ مرغی میرے ہاتھ سے نکل گئی۔"

☆☆☆

دوسرے دن ابو نے اسے بلایا تو وہ دل ہی دل میں ڈرتی ان کے پاس چلی گئی۔

"ایسے کون کرتا ہے خشا۔ وہ تمہیں دیکھنے آئے تھے اور تم نے انہیں بے عزت کر کے بھیجا۔" ابو جیسے تیار ہی بیٹھے تھے۔ اس کے آتے ہی شروع ہو گئے تھے۔

"ابو جی عزت بے عزتی کی بات نہیں تھی۔ بات اصول کی تھی۔ انہوں نے دس لاکھ کی ڈیمانڈ رکھی تھی۔ تو مجھے غصہ آ گیا تھا۔" اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔

اس کے ہاتھ میں فون تھا جس کو دیکھتے ہوئے

حیران ہو رہی تھی۔ اس نے جو ویڈیو اپ لوڈ کیا تھا اس کے ویوز ایک لاکھ کے اوپر جا رہے تھے اور دھڑا دھڑ کمنٹس کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔

"یہی زندگی کا اصول ہے۔ تم نے جو کیا ہم اس کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتے۔" ان کے لہجے میں اس کے لیے محبت تو تھی مگر ساتھ لہجہ سخت رکھا تھا۔

"ابو جی۔ میں آپ کی بات سے اتفاق رکھتی ہوں مگر مجھے لگا کہ ایک بار تو ان نمونوں کو آئینہ دکھانا چاہیے۔" اس کا سر ہنوز جھکا تھا۔

"اب ویوز پچاس ہزار اور بڑھ گئے تھے۔ لوگ اس کی پوسٹ کو فالو اور شیئر کرتے جا رہے تھے۔ اور اب اس کی پوسٹ ٹرینڈنگ پر تھی۔

"اب آگے کیا کرو گی۔ لوگ تو باتیں بنائیں گے۔" ان کے استفسار پر اس نے اپنا جھکا سر اٹھایا۔

"ابو جی۔ میرے انسٹا پر ایک لاکھ فالوورز ہو گئے ہیں اور میری وہ پوسٹ ٹرینڈنگ پر ہے۔" "لڑکی دیکھنا منع ہے۔ بائیکاٹ اٹ"۔ اس نے دبے دبے جوش سے ابو جی کو آگاہ کیا تو وہ ششدر رہ گئے۔

"کیا۔"

"ابو جی۔ آئی۔ ایم سوری۔ مگر پلیز! آپ مجھے سپورٹ کریں۔ مجھے آپ کی سپورٹ کی ضرورت ہے"۔

اس نے اپنا فون ابو جی کے سامنے کیا۔ اس کی پوسٹ، لاکھوں لوگ دیکھ رہے تھے اور لائیک کر رہے تھے۔ کمنٹ کر رہے تھے۔ ابو جی حیران اسے دیکھنے لگے۔ کئی لڑکیاں اپنے تجربات بتا رہی تھیں۔ اس قسم کے دیکھنے سے کئی لڑکیاں مسترد ہونے کی وجہ سے ڈپریشن میں چلی گئی تھیں۔ اور کچھ نے کہا تھا وہ خودکشی تک سوچ چکی تھیں۔ کچھ والدین تھے جو منشا کا بھرپور ساتھ دینے کا وعدہ کر رہے تھے اور کچھ کہہ رہے تھے یہ تو اک رواج ہے اس سے فرار نہیں۔ کچھ نوجوان بھی تھے جنہیں منشا کی انقلابی سوچ اچھی لگی تھی۔ اور کچھ نے اس کا مذاق بھی اڑایا تھا۔

"منشا۔" انہوں نے اسے دیکھا۔ "میں تمہارے ساتھ ہوں۔" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

منشا تو خوشی سے پاگل ہو گئی تھی۔

☆☆☆

"کیا پھر سے انکار۔" فہد چلایا تھا۔ وہ آج اس کے پاس آیا تھا اور روشان نے ساری روداد سنا دی تھی۔

"ہاں اس بار تو وجہ میرا کم قد اور بدزبانی بنی ہے۔"

"اوہ"۔ فہد نے افسوس سے اسے دیکھا۔

"کبھی کبھی تو سوچتا ہوں کہ کاش میرے پاس بھی لڑکیوں کی طرح ہائی ہیلز ہوتیں اور میں لڑکی والوں کے سامنے ہیل والے سینڈل پہن کر جاتا تو۔ کم از کم پستہ قد تو نہ کہلاتا۔" روشان بے زار کن لہجہ میں اپنا حال دل بیان کر رہا تھا جبکہ فہد کو ہنسی آ گئی تھی۔

"مذاق نہیں کر رہا یار۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ جس طرح یہ لوگ قد پوچھتے ہیں اور پانچ فٹ پر منہ بنا لیتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ پوچھوں۔" آپ کو لڑکی کے لیے دولہا چاہیے یا فلم کا ہیرو۔ چھ فٹ کے لڑکے تو گھروں کے جالے لینے کے ہی قابل رہتے ہیں۔ اس سے ہٹ کر تو کوئی فائدہ نظر نہیں آتا ان چھ فٹوں کا......" وہ مسلسل اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہا تھا جبکہ فہد ہنستا جا رہا تھا۔ "اب اگر میں نے حقیقت پسندی سے کام لیا تو ان لڑکی والوں کو چبھ کے لگ گئے۔ کچھ غلط تو نہیں کہا تھا۔" روشان نے کرسی پر پیر پھیلا دیے تھے۔

"بات تو تمہاری صحیح ہے مگر ذرا اس ویڈیو کو دیکھو۔ کہہ تو یہ بھی ٹھیک ہی رہی ہے۔" "لڑکی دیکھنا منع ہے۔ بائیکاٹ اٹ۔"

فہد نے اپنا سیل فون روشان کے سامنے لہرایا۔ جہاں منشا حجاب میں لڑکی دیکھنے سے لے کر لڑکی ناپسند ہونے تک ایک لڑکی کن مراحل سے گزرتی ہے بیان کر رہی تھی۔

روشا نے ایک نظر دیکھا اور پھر سائیڈ میں کر دیا۔

"ان لڑکیوں کو یہی بتانا ہوتا ہے کہ ساری دنیا میں جتنے بھی مظالم ہوتے ہیں وہ سب ان لڑکیوں پر ہی تو ہوتے ہیں۔ بے چاریوں کو عید کے دن برتن دھونے کے کام پر لگایا جاتا ہے۔ جس کے لیے یہ دکھی اسٹیٹس لگادیں گی۔ کسی نے ان کے چپس کھالیے اور ان کی غمگین شاعری شروع۔

اور یہاں تک کہ ان کے پہنے ہوئے سوٹ کا رنگ اور فرینڈ یا کزن کے سوٹ کا رنگ ایک ہی رہا تو پس پنکھے سے لٹک کر جان دینا باقی ہوتا ہے۔

تو یہ ویڈیو بنائیں گی کہ مجھے کچھ کہنا ہے۔

ہاہاہا...... سچ اس سے بڑا لطیفہ تو کوئی نہیں"۔

روشا کے چہرہ پر طنزیہ مسکراہٹ آگئی تھی۔

"ہاں۔ لیکن یہ جو کہہ رہی ہے وہ بھی درست ہے۔ یہ لڑکیاں بھی تو کتنا کچھ برداشت کرتی ہیں اس بارے میں سوچنا چاہیے۔"

"اوہ۔ بھائی۔ فی الحال تو میرے بارے میں سوچو کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔" روشا نے اسے ٹوکا۔

"تمہیں ......" فہد سوچنے لگا۔ "میں کہوں گا کہ تم بھی اس ویڈیو کے جواب میں ایک ویڈیو بناؤ۔ "مجھے کچھ نہیں کہنا۔" تم اس میں اپنے تجربات شیئر کرنا کہ لڑکی یا لڑکا دیکھنے دکھانے کی رسم کی وجہ سے کتنے گھر بری طرح متاثر ہو رہے ہیں اور اس کی وجہ سے نہ صرف لڑکیاں بلکہ لڑکے بھی ایک ذہنی اذیت سے گزر رہے ہیں کیا تم ایسی ویڈیو بنا سکتے ہو۔" فہد اس سے پوچھ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد فہد اپنے موبائل فون پر ریکارڈنگ کر رہا تھا۔ اور روشا اپنے مخصوص دل جلے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"مجھے کچھ نہیں کہنا۔"

☆☆☆

وہ سب کالج کے گراؤنڈ میں جمع تھیں۔ آج بارہ سے ایک پیریڈ فری تھا۔ منشا جہاں بیٹھی تھی وہاں ہر دس منٹ میں کئی جونیئر لڑکیاں اس کے ساتھ سیلفیز لے کر جا چکی تھیں۔ کئی نے اس کے ڈیجیٹل آٹوگراف بھی لیے تھے۔ منشا ایک حیرت آمیز خوشی میں مبتلا تھی۔ راتوں رات وہ کالج کی مقبول ترین لڑکی بن چکی تھی۔

"بھئی کمال کر دیا ہماری منشا پاشا نے۔ اس لالچی فیملی کو وہ سبق سکھایا ہے کہ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔" سب سے پہلے فاطمہ بولی تھی۔ اور وہ سب اثبات میں سر ہلا رہی تھیں۔

منشا کے اس ویڈیو سے وہ لالچی فیملی روپوش ہو گئی تھی۔

"ویڈیو تو وائرل ہو گیا اور ہر گزرتا دن اس کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔"

"ہاں۔ لیکن ان محترم کو دیکھو جو کافی دل جلے لگ رہے ہیں۔ یہ منشا کے ویڈیو کے جواب میں اپ لوڈ ہوئی ہے۔

"مجھے کچھ نہیں کہنا۔" اور ذرا دیکھو۔ یہ ویڈیو بھی وائرل ہو رہی ہے۔" لائبہ نے فون آگے کیا۔ وہ منشا کا فون پکڑے ہوئے لائک کمنٹ دیکھ رہی تھی جب یہ ویڈیو اس کی نظروں میں آیا۔

وہ سب۔ غور سے بولتے ہوئے روشا کو سننے لگیں۔

"جی ہاں۔ مجھے کچھ نہیں کہنا۔ کچھ نہیں کہ یہ معاشرہ تو مرد کو ظالم ڈکلیئر کر ہی چکا ہے۔ لیکن کبھی ہم جیسے دل جلوں سے پوچھ لیں کہ ہم پر کیا کیا قیامتیں آئیں اور ایک قیامت آنی تو ابھی باقی ہے بیوی کی صورت۔ مگر وہ تو اس وقت آئے گی جب میرے پاس ایک بہت بڑا عالیشان سا بنگلہ ہوگا۔ اور میرا قد چھ فٹ ہوگا جو کہ نہیں ہے۔ اور میری بہنیں بھی نہ ہوں اگر ہوں بھی تو سب شادی شدہ ہوں۔ میکے زیادہ آتی جاتی نہ ہوں تو میرے سیلیکٹ ہونے کے چانسز زیادہ ہوں گے۔ اس کے علاوہ مجھے ہر ماہ تین لاکھ تو لازمی کمانا چاہیے ورنہ میری متوقع سسرال والوں کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تو میں اسی

لیے کہہ رہا تھا کہ مجھے کچھ نہیں کہنا۔

ہاں مجھے کچھ نہیں کہنا کہ ہم خواتین اور لڑکی والوں کے ستائے ہوئے ہیں۔ مگر ہماری سنے گا کون؟"

روشا بولتے جا رہا تھا۔ اور وہ سب دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھیں۔ ایک عام سا چہرہ لیکن لہجہ عام نہیں تھا۔ منشا اسے غور سے سن رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ ان دونوں کے خیالات اور جذبات ایک جیسے ہی تھے فرق صرف اتنا تھا منشا نے سنجیدگی اور متانت سے اپنی بات پیش کی تھی جبکہ روشا اپنے مخصوص کاٹ دار انداز میں اپنے نظریات پیش کر رہا تھا۔ اس میں کچھ شک نہیں تھا کہ عام ہوتے ہوئے بھی وہ ویڈیو عام نہیں تھی۔ شاید اسی لیے وہ بے حد پسند کی جا رہی تھی۔

"لڑکا چھ فٹ کا ہونا ہے بالکل سالار سکندر جیسا۔ چاہے وہ چونا لگانے والا یا دیواروں کے جالے ہٹانے والا ہی کیوں نہ ہو۔ تو اب اس بارے میں آپ کو کیا کہنا ہے۔ مجھے تو کچھ نہیں کہنا ہے۔"

یہ آخری لائن تھی روشا کی۔ اور وہ سب ہنس پڑیں تھیں۔ مسکراہٹ تو منشا کے چہرے پر بھی آ گئی تھی۔ اور اس کا ہاتھ بے ساختہ لائک کے بٹن پر چلا گیا تھا۔

"منشا۔ اس بے چارے کی تو بڑی دکھی کہانی ہے۔ ہم نے تو سوچا ہی نہیں تھا کہ ان لڑکوں کو بھی یہ سب سامنا کرنا ہوتا ہے!" فاطمہ قلق سے بولی۔

"ہاں۔ وہ بھی ایسی ذہنی کوفت میں مبتلا ہوتے ہوں گے۔ ہمیں خیال بھی نہ آیا۔" منشا نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور نہیں تو کیا۔ خود میرے بھائی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ کئی لڑکی والوں نے تین تین ان بیاہی نندوں کا سن کر لڑکی دینے سے انکار کر دیا۔ نندیں یعنی ہم جیسے خون پینے والی چڑیلیں ہوں۔"

اس کی بات سن کر ان سب نے اپنی مسکراہٹ دبائی تھی۔

"ویسے ان کا اندازہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ تم لوگ چڑیلوں سے کچھ کم ہو کیا۔"

اب وہ سب ہنس رہی تھیں اور فاطمہ سب کو مارنے دوڑی تھی۔

☆☆☆

"ابا۔ مجھے کل ایک مقامی چینل نے فون کیا ہے۔" روشا آج بے حد خوش تھا۔

"کیا غلط کیا ہے تو نے۔ جو انہوں نے تجھے بلایا ہے۔" ابا نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"کچھ نہیں۔ وہ تو بس مذاق مذاق میں جو وڈیو اپ لوڈ کی اسے لوگوں نے بے حد پسند کیا ہے۔ انٹرویو کے لیے بلا رہے ہیں۔" روشا نے لڑکی سے بڑھ کر شرما کر کہا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر اوٹ پٹانگ باتیں حرکتیں مت کرنا۔ لڑکی والے دیکھ کر کہیں رشتہ دینے سے ہی انکار نہ کر دیں۔" ابا نے جتانا ضروری سمجھا۔

"ابا۔ آپ بھی۔ وہ انٹرویو لیں گے میرا۔ رشتے کے لیے نہیں بلا رہے۔" رشتہ کے نام پر وہ بدمزا ہوا۔

"آپ چلیں گے۔" اس نے ابا کو پوچھا۔

لائیو پروگرام ہے یا ریکارڈڈ۔" انہوں نے پوچھا۔

"ریکارڈڈ ہے۔" اس نے ان سے زیادہ خود کو تسلی دی۔ ویسے بھی لائیو پروگرام سے ریکارڈڈ پروگرام زیادہ آرام دہ محسوس ہوتے ہیں۔

"ہاں تو پھر ٹھیک ہے۔ آ جاؤں گا۔" ابا نے بھی ہر رضامندی ظاہر کی۔

او کے۔ میں فہد کو بول دیتا ہوں۔" وہ اٹھا تھا۔ اسے کل کے پروگرام کے لیے تیاری بھی تو کرنی تھی۔

☆☆☆

وہ ریکارڈنگ روم میں بیٹھی تھی۔ آج اس مقامی چینل نے یہاں اسے بھی مدعو کیا تھا۔ وہ ابو کے

ساتھ آئی تھی۔ انہیں تین گھنٹے پہلے ہی بلایا گیا تھا۔ آج بھی اس نے سیاہ حجاب لیا تھا۔ بادامی رنگ کے فریم کے چشمے میں وہ جاذب نظر لگ رہی تھی۔ وہ پراعتماد تھی۔ کیونکہ اس کے ابو اس کے ساتھ تھے۔

"روشا۔ وہ لڑکی بھی یہیں ہے۔ بائیکاٹ والی۔" فہد نے اسے ٹہوکا مارا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر دیکھتا، انہیں اندر بلایا گیا تھا۔

اس اسٹوڈیو میں اینکر اپنی پوزیشن سنبھالے بیٹھا تھا جبکہ اس کے سامنے دو کرسیاں رکھ دی گئی تھیں۔ جو آمنے سامنے تھیں۔ ایک کرسی پر روشا بیٹھ چکا تھا جبکہ اس کے مقابل والی کرسی پر منشا بیٹھ چکی تھی۔ اسٹوڈیو ساؤنڈ پروف تھا۔ روشا اور منشا کے ابو باہر ہی بیٹھے تھے۔ فہد بھی ان کے ہمراہ تھا۔

اینکر نے مائیک سنبھالا تھا۔ اور اب وہ منشا اور روشا کے تعارف کے بعد منشا سے اس وائرل ویڈیو کے متعلق پوچھ رہا تھا۔

"ویڈیو بناتے ہوئے سوچا تھا کہ یہ وائرل ہو جائے گی۔ اور اس کے پیچھے کیا محرک تھا۔ شہرت یا سوشل ورک؟"

وہ منشا کی جانب دیکھ رہا تھا۔ منشا نے اپنا حجاب درست کیا تھا۔ وہ آج یہاں تھی تو اپنے اعتماد کی بنا پر۔ لیکن کچھ پل کے لیے وہ بھی نروس ہوئی تھی۔ لیکن جب اس نے بولنا شروع کیا تو پھر رکی نہیں تھی۔

"اس ویڈیو کو بنانے کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ تھا سماج اور ہمارے سماج میں پھیلی ہوئی کچھ ایسی رسمیں۔ جس سے لڑکی اور لڑکی کا خاندان متاثر ہوتا ہے۔ لڑکی دیکھنے آنا' لڑکی کی نمائش اور پھر اس لڑکی کے وہ عیب گنوانا جو کہ اس کی ظاہری شخصیت میں ہوں۔ اور اس بنا پر اس لڑکی کو ریجیکٹ کرنا۔ کوئی یہ کیوں نہیں سوچتا کہ یہ سب لڑکیوں کے لیے کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔ اور لوگوں کا لڑکیوں کو بھیڑ بکریوں کی مانند جانچنا۔ ان سب سے میں گزری ہوں۔ پھر بے جا مطالبات، جہیز کی آڑ میں رشوت لینا۔ لاکھوں کی رقم کا مطالبہ، کیا یہ سب ہمارے اسلامی معاشرہ میں جائز ہے۔

لڑکی سے ہزار سوال پوچھتے ہیں، اپنے بیٹے کی نااہلی کی کوئی شرمندگی بھی نہیں......

وہ بولتی جا رہی تھی۔ اور روشا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی آواز میں نرمی تھی۔ اور آنکھوں میں متانت۔ وہ اپنی بات کو خوب صورتی سے بیان کر رہی تھی۔ حجاب میں لپٹا چہرہ، حیادار آنکھوں نے روشا کو نظریں جھکانے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اس چہرے سے اپنی نظریں ہٹالی تھیں۔

اور شاید وہی لمحہ تھا جب منشا نے اسے دیکھا تھا۔ کسی بھی لڑکی کو گھورتے مرد اسے زہر لگتے تھے۔ عورت کو پردہ کا حکم ہے مگر مرد کو بھی ایک نظر کی ہی اجازت ہے۔ دوسری نہیں۔ اپنی نظروں کو جھکاتا وہ شخص اسے اچھا لگا تھا۔

آج وہ ٹی وی پر آ رہی تھی۔ اس نے سوشل میڈیا پر اپنی وڈیو اپ لوڈ کی تھی لیکن حجاب کے ساتھ۔ وہ بے پردہ ہوتے ہوئے بھی باپردہ ہی تھی۔ یہ اسے معلوم تھا۔

جب اس کی بات ختم ہوئی تو وہ ایک لحظہ مسکرائی تھی۔ اور بیٹھ گئی تھی۔

اینکر دوبارہ اٹھا تھا۔ اس بار اس کا رخ روشا کی جانب تھا۔ روشا نے مسکرا کر اپنا تعارف پیش کیا۔

"آپ نے کیا سوچا تھا۔ اس وڈیو کو پوسٹ کرتے ہوئے؟

"میری ایسی کوئی خاص چاہ نہیں تھی۔ یہ میرا دوست تھا جس نے کہا کہ محترمہ منشا فاطمہ کی وڈیو کے جواب میں ایک وڈیو ہونی چاہیے کیونکہ ان سب کا شکار صرف لڑکیاں نہیں ہو رہیں بلکہ لڑکے بھی ہو رہے ہیں۔ خود میں اس بات کا گواہ ہوں۔ تو بس میں نے اپنے دوست کی مدد سے وہ وڈیو بنائی اور اپ لوڈ کر دی...... " وہ ہنسا۔ "اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ وڈیو وائرل ہو گئی۔ اس سے میں کافی مقبول ہو چکا ہوں۔ جہاں بھی جاتا ہوں۔ مجھے پہلے کرسی پیش

کی جاتی ہے۔ چائے پوچھی جاتی ہے۔ مجھے ایک بہت اچھی کمپنی سے جاب بھی آفر ہوئی ہے اور یہ میرے لیے بالکل نیا تجربہ ہے۔ اور ابا جو مجھ پر اکثر جملے کستے تھے کہ نالائق ہے، نکما کچھ کرتا کیوں نہیں، تو وہ بھی اب کافی خوش ہیں اور یہ میرے لیے ایک اچھی علامت ہے۔"

وہ اپنے عام انداز میں کہہ رہا تھا جبکہ منشا کو اپنے چہرے پر آنے والی بے ساختہ مسکراہٹ چھپانی پڑی تھی۔

"میری اس وڈیو سے پہلے لوگ یہی سمجھتے کہ شاید لڑکیاں ہی اس رشتہ دیکھنے کی مہم کی شکار ہوتی ہیں۔ لیکن انہیں بھی میری ویڈیو سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہم بھی کچھ کم ذلیل نہیں ہوتے۔ ہماری بھی ظاہری شکل کو لے کر کئی طعنے دیے جاتے ہیں۔ کبھی کالا بھینسا کہا جاتا ہے تو کبھی مردانہ حسن سے محروم سفید خرگوش۔ موٹا ہو تو ہاتھی۔ دبلا پتلا ہو تو بانس کی طرح بس لمبا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم بکروں کی منڈی میں جا ٹھہرے ہوں۔ ہماری حالت قربانی کے بکروں جیسی ہو جاتی ہے اور ہمیں قربانی کے بکرے کی طرح چیک کیا جاتا ہے۔ کان ہیں یا نہیں۔ دانت ٹھیک ہیں نا۔ اور عمر بھی کم ہو۔ بہت بوڑھا نہ ہو۔ صحت مند بھی ہو اور قیمت بھی مناسب ہو، مطلب شادی کے لیے لڑکا پسند کر رہے ہیں کہ قربانی کے لیے بکرا؟

وہ خود ہی معنی خیزی سے ہنسا تو اینکر اور منشا بھی مسکرا پڑے تھے۔

"اب آپ بتائیں۔ یہ ظالم مردوں کا معاشرہ ہے؟ نہیں۔ یہ مردوں کا معاشرہ ہے نہ عورتوں کا بلکہ یہ بے ہودہ رسموں رواجوں کا معاشرہ ہے اور ہمیں ہی اس معاشرہ میں تبدیلی لانی ہے۔"

آخر میں روشا نے کچھ متعلقہ چٹکلے سنائے تھے جس سے وہ محفل گل و گلزار ہو گئی تھی۔

اینکر نے ان دونوں کا شکریہ ادا کیا تھا اور وہ دونوں باہر آ گئے تھے۔ منشا سیدھے اپنے ابو کی جانب چلی گئی تھی۔

فہد اس کے پاس آیا تھا۔

"سب ٹھیک رہا۔" وہ پوچھ رہا تھا۔

"ہاں۔" روشا نے اپنے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اطمینان سے کہا تھا۔

"ویسے یہاں کے آثار مشکوک ہیں۔" فہد نے دھیرے سے بتایا۔

"کیوں کیا ہوا۔" روشا حیران ہوا۔

"ارے۔ تم دونوں اندر انٹرویو دے رہے تھے۔ اور ادھر تم دونوں کے والد گرامی ایک دوسرے کے گھریلو معاملات ڈسکس کر رہے تھے اور اب بات یہاں تک پہنچی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے فون نمبرز بھی ایکسچینج کر چکے ہیں۔" فہد چلتے چلتے اسے معلومات دے رہا تھا۔

"کیا۔" روشا کو حیرت نے آن گھیرا۔ اس نے اپنے ابا کو دیکھا جو ابھی تک منشا کے والد کے قریب ہی کھڑے تھے۔ اور اب منشا کے سر پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔

"یہ ابا ان محترمہ کو کون سی دعا دے رہے ہیں؟" روشا نے آنکھیں بڑی کر کے دیکھنے کی کوشش کی۔

"دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو والی۔" فہد ہنسا۔

"لیکن کس کے لیے؟" روشا حیران ہوا۔

"ہو سکتا ہے تم دونوں کے لیے۔" فہد نے روشا کو معنی خیزی سے دیکھا۔

"ایسا بھی ہو سکتا ہے کیا؟" روشا نے دور کھڑے اپنے ابا کو اور منشا کو دیکھا۔

"تم دونوں کے والدین گرامی کے انداز تو یہی بتا رہے ہیں۔ دیکھتے ہیں یہ بیل منڈھے چڑھے گی کہ نہیں۔"

"اگر ایسا ہو تو برا بھی کیا ہے۔" روشا نے اپنی اسکوٹی کی جانب بڑھتی منشا کو دیکھ کر زیر لب کہا تھا۔

☆☆☆

آج صبح ہنگامہ خیز رہی تھی۔ منشا اور روشا دونوں کے لیے۔ روشا کے ابا نے کل سب بیٹیوں کو بلوا لیا

ا۔ منشا کے گھر جانے کے لیے۔ اور روشا کو بھی ساتھ ہی چلنے کے لیے کہہ دیا تھا۔

"میں کیوں جاؤں۔ بھلا وہاں میرا کیا کام؟" روشا بدک گیا۔

"ان کے لوگ بھی تمہیں دیکھ لیں گے۔ ابا نے بتایا تو وہ خاموش ہوا۔

"یہ کیا ابا۔ ابھی بھی تماشا بنانا ہے کیا۔" بے زار ہو چکا ہوں میں ان سب سے" وہ بددل ہو گیا تھا۔

"ان کی جانب سے ہاں ہے۔ یہ تو بس ضابطہ کی کارروائی ہے۔" ابا نے بتایا۔

"ہیں اگر بعد میں ہری جھنڈی دکھادی انہوں نے!" روشا کی اس بات پر ابا نے اسے گھور کر دیکھا۔

"یہ ہری جھنڈی، پیلی جھنڈی کیا ہوتا ہے۔ ایسی ہی باتوں سے لوگ تمہارے منہ پر انکار کر جاتے ہیں۔ بدتمیز۔" ابا اسے پھٹکارتے سب کو جلدی جلدی تیار ہونے کا کہنے کے لیے چلے گئے تھے۔

آج منشا کے گھر میں بھی کھلبلی سی مچی تھی۔ امی جہاں حیران ہو رہی تھیں وہاں ابو پرسکون سے تھے۔

"بات ہی طے کر کے آگئے آپ۔ لڑکا اچھا تو ہے۔ کیا کرتا ہے اور لوگ کیسے ہیں۔ ٹی وی پر انٹرویو کرنے کے لیے گئے اور بیٹی کے لیے لڑکا پسند کر لیا۔ اب پتا نہیں کیسا ہے۔ ایسے ہتھیلی پر سرسوں کیسے جما سکتے ہیں۔" وہ بولتی جا رہی تھیں ساتھ ساتھ دالان میں بکھرا سامان سمیٹتی جا رہی تھیں۔ ہاتھ تو گویا مشین بنے ہوئے تھے۔

"لڑکے کے والد صاحب سے بات چیت ہوئی تو وہ بھی ہماری طرح رشتہ کے مسائل میں گھرے ہوئے نظر آئے۔ آدمی معقول ہیں۔ بات چیت سے مہذب۔ بات نکلی تو بات سے بات نکلتی چلی گئی اور اس سے یہ پتا چلا کہ اچھے لوگ ہیں۔ لیکن لڑکی والوں کے بے جا شرائط کی چوٹ کھائے ہوئے ہیں۔ مجھے اپنا دکھڑا سنایا اور میں نے اپنا سنایا۔ تب ہم دونوں کو سمجھ میں آیا کہ ہم دونوں اپنے مسائل ایک دوسرے کی مدد سے حل کر سکتے ہیں۔ اب فون نمبر دے دیا۔ بات چیت ہوئی۔ میں نے لڑکے کو دیکھ لیا تھا اور انہوں نے ہماری لڑکی کو۔ بس پسند کر لیا۔ اور اب شادی کی تاریخ وغیرہ فکس کر لیں گے۔" ابا نے ادھر ادھر کاموں کے لیے بھاگتیں اماں کو روک کر بتایا۔

"لیکن منشا سے پوچھا۔"

"ہاں۔ اس نے تو کچھ نہیں کہا یعنی راضی ہی ہے۔ اب اگر وہ لڑکے کو لے آئیں گے تو دونوں کو ایک دوسرے سے بات کرنے کا موقع دے دیں گے تاکہ کچھ شکوک و شبہات ہوں بھی تو وہ بھی دور ہو جائیں۔" ابو نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے۔" دالان پر ایک طائرانہ نظر ڈالتی امی نے جیسے "ڈن" کہہ دیا تھا۔

☆☆☆

وہ دونوں اس دو بدو ملاقات کے لیے ایک دوسرے سے جھجکتے سبزیوں کی کیاریوں کے قریب کھڑے تھے۔ منشا یونہی ایک پودے کے پاس جا رک گئی تھی۔

"یہ چنبیلی کی بیل ہے، نا!" روشا کو کچھ تو بات کرنا تھا۔ تو اس نے آغاز کیا تھا۔

"نہیں یہ کریلے کی بیل ہے۔" منشا نے نفی میں سر ہلایا تھا اور آگے بڑھ گئی۔

"اوہ...... یہ...... یہ تو گلاب ہے شاید۔" اس نے گملے میں لگے ایک اور پودے کو دیکھا۔

"نہیں۔ یہ تو ہری مرچ کا پودا ہے۔" منشا ایک بار پھر نفی میں سر ہلا گئی۔

"وہ میں اس بارے میں زیادہ جانتا نہیں۔" وہ خجل سا آگے بڑھا تھا (کاش باٹنی اچھی طرح پڑھ لیتا)۔

"یہ تو ایلو ویرا لگ رہے ہیں۔ ہے نا۔" روشا نے اس بار پورے یقین سے کہا۔ منشا کو ہنسی آئی تھی۔

تھا۔ منشا کے گھر جانے کے لیے۔ اور روشا کو بھی ساتھ ہی چلنے کے لیے کہہ دیا تھا۔

"میں کیوں جاؤں۔ بھلا وہاں میرا کیا کام؟" روشا بدک گیا۔

"ان کے لوگ بھی تمہیں دیکھ لیں گے۔ ابا نے بتایا تو وہ خاموش ہوا۔

"یہ کیا ابا۔ ابھی بھی تماشا بنانا ہے کیا۔" بے زار ہو چکا ہوں میں ان سب سے" وہ بددل ہو گیا تھا۔

"ان کی جانب سے ہاں ہے۔ یہ تو بس ضابطہ کی کارروائی ہے۔" ابا نے بتایا۔

"ہیں اگر بعد میں ہری جھنڈی دکھادی انہوں نے!" روشا کی اس بات پر ابا نے اسے گھور کر دیکھا۔

"یہ ہری جھنڈی، پیلی جھنڈی کیا ہوتا ہے۔ ایسی ہی باتوں سے لوگ تمہارے منہ پر انکار کر جاتے ہیں۔ بدتمیز۔" ابا اسے پھنکارتے سب کو جلدی جلدی تیار ہونے کا کہنے کے لیے چلے گئے تھے۔

آج منشا کے گھر میں بھی کھلبلی سی مچی تھی۔ امی جہاں حیران ہو رہی تھیں وہاں ابو پرسکون سے تھے۔

"بات ہی طے کر کے آگئے آپ۔ لڑکا اچھا تو ہے۔ کیا کرتا ہے اور لوگ کیسے ہیں۔ ٹی وی پر انٹرویو کرنے کے لیے گئے اور بیٹی کے لیے لڑکا پسند کر لیا۔ اب پتا نہیں کیسا ہے۔ ایسے ہتھیلی پر سرسوں کیسے جما سکتے ہیں۔" وہ بولتی جا رہی تھیں ساتھ ساتھ دالان میں بکھرا سامان سمیٹتی جا رہی تھیں۔ ہاتھ تو گویا مشین بنے ہوئے تھے۔

"لڑکے کے والد صاحب سے بات چیت ہوئے تو وہ بھی ہماری طرح رشتہ کے مسائل میں گھرے ہوئے نظر آئے۔ آدمی معقول ہیں۔ بات چیت سے مہذب۔ بات نکلی تو بات سے بات نکلتی چلی گئی اور اس سے یہ پتا چلا کہ اچھے لوگ ہیں۔ لیکن لڑکی والوں کے بے جا شرائط کی چوٹ کھائے ہوئے ہیں۔ مجھے اپنا دکھڑا سنایا اور میں نے اپنا سنایا۔ تب ہم دونوں کو سمجھ میں آیا کہ ہم دونوں اپنے مسائل ایک دوسرے کی مدد سے حل کر سکتے ہیں۔ اب فون نمبر دے دیا۔ بات چیت ہوئی۔ میں نے لڑکے کو دیکھ لیا تھا اور انہوں نے ہماری لڑکی کو۔ بس پسند کر لیا۔ اور اب شادی کی تاریخ وغیرہ فکس کر لیں گے۔" ابا نے ادھر ادھر کاموں کے لیے بھاگتیں اماں کو روک کر بتایا۔

"لیکن منشا سے پوچھا۔"

"ہاں۔ اس نے تو کچھ نہیں کہا یعنی راضی ہی ہے۔ اب اگر وہ لڑکے کو لے آئیں گے تو دونوں کو ایک دوسرے سے بات کرنے کا موقع دے دیں گے تاکہ کچھ شکوک و شبہات ہوں بھی تو وہ بھی دور ہو جائیں۔" ابو نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے۔" دالان پر ایک طائرانہ نظر ڈالتی امی نے جیسے "ڈن" کہہ دیا تھا۔

☆☆☆

وہ دونوں اس دو بدو ملاقات کے لیے ایک دوسرے سے جھجکتے سبزیوں کی کیاریوں کے قریب کھڑے تھے۔ منشا یونہی ایک پودے کے پاس جا رک گئی تھی۔

"یہ چنبیلی کی بیل ہے، نا!" روشا کو کچھ تو بات کرنا تھا۔ تو اس نے آغاز کیا تھا۔

"نہیں یہ کریلے کی بیل ہے۔" منشا نے نفی میں سر ہلایا تھا اور آگے بڑھ گئی۔

"اوہ...... یہ...... یہ تو گلاب ہے شاید۔" اس نے گملے میں لگے ایک اور پودے کو دیکھا۔

"نہیں۔ یہ تو ہری مرچ کا پودا ہے۔" منشا ایک بار پھر نفی میں سر ہلا گئی۔

"وہ میں اس بارے میں زیادہ جانتا نہیں۔" وہ خجل سا آگے بڑھا تھا (کاش باٹنی اچھی طرح پڑھ لیتا)۔

"یہ تو ایلو ویرا لگ رہے ہیں۔ ہے نا۔" روشا نے اس بار پورے یقین سے کہا۔ منشا کو ہنسی آئی تھی۔

ایلو ویرا کو تو کوئی بچہ بھی پہچان لے۔

"جی۔"

وہ آگے بڑھے تھے۔ روشا نے اگلی بیل پر نظر ڈالی تھی۔

"یہ شاید......" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"منی پلانٹ ہے"۔ منشا نے خود ہی کہا۔ مبادا وہ اسے کوئی اور نام دے۔

"یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی۔ سارے آنگن میں کریلے کیکٹس ہری مرچ والے پودے لگائے ہوئے ہیں۔ گلاب موتیا سے کون سا گناہ سرزد ہوا تھا جو یہ چارے گملوں میں نہیں ہیں"۔ روشا کی فطری بے ساختگی عود کر آئی تھی۔

روشا کی اس منہ پھٹ عادت کو وہ سمجھ گئی تھی اس لیے اس نے اپنی ہنسی روک لی تھی۔

"دراصل ابا ذیابطیس کے مریض ہیں اس لیے ان کے لیے کریلے بنتے رہتے ہیں۔ ہری مرچ امی کو پسند ہیں وہ ہر سالن میں تازہ ہری مرچ ڈالنا اپنا فرض سمجھتی ہیں اور ایلو ویرا تو جو چھوٹی بہن ہے وہ اپنی اسکن کو لے کر کافی حساس ہے تو اس نے اپنے لیے لگایا ہے۔" اس کے اعتراض کو سمجھ کر اس نے اسے دور کرنے کی کوشش کی تھی۔

"اوہ۔ پھر وہ منی پلانٹ۔" روشا نے اس ساری توجیہہ کو غور سے سنا تھا۔

"منی پلانٹ کی بیل مجھے بہت پسند...... پانی میں بھی لگا دیں لگ جائے گی۔ جیسی بھی مٹی ہو وہ اپنی جڑیں بنا لیتی ہے کوئی سا بھی موسم ہو وہ گرو کرتی ہے۔ ہر موسم ہر مٹی اور ہر جگہ لگنا منی پلانٹ ہی کا کمال ہے۔

منشا جوش میں بولتی جا رہی تھی۔

"ہمم۔ منی پلانٹ کی بیل۔ لگتا ہے آپ بھی منی پلانٹ جیسی ہوں گی۔ ہر موسم ہر جگہ اپنی جڑیں جمانے والی۔" روشا نے اس پر ایک گہری نظر ڈالی تھی۔

منشا نے کچھ نہیں کہا تھا۔

"میں اگلی بار آؤں گا تو اس میں ہر رنگ کے گلاب لگے ہوئے ہونے چاہیے اور چنبیلی کی بیل تو ہونی ہی چاہیے۔ یہ کیا کریلے ہری مرچیں۔" وہ ہنس کر بول رہا تھا۔ جبکہ منشا اس کی بات "اگلی بار" پر اٹک گئی تھی۔

"اوہ۔ ایک بات جس کے لیے بزرگوں نے ہمیں ملنے کا موقع فراہم کیا ہے وہ کہ میں نے ماسٹرز کیا ہے۔ ایک اچھی کمپنی میں جاب مل چکی ہے۔ میری امی کو جاب کرنے والی لڑکی چاہیے تھی لیکن میرے لیے یہ اب ضروری نہیں۔ وہ آپ کی خواہش اور منشا پر منحصر ہوگا۔ اور جہیز دولہے کو دی جانے والی رقم وغیرہ کا میں قائل نہیں ہوں۔ نہ ہی اس قسم کا کوئی مطالبہ ہوگا ہماری طرف سے۔ اس بات کی گارنٹی میں دے سکتا ہوں اور......"

وہ کچھ دیر تک اس کے مسلتے ہوئے ہاتھ لرزتے پیر دیکھتا رہا۔ پھر سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا جہاں پر روکا تھا۔

"میری چار بہنیں ہیں جس میں تین تو شادی شدہ ہیں اور ایک غیر شادی شدہ۔ تو اس سے آپ کو کوئی اعتراض ہے کیا۔ یعنی چار چار نندیں۔"

"میری ایک بہن کی شادی کئی سال پہلے ہی ہو گئی تھی اب گھر میں ایک ہی بہن ہے اور مجھے اپنی بڑی بہن کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی ہے۔ تو مجھے آپ کی چار بہنوں سے کیا اعتراض ہوگا۔" منشا نے نظریں جھکا دی تھیں۔

"جی جی گڈ۔ یہی آپ سے امید تھی"۔ روشا ہنسا۔

"روشا" دروازے پر کھڑے فہد نے اسے پکارا تھا۔ "اگر تم دونوں کی پودوں پر ہر قسم کی ریسرچ مکمل ہو گئی ہو تو اندر آ جاؤ۔ شادی کی تاریخ فکس کر رہے ہیں۔"

"اوکے آ رہے ہیں ہم دونوں۔" روشا نے فہد کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا تھا اور پلٹ کر منشا کو دیکھا تو وہ "ہم دونوں" پر ہی بلش ہو گئی تھی۔

☆☆☆

"السلام علیکم ناظرین۔ آج ہم آپ سے ایک

ایسے کپل سے ملاقات کروانے جا رہے ہیں جو سوشل میڈیا میں آل ریڈی دھوم مچا چکا ہے۔ جی ہاں ہم محترمہ منشا اور روشان احمد کی ہی بات کر رہے ہیں۔ جنہوں نے معاشرہ کی ایک اہم لیکن تکلیف دہ رسم پر ویڈیوز بنائی تھیں اور راتوں رات مشہور ہو گئے تھے۔ آج وہ ہمارے ساتھ ایک کپل بن کر آئے ہیں لیکن یہ ایک صرف جوڑا نہیں بلکہ مثالی جوڑا بن کر آئے ہیں۔ انہوں نے نا صرف سادگی سے شادی کو ترجیح دی ہے بلکہ اپنی شادی میں کی جانے والی فضول خرچیوں سے بچ جانے والی رقم کو غریب بچے اور بچیوں کی شادی کے لیے محفوظ رکھ لیا ہے۔ اور اس کے علاوہ ان دونوں نے ایک مشترکہ چینل بھی بنایا ہے جس کا نام ہوگا۔

"ہمیں کچھ کہنا ہے۔"

اس کے تحت وہ معاشرہ کی ان رسم و رواج پر بات کرتے نظر آئیں گے جو اتنی عام ہو گئے ہیں کہ لوگ اسے برا بھی نہیں سمجھتے ملتے ہیں اس پیارے سے کپل سے۔" اینکر کا رخ اب ان دونوں کی جانب تھا۔

منشا نے سنہری عبایا پہنا تھا۔ ہلکے میک اپ کے ساتھ وہ مطمئن مسکراہٹ کے ساتھ اسکرین کو دیکھ رہی تھی جبکہ روشان نے آف وائٹ کرتا جس پر ہلکا سا گولڈن ورک تھا، پہنا تھا۔

"کیسے ہیں آپ دونوں۔" اینکر اب ان دونوں سے مخاطب تھا۔

"الحمدللہ۔ خوش ہیں۔" روشان ہنسا۔ جبکہ منشا نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔

"ہمیں کچھ کہنا ہے۔" کے حوالے سے کیا کہنا ہے۔"

"دیکھیے یہ ایک آغاز ہے۔ اور ایک انقلابی سوچ کے ساتھ معاشرہ میں ایک مثبت تبدیلی ضرور لائے گا۔ ہم دونوں کو اس پر یقین ہے۔ لوگوں کو اتنا تو شعور ہونا چاہیے کہ سچ کو سمجھیں۔ مانیں۔ اور غلط رسم و رواج پر آواز تو اٹھانی چاہیے۔ اس کے لیے ہم لوگوں کو ایک پلیٹ فارم دیں گے تاکہ وہ اپنی شکایتیں لوگوں تک پہنچائیں۔۔۔ اس طرح ہم ایک پلان لے کر چل رہے ہیں۔ ان شاء اللہ ہمیں ضرور کامیابی ملے گی۔"

"جی ضرور۔ اب آپ کی پرسنل زندگی کے بارے میں بات کریں۔ آپ نے منشا صاحبہ کو کیسا پایا۔"

"بالکل ایک منی پلانٹ کی بیل کی طرح۔ پھلتی پھولتی مگر جس کی ضرورتیں ناز نخرے کچھ نہیں۔ دھوپ ہو یا چھاؤں وہ اپنی جگہ مضبوطی سے ٹکی ہوتی ہے۔ میرے خیال میں ایک بیوی کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔" وہ منشا کو دیکھ کر ہنستے کہہ رہا تھا۔

"اور منشا آپ بتائیں روشان احمد ذاتی زندگی میں کیسے ہیں۔" اینکر اب منشا کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ بالکل ایک عام شوہر جیسے ہی ہیں لیکن ان کی حس مزاح کافی اچھی ہے اور شوہروں میں حس مزاح اچھی ہو تو بیویوں کے لیے زندگی سہل ہوتی ہے۔" منشا بولتے بولتے ہنسی تھی۔

"جی ان کو ہنسانے کے چکر میں اماں سے اکثر ڈانٹ پڑتی رہتی ہے کہ نالائق شادی کے بعد بھی نہیں سدھرا۔" روشان نے کچھ اس انداز میں کہا کہ اینکر نے بھی بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔

"آج کل کیا کر رہے ہیں۔ آپ دونوں۔"

"جی میں تو اپنی چار نندوں کے ساتھ کچن میں نئے نئے تجربے کر رہی ہوں جبکہ یہ آج کل آنگن میں گلاب موتیا لگانے کی تگ و دو میں لگے ہیں۔" منشا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"گریٹ۔ سو نائس۔ آپ دونوں یونہی ہنستے مسکراتے رہیں یہی دعا ہے ہماری۔"

اینکر نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے ان پر کیمرا فوکس کرنے کو کہا تھا۔

اب اسکرین پر ان دونوں کا ایک ہنستا مسکراتا پوز جگمگا رہا تھا۔

☆☆

اُمِ ہانی

تپتی دھوپ میں گھنی چھاؤں ہو تم



وقت تہجد اس کا الارم بجا، جس کی مدھم آواز سے ہی اسے جاگ آ گئی تھی۔ اس کی نیند بہت پکی نہیں ہوتی تھی اسی لیے وہ الارم ہمیشہ ہلکی آواز والا سیٹ کرتا تھا تاکہ دوسرے ڈسٹرب نہ ہوں۔ فجر سے آدھا گھنٹہ پہلے وہ جاگ جاتا تھا تاکہ تہجد پڑھ سکے۔ یہ عادت اسے بچپن سے ہی اسے بڑے تایا ابو سے ملی تھی۔

وضو کر کے جب وہ نکلا تو شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے میں موجود پانی کی بوتل خالی ہو چکی تھی۔ اب اسے پانی لینے کچن میں جانا ہی تھا کہ اس وقت تو سب ہی گھر والے سو رہے تھے۔ یہ گھر کا ڈرائنگ روم تھا جس میں ایک طرف بیڈ بھی لگا تھا سو وہ بیک وقت گیسٹ روم کے طور پہ بھی استعمال ہو جاتا تھا۔

اس نے پانی کی بوتل اٹھائی اور دبے قدموں اپنے کمرے سے نکل کر باہر ہال میں داخل ہوا۔ ہال درمیان میں تھا اور اس سے آگے ایک گیلری تھی جس کے دونوں اطراف میں کمرے تھے اور گیلری کا اختتام کچن پہ جا کر ہوتا تھا۔ اسی گیلری سے گزرتے ہوئے ایک کمرے کی نچلی درز سے بلب کی روشنی باہر آ رہی تھی اور ساتھ ہی سسکیوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس کے اٹھتے قدم خود بخود تھم گئے۔ اس نے سننے کی کوشش کی تو بس رات کے اس پہر ایک جملہ اس کی سماعت سے ٹکرایا۔ وہ ایک جملہ ایک دعا تھا جس نے اسے چونکا دیا تھا۔ وہی دعا جو وہ تب پڑھا کرتا تھا جب امی کی وفات ہوئی تھی۔

جب وہ تیرہ سال کا تھا اور امی کی جدائی کا دکھ اس سے سنبھالا نہیں جا رہا تھا تب بڑی تائی امی نے اسے تھپکتے ہوئے کہا تھا کہ بیٹا حضرت ایوبؑ کی دعا پڑھا کرو جو وہ دکھ اور تکلیف کی کیفیت میں پڑھا کرتے تھے۔ اس سے تمہارے سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔ وہ چھوٹا تھا اس لیے یہ نہیں سمجھ سکا کہ اس کے دکھ درد کیسے دور ہوئے کیونکہ امی تو واپس نہیں آئیں جن کے جانے کا دکھ ہی اس کی زندگی کا سب سے بڑا دکھ تھا لیکن جب وہ بڑا ہوتا گیا تو سمجھتا گیا کہ امی تو واپس نہیں آ سکیں لیکن اللہ نے اسے بڑی تائی امی کی صورت میں ماں عطا کر دی تھی۔ اس کے اندر انہی کے وجود سے سکون لکھ دیا تھا۔

اندر سے اسی دعا کے پڑھے جانے کی سسکیوں سے گھری آواز آ رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ آواز کس کی ہے۔ رات کے اس پل جب سب سو رہے تھے اور اندر موجود انسان اپنے دکھوں کو اللہ کے سامنے پیش کرتے رو رہا تھا تو اس کے وہ کیا معنی لیتا۔ یہی کہ کوئی اپنے گناہوں کی وجہ سے کم اور دوسروں کی دی گئی تکلیف کے سبب رو رہا ہے۔ اس لمحے اس پہ ادراک ہوا تھا کہ نیلو باجی نے جو کچھ بھی کہا وہ سو فیصد درست نہیں تھا۔ کہیں نا کہیں کچھ کمی تھی، کوئی کڑی ایسی تھی جو جڑنے سے رہ گئی تھی۔

ایک گہرا سانس لیتے وہ کچن سے پانی لے کر واپس مڑا۔ تب بھی بلب آن تھا لیکن شاید کچن میں کچھ کھڑ کھڑ سن کر اور اس بات کے خدشے سے کہ کوئی جاگ رہا ہے، اب وہ سسکیاں تھم گئی تھیں۔

☆☆☆

وہ ایک ہفتہ پہلے جب اس گھر میں برسوں بعد آیا تھا تو وہ رات کا وقت تھا۔ اس نے پہنچتے ہی اپنا سامان ڈرائنگ روم کم گیسٹ روم میں رکھا، منہ ہاتھ دھو کر لباس تبدیل کیا اور سب کے ساتھ کھانا کھانے کے لیے ہال میں آ گیا۔ ہال میں زمین پہ دسترخوان بچھایا گیا تھا۔ وہاں ڈائننگ ٹیبل نہیں تھا۔ بس ایک طرف رکھے صوفوں کے ساتھ کی درمیانی میز تھی جسے وہ کھانے کے لیے استعمال نہیں کرتے تھے کہ اس کا سائز ذرا چھوٹا تھا۔ کھانا زیادہ پر تکلف نہیں تھا۔ چنا پلاؤ، رائتہ، سلاد اور قیمہ آلو۔ لیکن اس کے لیے یہ کھانا بھی کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ گھر کے کھانے کی بات ہی اور تھی یہ اسے ایک ہفتہ ہوسٹل میں رہ کر سمجھ میں آ گیا تھا جہاں کے باسی اور مسالے دار کھانے کھا کر ہفتے میں ہی اس کا معدہ جواب دے گیا تھا۔ یوں بھی اب وہ مستقل اسی گھر میں رہنے آیا تھا تو

کھانے پہ اب روز روز تو اہتمام ہونا نہیں تھا۔ اور وہ کون سا کوئی کھانے پینے میں بہت نخرے والا تھا جو ناک بھوں چڑھاتا۔ جس جو ملا کھالیا۔

"باقی سب کھانے پہ نہیں آئیں گے۔؟" دسترخوان پہ بس نیلو باجی اور علی بھائی تھے۔ اس نے یونہی پوچھ لیا۔

"امی زیادہ تر بیڈ پہ ہی رہتی ہیں۔ انہیں چلنے پھرنے میں مشکل پیش آتی ہے جب سے فالج کا اٹیک ہوا ہے۔ اسی لیے ہم انہیں وہیں کھانا کھلا دیتے ہیں۔" علی بھائی نے وضاحت دی اور اپنی پلیٹ کھسکا کر اس میں کھانا ڈالنے لگے۔

جہاں تک اسے یاد تھا نیلو باجی کی کوئی نند بھی تھی جو ان کے ساتھ ہی رہتی تھی لیکن علی بھائی نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ تھا تو کچھ عجیب لیکن اسے پوچھنا ٹھیک نہیں لگا۔ کیا بلاوجہ کسی کی پرسنل زندگی کے بارے میں سوالات کرتا جب انہوں نے خود ہی اس کا ذکر کرنا بہتر نہیں سمجھا تھا۔

"کیا خبر وہ گھر پہ نہ ہو۔" اس نے سر جھٹکا اور کھانا ڈالنے لگا۔

"آفس یہاں سے زیادہ دور تو نہیں پڑتا؟" علی بھائی نے کھانے کے دوران پوچھا۔

نیلو باجی اسے مزید کھانا ڈال ڈال کر دے رہی تھیں جبکہ وہ انہیں منع کر رہا تھا کہ پہلے وہ اتنا تو کھا لے۔ ضرورت ہوئی تو وہ ڈال لے گا۔ کون سا وہ دو دن کا مہمان تھا۔ اب اسے چھ مہینے یہیں رہنا تھا جب تک اس کی ٹریننگ ختم نہیں ہو جاتی تھی۔

"دور نہیں ہے لیکن اتنا نزدیک بھی نہیں ہے۔" لیکن اس نے سوچا موٹر سائیکل ہے نا اس کے پاس تو پھر کیا غم ہے۔ یوں بھی ہوسٹل کا خرچا اور ایسے بدمزے کھانے کھانے سے بہتر چار پیسے پیٹرول پہ لگا لینے سے کم از کم گھر کا آرام تو ملتا تھا۔ اسی لیے وہ نیلو باجی کی پیشکش پہ ان کے گھر چلا آیا تھا۔

"صبح جلدی نکل جانا تاکہ وقت سے پہنچ جاؤ۔ لاہور کی ٹریفک بہت تباہی ہے۔" باجی نے اس کی پلیٹ پھر سے بھرنا چاہی تو اس نے منع کر دیا۔

"میں اتنا نہیں کھاتا اب۔" وہ ذرا شرمندہ ہوا۔

"لگتا ہے تائی امی تمہیں اچھے سے کھانے کو نہیں دیتیں۔" نیلو باجی نے یونہی مذاق میں کہا تو اس نے بھی مذاق میں ہی لیا۔

"ان کے گھر کا سارا کھانا میں ہی تو کھاتا ہوں اور کون ہے وہاں کھانے کو۔ البتہ جب نیچے جاتا ہوں تو چھوٹی تائی سارا کھانا چھپا لیتی ہیں۔"

نیلو نے اس کی شرارت پہ اس کے سر پہ چپت لگائی۔ اس کی امی کے بارے میں وہ یونہی اکثر چھیڑتا تھا کیونکہ وہ کھانا بڑا ناپ تول کر بناتی تھیں۔ ان کا فلسفہ یہ تھا کہ کھانا بھلے کم پڑ جائے بس زیادہ نہ ہو۔

ہر کسی میں کوئی نہ کوئی کمی ہوتی ہی ہے اور چھوٹی تائی کا پیسے کے معاملے میں ہاتھ کھینچنا ہی ان کی سب سے بڑی خامی تھی جو ایک زمانہ جانتا تھا۔ قصور ان کا بھی اتنا نہیں تھا کہ ایک چھوٹے تایا کمانے والے تھے اور ماشاءاللہ دو بیٹیاں اور بیوی کھانے والی تھیں۔ اوپر سے ان کے والد بھی انہی کے ساتھ نیچے والے پورشن میں رہتے تھے جن کی ساری ذمہ داری بھی چھوٹے تایا کے سر تھی۔ ایسے میں بجٹ چلانے کے لیے دیکھ بھال کر گزارا کرنا پڑتا تھا۔ حالانکہ بڑے تایا ابو ہمیشہ سے ایک بڑی رقم چھوٹے تایا ابو کو مدد کی مد میں دیا کرتے تھے کہ ان کا گزارا اچھے طریقے سے ہو سکے لیکن پھر بھی چھوٹی تائی امی کو لگتا کہ یہ بھی کم ہے۔

ان دونوں کا بچپن ساتھ ہی گزرا تھا۔ نیلو باجی یوں تو اس کی تایا زاد تھیں لیکن کوئی بھائی نہ ہونے کی وجہ سے مرتضیٰ کو ہی بھائی کا درجہ حاصل تھا۔ خود مرتضیٰ اکلوتا تھا اسی لیے اپنی کزنز کو ہی بہنیں سمجھتا تھا۔ خاص کر نیلو اور ان سے چھوٹی نائلہ کو۔ تینوں کی عمروں میں دو دو سال کا ہی تو فرق تھا۔

ایک ساتھ کھیلے اور پلے بڑھے تھے۔ آپس کی بے تکلفی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔

علی بھی ان کے رشتے سے واقف تھا اسی لیے

جب مرتضیٰ کو ٹریننگ کے لیے لاہور آنا پڑا تو نیلو نے اسے پیشکش کی کہ وہ اسی کے گھر آکر رہے۔ یہ تو بڑی تائی تھیں جنہوں نے مرتضیٰ کو روکا کہ نیلو کے گھر میں ایک کنواری نند بھی رہتی ہے۔ ایسے میں اس کا جاکر وہاں رہنا مناسب نہیں تھا۔ لیکن ہوسٹل اور اس کی آسائشات سے وہ جلد بھاگ جانے پہ مجبور ہو گیا۔ نیلو نے الگ سر کھا رکھا تھا کہ جب ان کا گھر موجود تھا تو وہ کیوں ہوسٹل میں آکر رہ رہا ہے۔ اسی لیے مرتضیٰ کو اپنا سامان باندھ کر وہیں ٹھکانا کرنا پڑا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ سیدھا ڈرائنگ روم میں چلا گیا اور اپنا ضروری سامان نکالنے لگا۔ اب یہ ڈرائنگ روم اسی کے زیر استعمال رہتا تھا تو اس نے اپنے حساب سے اپنا سامان سیٹ کرنا شروع کر دیا۔ کھانے کے برتن سمیٹ کر نیلو باجی بھی قہوہ ٹرے میں رکھ کر وہیں چلی آئی تھیں۔

"آرام سے رہو اور اسے اپنا ہی گھر سمجھنا۔ کوئی بھی مسئلہ ہو تو مجھے کہہ سکتے ہو۔ یہ میرا گھر ہے تو اس پہ میرے بھائی کا بھی پورا حق ہوا نا۔" قہوہ انہوں نے سامنے میز پہ دھرتے اسے ریلیکس کرنے کے لیے کہا تھا۔

"آپ کی ساس اور نند میری وجہ سے بے آرام تو نہیں ہوں گی؟" علی بھائی کے سامنے تو وہ یہ کہہ نہیں سکتا تھا لیکن نیلو باجی سے بے تکلفی اور قسم کی تھی۔

"ساس تو اپنے کمرے سے باہر آنے جانے کی محتاج ہیں اسی لیے وہ باہر نکلتی ہی نہیں ہیں۔ نند سمجھو نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ وہ بس ہفتہ وار مشین لگانے اور گھر کی صفائی کرنے کے لیے ہی کمرے سے باہر آتی ہے۔ تب تم گھر پہ کہاں ہو گے۔ سوا سے کیا تنگی ہو سکتی ہے بھلا؟ کہا نا اپنا گھر سمجھ کر رہو۔" نند کا ذکر کرتے ہوئے ان کے لہجے میں استہزاء تھا جو مرتضیٰ سے چھپا نہ رہ سکا۔

"وہ کمرے سے باہر کیوں نہیں آتی۔؟" وہ پوچھے بنا نہیں رہ سکا۔

"علی اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتے۔ اسی لیے وہ اسی وقت باہر آسکتی ہے جب علی گھر پہ نہ ہوں۔"

"مگر ایسا کیوں۔؟" وہ الجھ گیا تھا۔

"اس کے کرتوت ہی ایسے ہیں۔" ان کے عجیب طنزیہ بھرے لہجے پہ مرتضیٰ کا چونکنا بنتا ہی تھا۔ وہ ایسے بات کہاں کیا کرتی تھیں۔ یا شاید وہ میکے والوں کے لیے ایسے بات نہیں کرتی تھیں لیکن سسرال والوں کے لیے ان کا لہجہ ایسا ہی تھا۔

"کیسے کرتوت؟"

"چکر تھا ایک لڑکے کے ساتھ۔ تمہارے بھائی کو پتا چل گیا۔ پھر تو ایسی کھنچائی ہوئی کہ بس مرتے مرتے ہی بچی تھی۔ تب ہی سے اسے اس کے کمرے تک محدود کر دیا گیا ہے۔" ایسی بات وہ بڑے مزے سے بتا رہی تھیں۔ مرتضیٰ کو برا لگا تھا۔ یہ کسی کی پردہ داری کی بات تھی۔ نیلو باجی کو یوں اس کا تذکرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بات بدلنے کے لیے اپنے سامان سے ایک شال نکال کر سامنے رکھی۔

"چھوڑیں باجی۔ یہ دیکھیں۔ بڑی تائی امی نے آپ کے لیے بھیجی ہے۔" نیلو باجی نے جھٹ پٹ شال اٹھا کر دیکھی۔ اس کے کپڑے کو ہاتھ میں تھام کر دیکھا اور مسکرا دیں۔

"اچھی ہے۔ کل کال کر کے شکریہ ادا کر دوں گی۔"

پھر وہ اٹھ کر جانے لگیں۔ جاتے جاتے یکدم رکیں اور مڑیں۔

"علی کے سامنے بھولے سے بھی اس کا ذکر مت کر بیٹھنا۔ انہیں اس کا ذکر بالکل نہیں پسند۔ اور خود بھی کوشش کرنا کہ اس سے دور ہی رہو۔"

مرتضیٰ بس ایک گہری سانس بھر کے انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔

نجانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ یہاں آکر اس نے غلطی کر دی ہے۔ اس گھر کے اندرونی حالات کچھ ایسے اچھے نہ تھے کہ یہاں رہا جاتا۔ جس گھر میں پہلے سے ایک تناؤ اور جنگ کی سی کیفیت

چل رہی ہو اور لوگ ایک دوسرے کی شکل تک دیکھنا گوارا نہ کریں وہاں باہر والے کو اس کا حصہ بننے سے اجتناب کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔

☆☆☆

اس دن اسے چھٹی تھی تو وہ تینوں ناشتے پہ اکٹھے تھے۔ نیلو باجی نے اس کے سامنے مزیدار گرما گرم آلو کے پراٹھے رکھے تو اس کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ نیلو باجی کے ہاتھ میں ہمیشہ سے بہت ذائقہ تھا۔ سادہ کھانا بھی ایسے بناتیں کہ بندہ ہاتھ نہ روک پاتا۔

"ٹریننگ ٹھیک جا رہی ہے؟"

علی بھائی کم گو تھے اس نے یہ نوٹ کیا تھا۔ وہ نیلو باجی سے بھی کم ہی مخاطب ہوا کرتے تھے۔ نجانے ہمیشہ سے ایسے تھے یا ذمہ داریوں اور حالات نے ایسا کر دیا تھا۔

"ٹریننگ تو ٹھیک ہی ہوا کرتی ہے۔ کام سکھانا ہوتا ہے تو باس سختی تو کرتے ہیں۔ لیکن اگر یہ ٹریننگ اچھے سے مکمل ہو گئی تو اس کے بعد نوکری کے چانس بہت زیادہ ہیں۔"

انہوں نے جواب میں بس 'ہونہہ' کہا اور ناشتا کرتے رہے۔

سامنے ٹی وی چل رہا تھا جس پہ کوئی شو لگا ہوا تھا۔ علی بھائی جب گھر پہ ہوتے تو ٹی وی کے سامنے ہی بیٹھے رہتے۔ انسانوں سے بات کرنے میں ان کی دلچسپی کم لگتی تھی جبکہ نیلو باجی اتنی ہی باتونی تھیں۔ شروع میں وہ کتنے دن یہ سوچتا رہا کہ دونوں کا گزارا کیسے ہوتا ہو گا اور نیلو باجی سارا دن کس سے بات کرتی ہوں گی لیکن جلد ہی اس پہ یہ بات کھل گئی کہ وہ پورا دن محلے میں ہی گھومتی پھرتی رہتی تھیں۔ انہوں نے کافی سہیلیاں بنا رکھی تھیں تو کبھی کسی کے گھر اور کبھی کسی کے۔ گھر کے کام کاج زیادہ تر ان کی نند کے ذمے تھے کیونکہ اس نے نیلو باجی کو سوائے کھانا پکانے کے کوئی کام کرتے دیکھا نہیں تھا۔ دیکھا تو ان کی نند کو بھی نہیں تھا لیکن انہوں نے خود ہی ذکر کیا تھا کہ کپڑے دھونا اور صفائی ستھرائی اسی کی ذمہ داری تھی۔

چھٹی کے دن بھی نیلو باجی ناشتے کے برتن کچن میں پہنچا کر کمرے میں جا گھسیں۔ وہ وہیں علی بھائی کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھتا رہا۔ پندرہ منٹ بعد نیلو باجی تک سک سی تیار ہو کر باہر نکلیں۔

"اچھا میں بینا کے گھر جا رہی ہوں۔ ہم نے آج بازار جانا تھا تو مجھے کچھ رقم چاہیے تھی۔"

"امی کو ناشتا کروا دیا تھا؟" اس گھر میں ان کو کسی کی پروا تھی تو بس امی کی۔ ان کے بارے میں وہ پوچھنا نہیں بھولتے تھے۔

"سب سے پہلے انہیں ہی ناشتا کروایا تھا پھر خود کیا تھا۔ آپ کو پتا ہے کہ میں امی کے معاملے میں کبھی لاپروائی نہیں برتتی۔ ویسے بھی گھر کے سارے معاملات میرے سر ہی تو ہیں۔ کبھی شکایت ہوئی جو اب ہو گی۔"

علی بھائی نے سر ہلایا اور اپنی جیب سے والٹ نکال کر ان کی طرف بڑھا دیا۔ باجی نے اپنی مطلوبہ رقم نکالی اور "خدا حافظ" کہہ کر یہ جا وہ جا۔

کچھ دیر وہ وہیں بیٹھا رہا پھر بوریت کا شکار ہو کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اپنے لیپ ٹاپ پہ وہ ٹریننگ پہ سکھائے گئے کام کے نوٹس کو پڑھتا رہا۔ ناشتا تو اس نے جی بھر کر کیا تھا لیکن پانی کی طلب اسے کچن تک گھسیٹ لائی کہ کمرے میں پڑی واحد بوتل خالی ہو چکی تھی۔ اسی لیے دن میں کئی بار اسے اپنی پانی کی بوتل بھرنے کے لیے کچن کا رخ کرنا پڑتا تھا۔ لاہور کی گرمی تھی بھی تو بہت زیادہ۔ پھر یہاں اپنے گھر کی طرح اس کے کمرے میں اے سی بھی نہیں تھا اسی لیے اسے گرمی بھی زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ نیلو باجی ہوتیں تو اسے کمرے سے نکلتا دیکھ کر یہ کام خود کر دیتیں لیکن اب وہ گھر میں نہیں تھیں تو اسے یہ کام خود ہی کرنا تھا۔

کمرے سے باہر نکلا تو لاؤنج خالی تھا۔ علی بھائی شاید دکان پہ جا چکے تھے۔ وہ سیدھا کچن کی

جانب بڑھا تو دروازے پہ پہنچ کر ہی ٹھٹک گیا جہاں ایک نوعمر سادہ سی لڑکی سر پہ دوپٹا جمائے روٹی بیلنے میں مصروف تھی۔ یقیناً وہ نیلو باجی کی نند ہی تھی لیکن اسے حیرت اس بات پہ ہوئی کہ وہ تو بہت کم عمر دکھائی دیتی تھی جیسے میٹرک کی بچی ہو۔ اسے تو لگا تھا کہ وہ کوئی بیس پچیس سال کی لڑکی ہوگی۔ بالکل سادہ کالی قمیص کے ساتھ سادہ سفید شلوار اور دوپٹا لیے وہ خود بھی اسی سادگی کا ایک حصہ تھی۔ بال اتنے لمبے تھے کہ دوپٹے کے نیچے سے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ مرتضیٰ کی پہلی نظر نے ہی تجزیہ کیا کہ یہ لڑکی ایسی نہیں ہو سکتی جس کا کردار برا ہو۔ اس نے معصومیت اور سادگی کی ایسی مثال پہلے کم ہی دیکھی تھی۔

دروازے میں کسی کی موجودگی کے احساس سے وہ پلٹی۔ مرتضیٰ کو کھڑا دیکھ کر اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔

"اس..... لام..... علیکم۔" اس نے ٹکڑوں میں سلام کیا۔

کیا وہ جانتی تھی کہ وہ کون ہے یا اسے اپنا تعارف کروانا چاہیے تھا۔ تعارف کروانا بنتا تو نہیں تھا کہ اسے وہاں رہتے ہفتہ ہونے والا تھا۔ بھلے وہ اپنے کمرے تک محدود تھی لیکن یقیناً وہ گھر میں اس کی موجودگی سے واقف ہوگی۔ بس شاید یہ امید نہیں کر رہی تھی کہ وہ یوں اچانک اس کے سامنے کھڑا ہوگا۔

"وعلیکم السلام۔ سوری، مجھے پانی لینا تھا اسی لیے یہاں آنا پڑا۔ آپ پلیز اپنا کام کریں۔ میں خود ڈال لوں گا۔" اسے وضاحت دینا پڑی کہ کہیں وہ کچھ اور نہ سمجھے۔ لڑکی نے سر ہلا کر جلدی سے رخ پھیر لیا۔

چولہے پہ ایک طرف چائے کا پانی ابل رہا تھا اور وہ اپنے لیے پراٹھا بنا رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں واضح لرزش تھی جسے مرتضیٰ نے محسوس کیا اور جلدی سے پانی کی ٹھنڈی بوتل لے کر باہر نکل گیا۔

اسے اندر سے تھوڑا برا لگا تھا کہ سب ناشتا کر چکے تھے اور وہ اب اپنا ناشتا بنا رہی تھی۔ نیلو باجی کم از کم اس کا ناشتا بنا کر اس کے کمرے میں ہی دے جاتیں۔ کیا خبر وہ دیر سے جاگتی ہو تب ہی نیلو باجی نے یہ تردد نہیں کیا ورنہ ساس کے لیے بھی تو وہی ناشتا بناتی تھیں۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ نجانے اصل بات کیا تھی۔ لڑکی کم عمر تھی لیکن اس نے اسے کبھی سکول کالج آتے جاتے نہیں دیکھا تھا تو یقیناً پڑھتی بھی نہیں ہوگی۔ کمرے سے بھی آج پہلی بار باہر دیکھا تھا۔ نجانے سارا دن وہ کمرے میں رہ کر کیا کرتی تھی۔ اس نے شانے اچکائے اور بوتل سے غٹا غٹ پانی پینے لگا۔

☆☆☆

وہ اکثر جب تہجد کے وقت جاگتا تو پانی کی بوتل بھرنے کے لیے کچن کی طرف جاتا۔ رستے میں ہی تمام کمرے پڑتے تھے۔ سب سو رہے ہوتے لیکن اس کے کمرے کی لائٹ آن ہوتی۔ وہ جاگ رہی ہوتی تھی یہ اس کی سسکیوں سے پتا چلتا۔ کبھی اس کی سسکیاں سنائی دیتیں اور کبھی بالکل خاموشی ہوتی۔

"یقیناً وہ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی ہوگی۔"

اس دن وہ اس کی سسکیوں سے بے چین ہو کر کمرے میں چلا تو آیا تھا لیکن اس کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ پھر وہ کافی دیر اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس لڑکی کی کوئی ایسی بات اسے کھٹک نہیں رہی تھی جس کی بنا پہ وہ سوچتا کہ اس کا کردار مشکوک ہے۔ الٹا اس سے جڑی سب ہی باتوں کے سرے ایک نتیجے تک جاتے تھے کہ وہ بے قصور ایک کمرے میں اپنی قید کاٹ رہی ہے۔

نیند نہیں آ رہی تھی سو وہ باہر نکل آیا۔ صحن میں کنارے کنارے کئی پودے پلاسٹک کی ٹوکریوں میں لگائے گئے تھے۔ ایک کونے میں تو اسے شملہ کے چھوٹے سے پودے بھی دکھائی دیے جن پہ تین عدد چھوٹے سائز کی شملہ مرچ لگی ہوئی تھیں۔ بڑی تائی امی نے بھی گھر میں ہر ٹوٹی بالٹی، ڈبے، کنستر میں

پودے لگا رکھے تھے اسی لیے اس کے لیے یہ ماحول مانوس اور اپنا اپنا سا تھا۔ وہ اپنے گھر میں بھی اسی طرح ٹیرس پہ نکل کر کرسی پہ پودوں کے ساتھ بیٹھ کر تازہ ہوا کھاتا تھا۔ اسے تہجد کے وقت سے فجر تک جاگنے کی عادت تھی۔ فجر پڑھتے ہی وہ سو جایا کرتا تھا اور دوبارہ آفس کے لیے ہی جاگتا تھا۔

باہر صحن میں بیٹھے اسے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ وہ چھت سے اترتی دکھائی دی۔ اس وقت فجر کی اذان بلند ہو رہی تھی اور ایسے وقت میں اس لڑکی کا اکیلے چھت سے اترنا۔ مرتضیٰ کا ماتھا اس وقت ٹھنکا۔ پہلے ہی اس لڑکی پہ ایک بھاری الزام تھا جس نے اس کی زندگی کو اس قدر مشکل بنا دیا تھا اور ایسے وقت میں وہ اکیلی چھت سے اتر رہی تھی۔ مرتضیٰ کو کچھ عجیب سا لگا۔

آخری سیڑھی پہ پہنچ کر اس کی نظر مرتضیٰ پہ پڑی تو ٹھٹکی جیسے کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔ کچھ گھبراہٹ اس کے چہرے سے عیاں ہوئی لیکن اس نے سر جھکا لیا اور خاموشی سے اس کے سامنے سے ہوتی ہوئی اندر چلی گئی۔ مرتضیٰ اسے خاموشی سے اندر بڑھتے دیکھتا رہا۔

"اس وقت اسے اکیلے چھت پہ جانے کی کیا ضرورت تھی۔ شاید نیلو باجی ٹھیک کہتی ہیں۔ اس لڑکی کا کردار ٹھیک نہیں ہے۔"

ایک روایتی سی سوچ اس کے ذہن کے پردے پہ ابھری۔ اس کی عادت نہیں تھی لوگوں کے بارے میں رائے قائم کرنے کی سو اس نے فوراً سے سر جھٹکا۔

"کردار کی ہلکی ہوتی تو تہجد کے وقت اٹھ کر روتی کیوں؟" وہ اب خود بھی نماز کے لیے اندر جا رہا تھا۔

اس کے بعد سے کئی دن اس نے تارہ کو چھت سے اترتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی موجودگی کے خیال سے وہ ڈر گئی ہو گی یا وہ سوچتی ہو گی کہ کہیں وہ گھر میں کسی کو بتا نہ دے۔ لیکن اس کا سوال اپنی جگہ تھا کہ اسے منہ اندھیرے اکیلے چھت پہ جانے کی ضرورت پیش ہی کیوں آئی تھی۔

☆☆☆

اس شام جب وہ آفس سے واپس آیا تھا تو گیٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ بنا کسی دستک کے اندر چلا آیا۔ لاؤنج میں نیلو باجی غصے سے تارہ کو ڈانٹ رہی تھیں۔

"بس مفت کی روٹیاں توڑنے کے لیے تمہیں رکھا ہوا ہے علی نے۔ ذرا جو کام کرنا پڑ جائے تو موت پڑ جاتی ہے۔ ایسے ٹوٹے ہاتھوں سے کام کرتی ہو کہ لگتا ہے کام ہوا ہی نہیں۔ آئندہ میں نہ دیکھوں کہ تم مرتضیٰ کے کمرے میں چیزوں کو ہاتھ بھی لگا رہی ہو۔ صفائی کے لیے جاتی ہو تو صفائی کیا کرو، چیزوں کا صفایا نہیں۔ ضرورت کیا تھی تمہیں اس کی کسی بھی چیز کو چھیڑنے کی۔ کسی کی کوئی چیز دیکھی نہیں اور شودی ہو گئیں۔" نجانے کیا ہوا تھا جو وہ اتنا غصہ کر رہی تھیں۔ سامنے کھڑی، سر جھکائے تارہ بالکل چپ چاپ رو رہی تھی۔ بنا سسکیوں کے آنسو ٹپ ٹپ اس کے گالوں سے بہتے فرش پہ گر رہے تھے اور کچھ اس کے کپڑوں میں جذب ہو رہے تھے۔ وہ اس دن بھی سادہ سی کالی شلوار قمیص میں ملبوس تھی جس پہ اس نے کاسنی شیفون کا سادہ دوپٹا اوڑھ رکھا تھا۔

مرتضیٰ کو کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اس گھر کا فرد ہے۔ نیلو باجی تو یوں چلا رہی تھیں جیسے وہ کوئی کام والی ماسی ہو بلکہ اس کے گھر میں تو بڑی اور چھوٹی تائی بھی ماسیوں پہ بھی ایسے نہیں چلائی تھیں جیسے وہ اپنی نند پہ چلا رہی تھیں۔ سامنے جو بھی انسان کھڑا ہو، گھر کا مکین یا گھر کا ملازم، کسی کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ اس پہ یوں چیخے چلائے۔

"اب یہ جو تم نے اس کی کتاب پھاڑی ہے تو اس کا حساب میں تم سے اور طریقے سے نکال لوں گی یہ یاد رکھنا۔ شکل گم کرو اب یہاں سے۔"

وہ کچھ حیران پریشان سا نیلو باجی کا لہجہ، الفاظ سن رہا تھا۔ اس نے کبھی نیلو باجی کو ایسے چیختے چلاتے نہیں سنا تھا۔ یہ ان کا نیا روپ تھا جو سامنے آیا تھا

۔شادی سے پہلے وہ کبھی ایسی نہیں تھیں۔ نہ ہی جب وہ میکے رہنے آتیں تو کبھی ایسا جاہلانہ رویہ دکھاتیں جس کا مظاہرہ وہ اب کر رہی تھیں۔

شاید ہم نے لوگوں کے مطابق اپنا رویہ سیٹ کر رکھا ہوتا ہے۔ کمزور کے لیے بدترین اور طاقت ور کے لیے بہترین۔ بیچ کے لوگوں کے لیے مزاج واجبی رہتا ہے۔

تارہ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو دروازے میں اسے کھڑا دیکھا۔ دکھ اور شرمندگی کی ملی جلی کیفیات اس کی آنکھوں میں ابھری تھیں۔ خود مرتضیٰ کے لیے یہ منظر ہضم کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس ایک پل میں اس نے اس لڑکی کی آنکھوں میں جو جذبات دیکھے وہ ناقابل بیان تھے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں دھنس جائے۔ وہ اتنی بے عزت اس ایک شخص کے سامنے ہی ہوئی تھی جو ان کے گھر مہمان بن کر ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ جلدی سے وہاں سے کمرے کی طرف بھاگتی ہوئی چلی گئی تھی۔ نیلو باجی نجانے کیا بڑبڑاتے ہوئے مڑیں تو سامنے اسے کھڑا پایا۔

"تم کب آئے مرتضیٰ؟" اس کی کتاب ایک طرف رکھ کر وہ بہ مشکل مسکرائیں۔ لہجہ بھی یکایک پگھل گیا۔ شاید اپنے بدترین رویے کی تلافی کے لیے مسکرانا ضروری تھا۔

"آپ اسے ڈانٹ کیوں رہی تھیں؟" اس نے ایک نظر اپنی کتاب پہ ڈالی جو کہ اشفاق احمد کی زاویہ کا دوسرا پارٹ تھا۔ وہ فراغت میں کتابیں پڑھنے کا عادی تھا اسی لیے اپنے ساتھ کچھ کتابیں ہمیشہ رکھتا تھا۔

"جاہل لڑکی۔ تمہارے کمرے کی صفائی کے لیے کہا تھا۔ اندر جا کر کتابیں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگی اور یہ پھاڑ دی۔ میں معذرت خواہ ہوں مرتضیٰ۔ میں علی سے کہہ کر نئی منگوا دوں گی تمہیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کتاب پہلے سے پھٹی ہوئی تھی۔" اس نے کتاب اٹھائی جس کا کور الگ ہو چکا تھا اور اندر کا حصہ الگ۔ اس کی یہ حالت پہلے سے تھی جسے ٹھیک کرنے کے لیے اس نے ٹیپ لگا رکھی تھی۔ ٹیپ ہٹ گئیں اور کتاب باہر نکل آئی۔

"اچھا!!! مجھے لگا کہ اس سے پھٹی ہے۔ دراصل میں کمرے میں گئی تو کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پہ گر گئی تو مجھے لگا کہ اسی سے پھٹی ہے۔" نیلو باجی ذرا کھسیا کر کہہ رہی تھیں۔

مرتضیٰ کی اس وقت خود بری حالت تھی۔ ابھی ابھی جس ناکردہ گناہ پہ اس نے تارہ کو بے عزت ہوتے دیکھا تھا اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اس کا مداوا کرے۔ ایک معصوم لڑکی کی محض ایک کتاب کے پیچھے اتنی بے عزتی کی گئی۔ خود اس نے کبھی اونچی آواز میں اپنے کسی ملازم اور ماتحت تک سے بات نہیں کی تھی اور یہاں نیلو باجی نے اپنی نند سے۔

"مجھے اس سب کی آپ سے توقع نہیں تھی نیلو باجی۔" اس نے تاسف سے انہیں دیکھا جن کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑا تھا۔ مسکراہٹ کٹی تھی اور وہ کچھ نادم سی ہوئی تھیں۔

اپنی کتاب لے کر وہ کمرے میں چلا آیا جہاں تازہ تازہ صفائی ہوئی تھی۔ اس کی بکھرائی تمام اشیاء ٹھکانے پہ تھیں۔ ہر شے شیشے سی چمک رہی تھی۔ اور یہ سب کرنے والی ابھی کچھ دیر پہلے اس کی نظروں کے سامنے بے عزت ہوئی تھی وہ بھی ایک ناکردہ گناہ کے لیے۔

ایک بار پھر سے ہاتھ میں تھامی ہوئی کتاب نے اسے شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں پہنچا دیا تھا۔

☆☆☆

رات تہجد کی نماز پڑھ کر وہ باہر صحن میں چلا آیا۔ تب ہی اس کی نظر چھت کی سیڑھیوں پہ جھلک دکھلاتے دوپٹے پہ پڑی۔ یقیناً یہ وہی تھی جو اس دن پھر سے کافی دنوں بعد اوپر گئی تھی۔ نجانے وہ کیا کرنے اس پہر اوپر جاتی تھی۔ یقیناً اسی طرح کی سرگرمیاں کرتے ہوئے وہ پہلے بھی پکڑی گئی ہوگی۔

وہ بے گناہ تھی یا گناہ گار وہ نہیں جانتا تھا لیکن ایسی ہر سرگرمی اسے مشکوک بنا رہی تھی۔

کچھ سوچ کر وہ دبے پیر اس کے پیچھے ہی چلا گیا۔ چھت پہ ایک طرف فرش پہ آلتی پالتی مار کے وہ یوگا اسٹائل میں بیٹھی، گہرے سانس اندر اتارتی، گنتی بھی کر رہی تھی۔ اردگرد سے مکمل بیگانہ وہ بس اپنی دھن میں تھی۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا یہ سب اسے ایک انوکھی خوشی دے رہا ہے۔ ایسی طمانیت اس نے پہلے اس کا سامنا ہونے پہ اس کے چہرے پہ نہیں دیکھی تھی۔

مرتضیٰ کو اپنی سوچ پہ افسوس ہوا۔ وہ اسے کتنا غلط سمجھ رہا تھا۔ اس وقت اس کے اوپر جانے نے تارہ کو اس کی نظروں میں مشکوک بنا دیا تھا۔ یقیناً وہ صبح کی تازہ ہوا میں چھت پہ یوگا کرنے آئی تھی۔ آخر انسان تھی، سارا دن کمرے میں بھائی کے ڈر سے پڑے پڑے اکتا جاتی ہوگی۔ ایسے میں علی الصبح جب سب سو رہے ہوتے تھے وہ کچھ دیر سب کی نظروں سے بچ کر تازہ ہوا کھانے اوپر آجاتی تھی تو اس میں کیا غلط تھا۔ کیوں ہماری سوچ اتنی محدود ہے کہ گھر کی چار دیواری میں بیٹھی لڑکی بھی ہمیں اپنے ہی گھر کے کسی حصے میں بیٹھی مشکوک لگنے لگتی ہے۔

کیا اسے ٹھہرنا چاہیے تھا یا چلے جانا چاہیے تھا۔ وہ کچھ دیر اسی کشمکش میں رہا۔

پھر اس نے کھنکار کر اسے متوجہ کیا۔ اس کی کھنکارنے کی آواز سے تارہ یکدم جھٹکا کھا کر اٹھی۔

"وہ۔ میں۔ یہاں۔" جیسے کوئی چور بڑی چوری کرتے ہوئے پکڑا جاتا ہے، اس کی ایسی حالت تھی۔ ہتھیلیاں پسینہ پسینہ ہو رہی تھیں۔

"ریلیکس پلیز۔ میں بالکل بھی آپ سے کچھ نہیں پوچھ رہا کہ آپ اس وقت یہاں کیوں ہیں۔" وہ نرمی سے کہتے ہوئے اس سے فاصلے پہ ہی کھڑا تھا۔

"وہ بھائی جان کو۔" وہ اتنی گھبرائی ہوئی تھی کہ اس سے بات تک نہ ہو پا رہی تھی۔

"علی بھائی کو میں کچھ نہیں بتاؤں گا آپ بے فکر رہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ بس ایکسرسائز کرنے ہی اوپر آئی ہیں۔ اس لیے پلیز گھبرائیں نہیں۔ اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔" اس نے بہت نرم لہجے میں اسے تسلی دی تھی تاکہ اسے نارمل کر سکے لیکن لگتا نہیں تھا کہ اس پہ کچھ زیادہ اثر ہوا تھا۔

"آپ کو ایکسرسائز کرنا پسند ہے؟" اس نے جھٹ سے سر ہلایا۔ اس کا انداز بہت معصومانہ تھا۔

"میں بچپن سے یوگا انسٹرکٹر بننا چاہتی تھی۔ مجھے اس وقت بھی اتنی مہارت ہے کہ اگر میں کسی ٹریننگ سینٹر چلی جاؤں تو مجھے جھٹ پٹ ٹرینر رکھ لیں۔" مرتضیٰ کو اس کی بات پہ حیرت ہوئی۔ وہ خواب دیکھنے والی لڑکی کیا زندگی جی رہی تھی۔

"اس دن جو کچھ ہوا۔ اس کے لیے میں بہت نادم ہوں۔"

"وہ کتاب میں نے نہیں پھاڑی تھی۔" اس نے جلدی سے وضاحت دی۔

"میں جانتا ہوں تارہ۔ وہ آپ سے نہیں پھٹی تھی۔ اس کی حالت تو پہلے سے خراب تھی۔ میں نے اسے کسی طرح جوڑ کر رکھا ہوا تھا۔ آپ کے ہاتھ سے بے اختیاری میں گری تو پھر سے بکھر گئی۔ لیکن میں اسے پھر سے جوڑ لوں گا۔"

اس کی بات پہ وہ خاموشی سے سر جھکائے کھڑی رہی۔ لب کچلتی، انگلیاں چٹخاتی ہوئی لڑکی کی اضطراری کیفیت عیاں تھی۔ اس کے انداز سے ایک عجیب قسم کا خوف جھلکتا تھا۔ مرتضیٰ کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ وہ کس بات پہ ایسی خوف زدہ ہے جبکہ وہ تو مسلسل اس کو تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں آپ سے معذرت خواہ ہوں کہ میری اس پھٹی ہوئی کتاب کی وجہ سے آپ کو اتنی ڈانٹ پڑی۔ میں نے نیلو باجی کو بتا دیا تھا کہ کتاب آپ سے نہیں پھٹی۔ اسی لیے وہ مزید کچھ نہیں کہیں گی۔" اس نے سر اٹھا کر مرتضیٰ کی جانب دیکھا۔ اس کی نظروں میں مرتضیٰ کے لیے احسان مندی تھی۔

"بہت شکریہ۔"

"شکریہ کی تو کوئی بات نہیں۔ جو سچ تھا میں نے وہی کہا۔ میں نیلو باجی کے رویے پہ معافی مانگتا ہوں۔ کاش کہ کوئی طریقہ ہوتا کہ میں اس واقعے کا مداوا کرسکتا۔" پھر یک دم اسے خیال آیا۔

"آپ کو کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔؟" کوئی کتابوں کا شوقین ہی دوسرے کی کتابیں یوں بے اختیار ہو کر اٹھا سکتا ہے۔ اس نے جھٹ سے سر ہلا دیا۔

"مجھے ناولز اور ڈائجسٹ پڑھنا بہت پسند ہے لیکن۔" اس نے یکدم گویا خود کو کچھ کہنے سے روک دیا۔

"لیکن کیا؟" تارہ نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ وہ بات مکمل نہیں کرنا چاہتی تھی جیسے وہ بات کہہ دینا کوئی بڑی قیامت لے آئے گا۔

"آپ چاہیں تو میرے کمرے سے ناولز لے سکتی ہیں پڑھنے کے لیے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" سارا دن کمرے میں مقید اکیلی لڑکی کے لیے وہ اتنا تو کرسکتا تھا۔ اس کی بات پہ تارہ نے پھر سے نفی میں سر ہلایا لیکن اس کے انکار میں جیسی بے بسی تھی اس سے مرتضیٰ نے اندازہ لگایا کہ اسے کتابیں پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔ پابندی نیلو باجی نے لگائی یا علی بھائی نے وہ نہیں جانتا تھا لیکن وہ اپنے اس شوق کو اس پابندی کی نذر کرنے کی پابند تھی۔

"آپ کالج میں پڑھتی ہیں۔؟" اس نے پھر سے نفی میں سر ہلایا۔

"کہاں تک پڑھا ہے۔؟" تارہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"بارہویں کے امتحان دینا تھے، نہیں دے سکی۔" اس جملے میں عجیب طرح کا درد تھا۔ مرتضیٰ کا اندازہ درست تھا کہ وہ ایک کم عمر لڑکی تھی۔

"تو اب آپ آگے پڑھنا نہیں چاہتیں؟" اس کی بات پہ تارہ نے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا۔

"ہمیں چلنا چاہیے۔ کسی نے دیکھ لیا تو بہت مسئلہ بنے گا۔"

مرتضیٰ کو جیسے ہوش آیا کہ وہ کس وقت اور کہاں کھڑا کس سے بات کررہا ہے۔ اس نے سر ہلایا اور واپس مڑ گیا۔ جب وہ صحن میں آکر بیٹھا تو ساتھ ہی فجر کی اذان بلند ہوئی اور کچھ دیر بعد ہی تارہ سیڑھیاں اتر کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

نجانے کیوں اسے اس لڑکی سے دوبارہ بات کرنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی تھی لیکن اس دن کے بعد وہ نہ تو تہجد کے وقت اسے چھت پہ دکھائی دی اور نہ ہی گھر کے کوئی کام کرتے ہوئے۔ معلوم نہیں کہ گھر میں کچھ ہوا تھا کہ وہ خود سے ہی اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے افسوس ہوا کہ اس نے ایک لڑکی کے لیے چھت کی تازہ ہوا کو بھی بند کر دیا تھا۔ کاش اس دن وہ خاموشی سے نیچے چلا آتا۔ اسے خبر ہی نہ ہوتی کہ وہ اسے اوپر دیکھ چکا ہے تو وہ اپنے معمول کے مطابق اوپر آتی رہتی۔

☆☆☆

ایک ویک اینڈ پہ گھر آیا تھا۔ جب سے ٹریننگ کے لیے گیا تھا گھر جانا ہی نہیں ہوسکا تھا۔ بڑی تائی امی بہت اداس تھیں۔ اس کے یہاں چلے آنے سے وہ اپنے پورشن میں بالکل اکیلی پڑ گئی تھیں۔ سارا دن نیچے چھوٹی تائی کے پاس گزار بھی لیتیں تو بھی رات تو اپنے گھر ہی سوتی تھیں۔ ایسے میں گھر کی خاموشی انہیں کھانے کو دوڑتی۔

اس کی آمد پہ تائی امی نے اس کی پسند کا ہی کھانا تیار کیا تھا۔ ان کی اپنی ایک ہی بیٹی تھی نازنین، جو شادی کے بعد آسٹریلیا چلی گئی تھی۔ عمر میں وہ مرتضیٰ سے بارہ برس بڑی تھی ورنہ تو تائی امی اسے ہی اپنا داماد بنا لیتیں تا کہ داماد اور بیٹی دونوں نظروں کے سامنے ہی رہتے۔

نازنین باجی کے جانے کے بعد تو تائی امی کی ساری دنیا مرتضیٰ ہی رہ گیا تھا۔ تایا جان کی وفات نازنین کی شادی سے ایک سال پہلے ہی ہوئی تھی۔ مرتضیٰ نے بھی ہمیشہ سے تائی امی کو ماں کا مقام دیا تھا

یہ ابو نے تو امی کی وفات کے بعد دنیا تیاگ ہی دی تھی۔ وہ چھوٹے تایا کے ساتھ انہی کے پورشن میں نیچے رہتے تھے۔ حالانکہ بڑے تایا ابو کی وفات کے بعد اس نے ابو سے کتنا کہا تھا کہ وہ اب ان کے ساتھ اوپر والے پورشن میں آ کر رہیں لیکن وہ نہیں مانتے تھے۔ گھر اوپر نیچے ایک ہی تھا تو بھی محسوس نہیں ہوا کہ ابو اس سے دور ہیں یا الگ رہتے ہیں۔ اوپر نیچے آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اس کی تعلیم اور پرورش کی ساری ذمہ داری ہمیشہ سے بڑے تایا ابو نے خود اپنے ذمے ہی رکھی تھی اور آگے بھی بڑی تائی امی ہی اس کا خیال رکھتی تھیں۔

ابھی بھی وہ نچلے پورشن سے ابو سے ملنے کے بعد، کچھ دیر ان کے ساتھ وقت گزارنے کے بعد اوپر تائی امی کے پاس آیا تھا ورنہ ابو ہمیشہ شکایت ہی کرتے کہ وہ ان کا بیٹا ہو کر ان سے زیادہ تائی امی کا بنتا ہے۔ مرتضٰی کی بھی کوشش رہتی کہ ابو کو اس سے اس حوالے سے شکایت نہ ہو لیکن تائی امی کے بالکل اکیلے رہنے پہ بھی اسے فکر ہوتی تھی۔ ابو مان جاتے اور اوپر ہی شفٹ ہو جاتے تو دو بوڑھے لوگ ایک دوسرے سے دکھ سکھ کر سکتے تھے۔

"تائی امی ایک بات تو بتائیں۔" کھانے کے دوران ہی تائی امی اس سے سب حال احوال پوچھتی رہیں۔ تب ہی اسے یکدم یاد آیا تو وہ پوچھے بنا رہ نہیں سکا۔ "یہ نیلو باجی کی نند کا کیا معاملہ ہے۔؟" تائی امی نے ایک گہری سانس بھری۔

"میں زیادہ کچھ نہیں جانتی۔ بس اتنا پتا ہے کہ یہی کوئی تین سال پہلے نیلو ایک بار گھر آئی تھی تو بتا رہی تھی کہ اس کی نند کا کسی لڑکے کے ساتھ چکر چل رہا تھا۔ علی کو پتا چل گیا تو بہت مارا۔ اس کے بعد سے اس کی پڑھائی چھڑوا دی اور اسے کمرے میں ہی بند کر دیا۔ اس کے بعد میں نے کبھی نہیں پوچھا کہ اب کیا صورتحال ہے لیکن تم ان کے معاملے سے دور رہو۔ نیلو جانے اور اس کی نند۔ یہ ان کے گھر کا معاملہ ہے۔"

مرتضٰی کو نیلو باجی کی ایسی حرکت پہ بہت غصہ چڑھا کہ ایک لڑکی کی عزت کو وہ کیسے ہر جگہ اچھال رہی تھیں۔ ہر کسی کے سامنے اس کا قصہ سنانے بیٹھ جاتیں۔ وہ پردہ بھی تو رکھ سکتی تھیں اس کا لیکن پردہ تو تب رکھتیں جب وہ اسے انسان سمجھتیں۔ اس دن جو اس نے آنکھوں سے دیکھا تھا اس کے بعد وہ ان سے کیا بھلائی کی امید کرتا۔ جتنا افسوس اسے ان کے اس روپ پہ ہو رہا تھا وہ ناقابل بیان تھا۔

"میں تو ان کے معاملے سے دور ہی ہوں تائی امی لیکن بس یونہی بھی اس لڑکی کے لیے دل دکھتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ بے قصور ہے۔ اسے جو بھی سزا دی جا رہی ہے وہ اس کی مستحق نہیں ہے۔" اس نے اپنے جذبات ان سے بانٹے۔ وہ انہی سے یہ سب کہہ سکتا تھا کہ وہ اس کی ماں تھیں۔

"یہ ان کے گھر کا معاملہ ہے مرتضٰی۔ تمہیں اس میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ اس گھر میں اس کی ماں ہے، بھائی ہے۔ وہ بہتر جانتے ہیں کہ اس کے ساتھ کیا کرنا ہے۔ تمہارا کسی معاملے میں بھی بولنا نیلو کے لیے مشکلات کھڑی کر سکتا ہے اور مجھے پتا ہے کہ میرا بیٹا اپنی بہن کے لیے ایسا کچھ نہیں کرے گا۔" تائی امی نے اسے بڑے طریقے سے سمجھانا چاہا۔

"لیکن جو بھی کر رہے ہیں غلط ہے نا۔ ایک کم عمر لڑکی سے اگر کوئی غلطی ہو بھی گئی تھی تو اسے سمجھا کر معاف کر دینا چاہیے تھا۔ کم عمری میں لڑکیوں سے کچھ نادانیاں ہو جایا کرتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب کہ اسے گھر کا فرد ہی شمار نہ کیا جائے۔ گھر کے کسی کونے میں فالتو سامان سمجھ کر پھینک دیا جائے۔ یوں اتنی کڑی سزا دینا زیادتی ہے۔" جو اس نے اتنے دن محسوس کیا وہ کہہ دیا۔

"مرتضٰی! تم مجھ سے یہ سب کہہ رہے ہو، کوئی بات نہیں۔ میں ماں ہوں تمہاری۔ لیکن کسی اور سے یہ سب مت کہنا خاص طور سے نیلو سے۔ تمہاری اس لڑکی کے لیے ہمدردی نیلو کے ساتھ ساتھ اس لڑکی کے لیے بھی نئی مسائل پیدا کر سکتی ہے۔ نیلو بیشک

تمہاری بہنوں جیسی ہے لیکن تارہ اس کی نند ہے۔ سسرالی رشتوں کے لیے اکثر ہمارا دل تنگ ہوتا ہے۔ان کی ایک اچھی بھی بری لگتی ہے اور بری تو ہوتی ہی بری بلا ہے۔ سو اس معاملے سے دور رہو تو اچھا ہے۔ کسی دوسری لڑکی کے لیے اپنی بہن سے تعلق مت خراب کرو۔" وہ آسان لفظوں میں اسے اتنا ہی سمجھا سکتی تھیں۔

مرتضیٰ نے گہری سانس لی۔

"اور جو ہمدردی جتانا، انصاف کے لیے آواز اٹھانا، کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہونے دینا جیسے سبق آپ ہمیں پڑھاتی رہی ہیں ان کا کیا ہوگا؟ وہ بس کتابی باتیں تھیں کیا، جن کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا؟"

بڑی تائی امی نے ایک بے بسی بھرا سانس لیا۔

"ہر بات عملی طور پہ ہر جگہ نہیں اپنائی جا سکتی بیٹا۔ بعض حالات اور معاملات بہت نازک ہوتے ہیں کہ ان کے لیے ہمیشہ کچھ جھکنا اور بدلنا پڑتا ہے۔ تم یہ سب کرو گے تو اس لڑکی کے لیے بہت سے مسائل اور سوالات اٹھیں گے کہ ایک غیر لڑکا کیوں اس کی ہمدردی میں یوں گرفتار ہے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ تمہاری وجہ سے اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ بنے؟"

مرتضیٰ نے ان کی بات پہ سر ہلایا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ تائی اسے کیا سمجھا رہی تھیں۔ لیکن اس جیسے زندہ ضمیر کے انسان کے لیے خاموش تماشائی بن کر سب دیکھنا مشکل تھا۔ اور جلد ہی اسے اپنی اس خاموشی کو توڑنا پڑا تھا۔

☆☆☆

نیلو باجی کے گھر کی وہی روٹین تھی۔ کچھ بھی کہیں نہیں بدلا تھا۔ جو کچھ تھا مرتضیٰ کو ڈسٹرب کرتا تھا لیکن وہ تائی امی کی تاکید کے مطابق خاموش رہتا تھا۔ تارہ سے بھی کبھار سامنا ہو جاتا، جب بھی ہوتا اسی طرح ڈری سہمی سی، نظریں جھکائے سادہ سے حلیے میں ملتی تھی۔

کچھ دن کے ناغے کے بعد تارہ نے پھر سے تہجد پڑھ کر چھت پہ جانا شروع کر دیا تھا لیکن مرتضیٰ اس دن کے بعد سے اس کے پیچھے نہیں گیا تھا۔ وہ مزید اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چھت پہ جا کر تازہ ہوا میں سانس لینے کی خوشی اس سے نہیں چھیننا چاہتا تھا۔

ہفتے اتوار کو اس کا آف ہوتا تھا۔ ایسے ہی ایک ہفتے کو جب علی بھائی دکان پہ جا چکے تھے اور نیلو باجی بازار تو وہ اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے سخت اوب گیا تھا۔ اسے موبائل اور انٹرنیٹ بہت زیادہ استعمال کرنے کی عادت نہیں تھی شاید اسی لیے کہ وہ فرصت میں کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ کتابیں سب ہی وہ پڑھ چکا تھا۔ لاہور میں تھا تو دل چاہا کہ اردو بازار کا چکر لگایا جائے۔ کچھ نئی کتابیں ہی خرید لی جائیں۔ یہی سوچ کر وہ تیار ہو کر باہر آیا۔ سارا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا جیسے گھر میں اس کے سوا کوئی موجود ہی نہ ہو۔ ایسی وحشت ٹپکتی تھی در و دیوار سے کہ کبھی کبھار اس کا وہاں سے بھاگ جانے کا دل کرتا لیکن یہاں رہنا مجبوری تھی۔

وہ ہال سے باہر صحن کی طرف بڑھا تو جالی کے دروازے کے پار اسے چارپائی پہ بیٹھی تارہ دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بھورے رنگ کا بھالو تھا جس سے وہ باتیں کر رہی تھی۔

"تم بتاؤ کیا میں نے اتنا بڑا گناہ کر دیا ہے کہ مجھے معافی نہیں مل سکتی؟ میں روزانہ اللہ سے معافی مانگتی ہوں۔ اللہ کی طرف سے تو مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے کب کا معاف کر چکا ہے لیکن وہ بھائی اور امی جی کے دل میرے لیے کیوں نرم نہیں کر رہا۔ کیوں ان کے دلوں میں نہیں ڈالتا کہ میں نے اتنا بڑا جرم نہیں کیا جتنی بڑی مجھے سزا مل گئی ہے۔ وہ کب مجھے اس قید سے نکالے گا یا ہمیشہ مجھے اسی قید میں رکھے گا؟"

اس نے بھالو کو سینے سے بھینچ لیا اور خاموش بہتے آنسو ہاتھ سے صاف کرنے لگی۔

مرتضیٰ کا دل کیا کہ وہ اس لڑکی کے تمام آنسو مٹا

دے۔ اسے تسلی دے۔ اس کی ہمت بندھائے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ تائی امی نے اسے اس گھر کے معاملات سے دور رہنے کی تاکید کی تھی۔ وہ کسی کے لیے مسائل کھڑے نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اسے اس لڑکی پہ بہت ترس آیا جو بے چاری اتنی اکیلی تھی کہ اسے بات کرنے کو بندہ میسر نہیں تھا، اسی لیے ایک بھالو سے باتیں کرکے اپنے اندر کا دکھ اس سے بانٹ رہی تھی۔ اپنی بے بسی پہ افسوس ہوا کہ کاش وہ اس کے لیے کچھ کرسکتا۔ گھر والوں کی بے حسی پہ غصہ آیا جو اسے انسان تک نہیں سمجھتے تھے اور جانوروں کی طرح نجانے کب سے ایک کمرے میں قید کررکھا تھا۔ نیلو باجی پہ خون کھولا جنہیں وہ کچھ اور ہی سمجھتا تھا اور اب وہ ایک نئے روپ میں سامنے آرہی تھیں۔

دل اتنا بوجھل ہورہا تھا کہ باہر جانے کا دل ہی نہیں کیا لیکن گھر رہ کر بھی کیا کرتا۔

وہ دبے قدموں باہر آیا تو تارہ جلدی سے سنبھل گئی۔ اپنا دوپٹا درست کیا جو پہلے بھی سر پہ ہی تھا اور مزید سمٹ گئی۔

"میں اردو بازار تک جارہا تھا۔ کوئی کتاب چاہیے آپ کو؟" اس نے سرنفی میں ہلایا پھر یکدم بولی۔ "کوئی موٹیویشن کے ٹاپک پہ کتاب ملے تو لے آئے گا۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔ اس میں قصے کہانیاں نہیں ہوں گی تو وہ پڑھنے سے شاید بھابھی منع نہ کریں۔" مرتضیٰ نے ایک نظر اس لڑکی کی جانب دیکھا اور جی اچھا کہتا وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

علی بھائی کے خاندان میں کوئی شادی تھی۔ دعوت نامے میں سب کا ہی نام تھا۔ آنٹی تو بستر پہ ہونے کی وجہ سے جا نہیں سکتی تھیں۔ تارہ کو ویسے ہی گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ دوسرا اگر وہ چلی جاتی تو آنٹی کا خیال کون رکھتا۔ اب نیلو باجی ساس کی خدمت کے لیے تو شادی چھوڑنے سے رہی تھیں۔ شادی قصور میں تھی۔ آنے جانے میں سارا دن لگ ہی جانا تھا۔ واپسی ان کی رات گئے تک ہی ہونا تھی اسی لیے نیلو باجی تارہ کو ساری ہدایات دے گئی تھیں کہ کب اسے کیا کیا کرنا ہے۔

اس دن اسے بھی آفس سے لوٹتے لوٹتے مغرب ہوگئی تھی۔ راستے میں رش ہی اتنا تھا اور اسے اپنا بائیک بھی مکینک کو دکھانا تھا جو ان دنوں مسئلہ کر رہا تھا۔ وہ آفس سے لوٹا تو دروازہ تارہ نے ہی کھولا تھا۔ دروازہ کھول کر اسے سلام کرتی وہ اندر چلی گئی تھی۔ وہ بائیک کھڑی کرکے اندر آیا تو اس نے خود مرتضیٰ کو مخاطب کیا۔

"آپ چینج کرآجائیں میں تازہ روٹی بنادیتی ہوں۔" وہ اتنا کہہ کر اندر کچن کی طرف چلی گئی۔

مرتضیٰ بھی اپنے کمرے میں چلا گیا اور فریش ہوکر جب باہر آیا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے اس نے وہ کتاب بھی اٹھالی جو وہ اس دن تارہ کے لیے لایا تھا لیکن دینے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ باہر ہال میں آیا تو سامنے دسترخوان لگا ہوا تھا۔ تازہ روٹی چنگیر میں رکھی تھی۔ سالن میں اروی شملہ تھی جو اس نے اس سے پہلے بھی نہیں کھائی تھی۔ اس نے پہلا نوالا چکھا تو اسے سالن بہت لذیذ لگا۔ پھر وہ کھاتا چلا گیا۔ عموماً وہ رات کو ایک روٹی سے زیادہ نہیں کھاتا تھا لیکن اس دن چنگیر میں دو روٹیاں پڑی تھیں اور وہ دو کی دو کھا گیا تھا۔ کھانا یقیناً تارہ نے بنایا تھا اور اسے ماننا پڑا کہ اس کے ہاتھ میں نیلو باجی سے بھی زیادہ ذائقہ ہے۔

کھانا کھانے کے بعد وہ برتن خود ہی سمیٹ کر کچن میں رکھ آیا۔ کچن خالی تھا اور صاف ستھرا۔ وہ کام کرکے کچن ساتھ ساتھ سمیٹ دیتی تھی تب ہی ہر چیز اپنی جگہ پہ تھی۔

وہ برتن سمیٹ کر یونہی جب نیلو باجی کی ساس کے کمرے کے باہر سے گزر رہا تھا تو اسے ان کی ساس کی سخت آواز سنائی دی۔

"مجھے کھانا نہیں کھانا کھانا۔ ایسے ہی رہنے دو مجھے۔" مرتضیٰ ٹھہر گیا۔ اس نے ادھ کھلے دروازے

سے اندر جھانکا تو تارہ ماں کو کھانا کھلانے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ غصے سے منہ پھیرے لیٹی تھیں۔

"امی جی! کھانا کھالیں تا کہ میں آپ کو دوائی دے سکوں۔ آپ کو پتا ہے نا وقت سے دوائی لینا آپ کے لیے کتنا ضروری ہے۔" اس کے لہجے میں منت تھی۔

"میں بھوکی ہی ٹھیک ہوں۔" ان کی آواز میں کرب تھا۔

"امی جی میں ہزار بار آپ کو بتا چکی ہوں کہ میں نے کچھ ایسا نہیں کیا تھا۔ لیکن پھر بھی جو کچھ ہوا اس کے لیے مجھے معاف کر دیں۔ میں نادان تھی، نہیں سمجھ سکی۔ لیکن بات وہ نہیں تھی جو آپ کو بتائی اور دکھائی دی تھی۔"

"کیا فائدہ ان باتوں کا اب۔" وہ جیسے کسی بات پہ پچھتا رہی تھیں۔

"امی جی! آپ تو میری ماں ہیں۔ آپ کیسے اتنی سخت دل ہو سکتی ہیں میرے ساتھ۔ دنیا نے میرا یقین نہیں کیا تو چلو نہ سہی لیکن آپ کو تو کرنا چاہیے تھا۔ بھابھی تو غیر تھیں، انہوں نے تو جو کیا وہ کیا، بھائی اپنے تھے لیکن انہوں نے بھی مجھے ہی سارا الزام دے ڈالا۔ اور ایک اس بات کی سزا میں انگنت سزائیں سنا ڈالیں۔"

وہ رو رہی تھی اور مرتضیٰ کا دل دکھ سے بھر رہا تھا۔ اس کے لہجے کا سوز بتاتا تھا کہ وہ سچی ہے۔ وہ انجان ہو کر بھی اس کے جملوں اور لہجے پہ تڑپ اٹھا تھا تو اس کے اپنے اس کے ساتھ یہ کیا سلوک کر رہے تھے۔

"جو کچھ دیکھا وہ کیا تھا؟"

"جو کچھ آپ نے دیکھا امی جی وہ آدھا سچ تھا۔ پورا سچ آپ نے سنا ہی کہاں تھا۔ آپ ماں بن کر ایک بار تو میری بات سن لیتیں۔"

اس کی بات پہ وہ خاموش ہو گئیں۔

تارہ نے پھر سے نوالا بنا کر ان کی طرف بڑھایا تو اس بار انہوں نے منہ کھول دیا۔ وہ اب اس کے ہاتھ سے کھانا کھانے لگ گئی تھیں۔

"مرتضیٰ کو کھانا دے دیا کہ بھوکا بیٹھا ہے؟"

"جی سب سے پہلے انہیں ہی دیا تھا۔ مہمانوں کی خدمت جیسے آپ نے سکھائی تھی، ہمیشہ یاد رہتی ہے۔"

"سکھایا تو بہت کچھ تھا لیکن۔۔" انہوں نے گہری سانس لی۔

تارہ تڑپ اٹھی لیکن کچھ کہا نہیں۔ وضاحتیں دینا شاید واقعی بے سود تھا۔

پھر دونوں خاموش ہو گئیں تو مرتضیٰ وہاں سے گزرتا ہال میں چلا آیا۔

کتنی دیر وہ ان ماں بیٹی کی گفتگو پہ غور کرتا رہا تب ہی کچھ دیر بعد تارہ ہال میں آئی تھی۔

"آپ کو کچھ اور چاہیے؟ کافی، چائے یا قہوہ؟" وہ کھانے کے بعد چائے یا قہوہ لیتا تھا۔ نیلو باجی یقیناً اسے بتا کر گئی ہوں گی تب ہی وہ پوچھنے آئی تھی۔

"ایک کپ چائے بنا دیں۔" اس نے سر ہلایا اور کچن میں چلی گئی۔ مرتضیٰ وہیں بیٹھا موبائل پہ کچھ اسکرولنگ کرتا رہا۔

"چائے۔" وہ چھوٹی میز پہ چائے رکھ رہی تھی تب ہی وہ چونکا۔ وہ پلٹنے لگی تو اس نے پوچھا۔

"آنٹی نے کھانا کھالیا؟"

"جی۔" وہ نظریں نہیں اٹھاتی تھی۔ نجانے یہ اس کا انداز تھا، اپنی شرمساری کو دور کرنے کا طریقہ یا خود کو بے قصور ظاہر کرنے کی کوشش۔

"دوائیاں بھی لے لیں؟" اس نے سر ہلایا۔

"اور آپ نے خود کھانا کھایا یا ابھی تک دوسروں کو کھلا رہی ہیں؟"

اس کی بات پہ وہ چونکی اور اس کی طرف دیکھا۔ برسوں بعد کوئی اس سے بھی یہ سوال کر سکتا تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"میں ابھی کھاؤں گی۔"

"ایک کمرے میں سارا دن رہ رہ کر تنگ

نہیں آتیں؟" اس کے سوال پہ وہ پھر سے چونکی تھی۔ وہ اس کی اتنی فکر کیوں کر رہا تھا جب اس کے بھائی اور ماں تک نے کبھی اس حوالے سے نہیں سوچا تھا۔

"تنگ آتی ہوں تب ہی صبح ہونے سے پہلے چھت پہ جاتی ہوں۔ وہ چند منٹ زندگی میں تازہ ہوا کا جھونکا ہیں۔" اس کا یہ راز بس وہی جانتا تھا اور اس راز کو راز رکھنے پہ وہ سامنے بیٹھے اس شخص کی مشکور تھی۔

"یہ آپ کی کتاب میں اس دن لے آیا تھا۔"

تارہ نے سامنے میز پہ پڑی کتاب اٹھائی اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ جانے لگی تو مرتضیٰ نے کہا۔

"اس دن آپ نے بتایا تھا کہ آپ کو کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ میرے کمرے میں کئی ناول پڑے ہوئے ہیں۔ وہ آپ پڑھنے کے لیے لے جا سکتی ہیں۔ میں اگلی بار گھر سے مزید ناولز لے آؤں گا۔" تارہ نے سر نفی میں ہلایا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا شوق الگ بات ہے لیکن میرے پڑھنے پہ پابندی ہے۔ بھابھی کو لگتا ہے کہ ایسی کتابوں نے ہی میرا دماغ خراب کیا ہے۔" اس کی بات سن کر مرتضیٰ کو بے حد حیرت ہوئی تھی۔ نیلو باجی اس سوچ کی مالک کیسے ہو سکتی تھیں جبکہ ان کے اپنے گھر میں چھوٹے تایا کو یہ شوق تھا اور انہی سے یہ شوق اسے بھی پڑا تھا۔

"یہ سب نیلو باجی نے کہا ہے۔" وہ بے یقینی سے پوچھ رہا تھا۔

تارہ خاموش رہی۔ وہ اس کی کزن تھیں، بھلا بہن کے بارے میں وہ ایسی ویسی کوئی بات کیوں سنتا۔

"کتابیں تو انسان کو سمجھ داری بناتی ہیں۔ قابل بناتی ہیں۔ کتابوں نے کب کسی کا دماغ خراب کیا ہے۔؟" وہ جیسے خود کلامی کے سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"جب انسان کی قسمت خراب ہو تو کتابیں دماغ ہی خراب کرتی ہیں۔" وہ پلٹ کر اندر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

مرتضیٰ سوچ میں غلطاں چائے کی چسکیاں بھرتا رہا۔ نیلو باجی کا ایک الگ ہی روپ یہاں آ کر دکھائی دے رہا تھا۔ لوگ ٹھیک کہتے ہیں کہ انسان مختلف انسانوں اور ماحول میں مختلف طرح سے پیش آتا ہے۔ نیلو باجی کے بھی شاید یہی معیار تھے جو اب تک اسے دکھائی نہیں دیے لیکن اب دکھائی دے رہے تھے۔

وہ چائے ختم کر کے کچن میں کپ رکھنے آیا تو وہ وہیں کچن میں پیڑھی پہ بیٹھی گود میں پلیٹ دھرے کھانا کھا رہی تھی۔ مرتضیٰ نے کپ سنک میں رکھا اور اس کی طرف دیکھا۔ تارہ کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ چھوٹا نوالا توڑ کر اچار کے ساتھ کھا رہی تھی۔

"ایک بات پوچھوں تو برا مت منایے گا......"

اس نے کچھ توقف کیا۔ تارہ اسی طرح منہ ہلاتی کھانا کھاتی رہی۔ "جو کچھ آپ کے ساتھ ہوا، کیا اس میں آپ کا قصور تھا یا یہ محض الزام ہے۔؟"

تارہ نے سر اٹھا کر دیکھا کہ کیا یہ سوال پوچھنے والا محض اس کی کہانی جاننے میں دلچسپی رکھتا ہے یا اس میں کوئی انسانیت کی رمق باقی ہے؟ کیا عوام الناس کی طرح اسے بھی کوئی چٹخارہ بھری، مرچ مسالے والی داستان سننا تھی یا وہ واقعی سچ کا طالب تھا۔ اور سامنے کھڑے اس شخص کے چہرے پہ تارہ کو بس ایک تاثر دکھائی دیا تھا۔ سچ کو جان لینے کا۔ اس نے گہری سانس لی۔

"کچھ قصور میرا تھا اور باقی بنا دیا گیا۔"

☆☆☆

تارہ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی وہ گھٹا گھٹا سا تھا۔ اسے ویسی کوئی بھی آزادی حاصل نہیں تھی جیسی وہ اپنی کلاس فیلوز کے پاس دیکھتی تھی اور یہ اس کے بچپن سے ہی تھا۔ ابو مزاج کے سخت تھے اسی لیے امی بالکل خاموش اور ڈری سہمی رہا کرتی تھیں۔ اس کے باوجود ابو کو کسی نا کسی بات پہ اعتراض ہی رہتا۔ اور وہ دکان سے واپس لوٹتے ہی

کسی بات کو پکڑ کر بولنا شروع کرتے تو اس کا دل کرتا کہ وہ ابو کے آگے ہاتھ جوڑے کہ اب بس بھی کر دیں۔ اسے امی پہ بھی رحم آتا اور کبھی غصہ کہ وہ کیسے سب خاموشی سے سنتی رہتی ہیں۔ ابو پہ تو اسے کبھی پیار نہیں آیا۔ انہوں نے کون سا اسے کبھی پیار کیا تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ ان کی اولاد ہے اور ایسا اس کے ساتھ نہیں علی بھائی کے ساتھ بھی تھا۔ ابو جانتے ہی نہیں تھے کہ اولاد سے محبت کیسے کی جاتی ہے۔ پیار محبت بھی کسی چڑیا کا نام ہے۔ ان کے نزدیک سب کو بس غصے اور رعب کی لاٹھی سے ہانکنا ہی سب کچھ تھا۔

علی بھائی اس سے عمر میں بارہ سال بڑے تھے اسی لیے ان دونوں کی آپس میں کوئی ایسی دوستی نہیں تھی۔ بس ایک احترام کا رشتہ تھا جو ہمیشہ سے قائم تھا۔ ستم یہ تھا کہ امی بھی اس کے ساتھ ویسی نہ تھیں جیسی مائیں ہوا کرتی ہیں۔ بچیوں کی ہمراز و ہمنوا۔ امی اور اس کے درمیان ایک فاصلہ اس نے ہمیشہ سے محسوس کیا تھا جسے وہ چاہ کر بھی کم نہیں کر سکی تھی۔ اس کا بہت دل کرتا کہ امی جی عام ماؤں جیسی دوست بن جائیں لیکن امی نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ وہ ان کے سامنے روتی یا دکھی ہوتی تو وہ کبھی پوچھنے کی زحمت بھی نہیں کرتیں کہ اسے کیا ہوا ہے۔ دیکھتیں اور گزر جاتیں۔

بچپن سے ہی وہ دوسرے بچوں کی طرح کھیل کود نہیں کر سکی۔ وجہ تو وہی تھی کہ ابو کے ڈر سے امی اسے گھر سے باہر جانے ہی کہاں دیتی تھیں کہ وہ سہیلیاں بناتی یا کسی کے ساتھ کھیلتی۔ نتیجتاً وہ گھر پہ اکیلے ہی اپنے کھلونوں سے کھیلتی رہتی۔ اسکول میں کرائی گئی ایکسر سائز اور جمناسٹک دہرانے لگتی۔ اکیلے کمرے میں یا صحن میں اس کی کتنی دیر پریکٹس کیا کرتی۔ کوئی پوچھتا تو کہہ دیتی کہ میں تو یوگا انسٹرکٹر بنوں گی حالانکہ امی سے اسے ٹھیک ٹھاک ڈانٹ پڑ جاتی کہ لڑکیاں ایسے شعبوں میں نہیں جایا کرتیں۔ مگر اس کا ذہن اس سے آگے سوچتا ہی نہیں تھا۔ اسے یہی مشغلہ پسند تھا۔

اس نے جب بھی کھیلا اکیلے ہی کھیلا۔ کوئی دکھ سکھ ملا تو اس کے بستر کا تکیہ اس کا ہمنوا ہوتا یا ایک بھورے رنگ کا ٹیڈی بیئر جس کا نام اکو تھا۔ اسے اکو سے اکیلے میں باتیں کرنے کی عادت ہوگئی تھی۔ وہ کسی کونے کھدرے میں چھپ جاتی اور اکو کو مخاطب کر کے ہلکی آواز میں باتیں کرتی رہتی۔ امی اسے ایسا کرتے کتنی بار دیکھ چکی تھیں لیکن انہوں نے کبھی اس بات کو بھی اہمیت نہیں دی کہ وہ کھلونوں سے باتیں کرنے کی عادی ہے۔

شاید بچپن میں امی نے اس بات کا اتنا نوٹس اس لیے نہیں لیا کہ بچے کھلونوں کے ساتھ باتیں کرنے کے عادی ہوتے ہی ہیں خاص طور پہ وہ بچے جن کے ساتھ کھیلنے کے لیے کوئی بہن بھائی یا دوست نہیں ہوتا لیکن جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی اس کی یہ عادت امی کو پریشان کرنے لگی۔ وہ اسے ڈپٹ دیا کرتیں کہ وہ کیا بچوں کی طرح ایک بھالو سے باتیں لگی رہتی ہے لیکن جن بچوں کے پاس باتیں کرنے کے لیے کوئی نہ ہو وہ پھر ایسے دوست ہی تو بناتے ہیں۔ بہن تھی نہیں، بھائی خاموش رہتا تھا، باپ غصہ کرتا تھا اور امی نظر انداز۔ تو وہ پھر کیا کرتی۔ اس نے یہی سیکھ لیا۔

تارہ کی دیگر عادات ہمیشہ سے ایسی تھیں جو خاندان بھر میں سب کو پسند تھیں۔ خاندان کی فرماں بردار بیٹی جو ماؤں کا مان ہوتی ہیں۔ تارہ بھی اپنی ماں کا ایسا ہی مان تھی۔ علی بھائی کی شادی سے پہلے وہ گھر کے اہم امور میں امی جی کا پورا ساتھ دیا کرتی بلکہ وہ تو اتنی ذمہ دار تھی کہ امی جی اکثر معاملات مکمل طور سے اس کے سپرد کر کے مطمئن ہو جایا کرتی تھیں۔ وہ چھوٹی عمر سے ہی گھر کے کام کاج میں ماہر ہوگئی تھی جو کہ بڑی بات تھی۔ سب اپنی بچیوں کو تارہ کی مثال دیا کرتے تھے کہ جس نے چھوٹی سی عمر میں گھر سنبھالنا سیکھ لیا تھا لیکن کوئی اس سے پوچھتا تو وہ کہتی کہ

”چھوٹی عمر میں کھیل کود ہی کرنے دیا جائے، گھر سنبھالنے کو تو ایک عمر پڑی ہوتی ہے۔“

اسکول سے گھر آ کر ہوم ورک کرنے کے بعد اس کے پاس کرنے کو کچھ ہوتا تو تھا نہیں تو پھر وہ بھی کوئی سا کام کر رہی ہوتی اور بھی کوئی سا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں پھوپھو رہنے آتیں تو وہ ان سے کڑھائی کے مختلف ٹانکے سیکھ لیتی اور اپنی گڑیا کے کپڑوں پہ کڑھائی کرتی۔ پھر پھوپھو سے ہی اس نے سلائی بھی سیکھ لی اور گڑیا کے کپڑے سیتے سیتے وہ اپنے کپڑے بھی سینے لگ گئی۔ ایک لحاظ سے امی مطمئن تھیں کہ وہ کسی ایسی سرگرمی میں ملوث نہیں ہے جس پہ اس کا باپ غصہ کرے گا۔ جو بھی کرتی تھی نفع مند ہی تھا۔ پھوپھو بھی اسے پیار سے گلے لگا کر امی سے کہتیں کہ یہ تو میری بیٹی ہے۔ امی اس بات پہ مطمئن ہو جاتیں اور تارہ کچھ کچھ کر شرما جاتی۔

علی بھائی کی شادی اس کے میٹرک کے دوران ہی ہوئی تھی اور ان کی شادی سے دو سال پہلے ابو کی وفات ہوئی تھی۔ ابو کی وفات سے کوئی خاطر خواہ تبدیلی تو آ نہیں سکی کہ علی بھائی بچپن سے ابو کے خوف کی وجہ سے ایک خول میں بند ہو کر رہ گئے تھے جو پھر کبھی نہیں ٹوٹ سکا۔ امی کے اندر کی خود اعتمادی فوت ہو چکی تھی اور وہ ہر وقت بوکھلائی بوکھلائی سی رہا کرتی تھیں۔ اس کا سارا بچپن گھٹ گھٹ کر، ڈر ڈر کر، خود سے باتیں کرتے کرتے گزر گیا تھا۔ یوں اس گھر میں تین فرد رہ گئے لیکن تینوں اپنے گرد کھڑی سالوں کی اونچی دیواریں نہیں گرا سکے۔

نیلو بھابھی خاندان کے باہر سے تھیں۔ اپنے گھر میں وہ سب سے بڑی تھیں اور ان کا ہی حکم چلتا تھا۔ یہاں بھی انہوں نے آتے ہی سب کچھ اپنے ہاتھ میں کرنے کی کوشش ہی کی جو کہ کچھ ایسا مشکل ثابت نہ ہوا تھا۔ ساس اور نند دونوں دبی ہوئی شخصیت کی مالک تھیں۔ ان کو اپنے ماتحت کرنا کیا مشکل تھا سو سارا انتظام انہوں نے بہت آسانی سے سنبھال لیا۔ وہ گھر کی بہو تھیں اور گھر ان کے شوہر کی کمائی سے چلتا تھا تو حکم بھی تو ان کا چلنا چاہیے تھا۔ امی کی جان کو ابو کے احکامات سے چھٹکارا ملا تو نیلو بھابھی کے ماتحت آ گئیں۔ تارہ نے جو ابو کی وفات کے بعد دو سال کچھ تھوڑا بہت کھل کر سانس لینا سیکھا تھا تو وہ سانس پھر سے نیلو بھابھی کی وجہ سے گھٹن کا شکار ہو چلا تھا۔ یوں بھی اب وہ میٹرک پاس کرنے والی تھی، خود کو بڑا بڑا محسوس کرنے لگی تھی۔ ایسے میں نیلو بھابھی کا اس پہ بے جا حکم چلانا اسے بہت برا لگتا تھا۔

گھر میں کچھ نا کچھ کشیدہ حالات چلتے ہی رہتے تھے لیکن امی جی تارہ کو سمجھا بجھا کر خاموش کروا دیتیں کہ وہ خاموش رہے تا کہ معاملہ زیادہ خراب نہ ہو۔ حالانکہ تارہ پہلے بھی کہاں اتنا بولتی تھی۔ یہ تو کبھی کبھار بھابھی کچھ زیادہ ہی ناانصافی کر دیتیں تو وہ زبان ہلا لیتی تھی۔

"تمہیں کس نے کہا کہ تم بڑوں کے سامنے بولو۔ جیسے باپ کی زندگی میں رہا کرتی تھیں ویسے ہی رہو۔ خاموش ہو کر۔ سمجھیں۔" امی کمرے میں لے جا کر اس کی کھنچائی کرتیں۔

"پہلے ابو اپنی مرضی ہم پہ مسلط کرتے تھے، اب بھابھی کو آپ یہی سب کرنے کی اجازت دے رہی ہیں۔"

اسے یوں ڈر ڈر کر جینا تنگ کرتا تھا۔ وہ اپنی دیواریں گرا کر آزادی چاہتی تھی۔ اسے اس گھٹن سے کوفت ہوتی تھی۔ وہ کچھ کام اپنے مرضی کے بھی کرنا چاہتی تھی جیسے اس کی باقی کلاس فیلوز کرتی تھیں۔ اپنی مرضی کے کپڑے پہننا، فیشن کرنا، میک اپ کرنا، گانے سننا، ڈرامے دیکھنا۔ لیکن بھابھی اس کی ہر بات پہ تنقید ہی کرتی تھیں۔

"بچیوں کو کیا ایسے کام زیب دیتے ہیں جو یہ کرتی پھرتی ہے۔ ابھی سے ان باتوں پہ دھیان ہے کہ کیا کیسے کب پہننا اوڑھنا ہے، تیار ہونا ہے، اچھے لگنا ہے تو کل کو تو یہ بالکل ہاتھ سے نکل جائے گی۔ گانے سننا، ڈرامے دیکھنا اچھی خاصی لڑکیوں کو بگاڑ دیتا ہے۔ اس کو ذرا سنبھال کر رکھیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس کے ایسے بچپن کی وجہ سے آپ کو لینے کے دینے پڑ

جائیں۔" وہ امی کے آگے خوب بولتیں کہ امی کو احساس ہو کہ وہ بیٹی کی تربیت ٹھیک سے نہیں کر رہیں۔

امی اپنے طور پہ تارہ کو سمجھاتیں کہ اس عمر میں فیشن کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جب اس کی عمر ہوگی تو جتنا چاہے، جیسے چاہے فیشن کرلے۔ جہاں تک بات ہے ڈراموں گانوں کی تو بھابی ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ یہ شیطانی کام ہیں سوان سے دور رہا جائے۔ تارہ پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا اس کی عمر میں انہوں نے یا بھابی نے ایسا کوئی شوق نہیں پالا تھا؟ اس کی عمر میں تو عموماً لڑکیوں کو ایسے شوق ہوا ہی کرتے ہیں لیکن وہ نہ پوچھ سکی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی امی کی باتیں اسے ماننا پڑیں۔ امی نیلو بھابی کی باتوں سے بچنے کے لیے ہر وقت تارہ کو روکنے ٹوکنے لگ گئیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ حالات اس نہج پہ جا پہنچیں کہ علی کا گھر خراب ہو یا وہ بیوی کو لے کر الگ ہو جائے۔ اسی لیے تارہ کو ہی بہت سے معاملات میں جھکنا پڑتا۔ بہت سے معاملات میں خاموش ہونا پڑتا۔ بہت سی باتوں پہ بھابی کی ماننی پڑتی۔ کبھی وہ ماننے سے انکار بھی کر دیتی تو پھر گھر میں ایک جنگ کا سماں ہوتا۔ ایسے میں امی جی تارہ کو ہی ایک تھپڑ جڑ دیتیں یا کھینچتے کھانچتے اندر کمرے میں لے جاتیں۔ جس کے نتیجے میں وہ اندر ہی اندر گھر اور مکینوں سے مزید متنفر ہوتی چلی گئی۔

دو سال قبل جب وہ ایف اے میں داخل ہوئی تھی انہی دنوں اس کے کالج میں ایک نئی انسٹرکٹر آئی تھیں جو انہیں یوگا سکھاتی تھیں۔ تارہ کو ہمیشہ سے مثبت قسم کی سرگرمیوں میں دلچسپی رہی تھی۔ کتابیں پڑھنا، نت نئے پکوان بنانا، کڑھائیاں سلائیاں کرنا اور روزانہ ایکسرسائز کرنا۔ اسی لیے وہ خوشی خوشی یوگا کلاس اٹینڈ کرنے گئی تھی جو کہ صبح اسمبلی سے پہلے ہوا کرتی تھی۔ اس کے لیے اسے صبح ذرا جلدی کالج جانا ہوتا تھا لیکن خیر تھی وہ تو یوں بھی فجر کی نماز کے بعد سونے کی عادی نہیں تھی۔ مس رشتی انہیں یوگا سکھاتیں اور اس کے کئی فوائد بھی بتاتیں۔

"ہمیشہ گہرے سانس لینے سے انسان کھل کے آکسیجن اندر اتارتا ہے اور جس کے جسم میں آکسیجن ٹھیک سے پہنچتا ہے اس کے کئی سو مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ سو صبح کی ٹھنڈی تازہ ہوا میں سانس لیا کریں۔ یوں بھی صبح خیزی اچھی عادت ہے۔"

جس دن کالج سے چھٹی ہوتی اس دن وہی یوگا وہ فجر کے بعد چھت پہ جا کر کیا کرتی تھی۔ ایسے وقت میں پرندوں کی میٹھی سروں میں آوازیں، پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو، صبح کی صاف ہوا، ہوا میں مدھم سی خنکی، ہر سو چھائی خاموشی اسے کس قدر مسحور کرتی تھی یہ ناقابل بیان تھا۔

وہ چھت پہ یوگا کرتے ہوئے اپنا ارتکاز بنائے رکھتی اور اتنی محو ہو جاتی کہ اسے یاد تک نہ رہتا کہ وہ کہاں ہے اور اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ برابر والے چھت سے دو آنکھیں کبھی کبھار اسے جھانکا کرتی تھیں جن سے وہ لاعلم تھی۔

پھر ایک دن یوگا کرنے کے دوران ہی اسے لگا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ عورت کے اندر کا وہ الارم جو کسی بھی مرد کی نظروں کی حدت سے بجنے لگتا ہے، تارہ کا بھی بج اٹھا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا تو برابر والی چھت پہ ایک نوعمر لڑکا ٹہل رہا تھا۔ لڑکا خوش شکل تھا اور اس کے متوجہ ہونے پہ ذرا سا مسکرا دیا لیکن اس کے علاوہ اس نے کوئی چھچھوری حرکت نہیں کی پھر بھی تارہ خاموشی سے نیچے چلی آئی۔

کچھ ویک اینڈز پہ یہی سب ہوتا رہا پھر اس نے لڑکے کی پروا چھوڑ کر اپنی یوگا پریکٹس جاری رکھی۔ فرق یہ پڑا کہ اس نے اپنی ایکسرسائز کے لیے جو جگہ مخصوص کر لی تھی وہ برابر والوں کی چھت سے پوشیدہ تھی۔

یوگا پریکٹس کے بعد وہ یونہی کچھ دیر چھت پہ ٹہلا کرتی تو وہ لڑکا بھی ٹہلتا دکھائی دے جاتا۔

اس دن وہ چھت پہ واک کرتے ہوئے ٹھوکر کھا کر گرنے لگی تو بے اختیار اس لڑکے کے منہ سے

نکلا "سنبھل کر پلیز۔"

تارہ نے خود کو گرنے سے تو بچا لیا لیکن اس کے سحر میں گرفتار ہونے سے نہیں بچا سکی۔ کم عمری کی یہ سوچ کہ کوئی آپ کو نوٹس کرتا ہے، آپ کے لیے روزانہ چھت پہ آتا ہے، آپ کی ذات میں دلچسپی لے رہا ہے، آپ کی پروا کر رہا ہے، اندر اتنی کھد بد مچاتی ہے کہ ذہن خود بخود اسی بارے میں سوچتا چلا جاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ تارہ کے ساتھ بھی ہونے لگا تھا۔ پہلے جسے وہ نظر انداز کرتی تھی اب اس کی موجودگی اسے اچھی لگنے لگی تھی۔ وہ جب اپنی کلاس کی کسی لڑکی کی ایسی کہانی سنتی جس میں اس کا کوئی کزن یا دوست اس کی پروا کرتا یا ڈائجسٹ میں پڑھا کرتی تو اسے یہ سب اچھا لگتا کہ ایسا رشتہ کتنا حسین ہوتا ہے جس میں کوئی انسان آپ کی اس قدر پروا کرتا ہے اور اب ایک نامحسوس سی پروا اسے اس برابر والے لڑکے سے محسوس ہوتی تھی۔ وہ بھی اسے دیکھ کر مسکرا دیتا تو وہ بھی جھینپ جاتی۔ پہلے وہ کچھ دیر کے لیے چھت پہ جاتی تھی، پھر وہی دورانیہ بڑھنے لگا حتیٰ کہ وہ روزانہ فجر کی نماز کے بعد کالج جانے سے پہلے گھنٹہ چھت پہ گزارا کرتی تھی۔ پورا دن بھی ایک عجیب بے چینی سے گزر جایا کرتا اور اس کا اس لڑکے کو دیکھنے کا دل کرتا جس کا وہ نام تک نہیں جانتی تھی۔ اس نے خود ہی اس کا نام اکو رکھ لیا بلکہ وہ اکو کو ہی وہ لڑکا سمجھ کر اس سے ڈھیروں باتیں کرنے لگی۔

وہ کہتے ہیں نا کہ جن بچوں کو توجہ اور محبت گھر سے نہیں ملتی وہ اس کی تلاش میں باہر ضرور جاتے ہیں تو ایسا ہی کچھ اس کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔

اس دن جب وہ صبح اوپر آئی تو لڑکا پہلے سے موجود تھا۔ اس نے تارہ کو دیکھتے ہی ایک بڑا سا چارٹ پیپر ہوا میں لہرایا جس پہ بڑا بڑا لکھا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

تارہ کے پاس جواب کے لیے کچھ ایسا نہ تھا جس پہ وہ لکھ کر نام بتاتی۔ اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا جہاں چند ایک تارے جھلملا رہے تھے۔ لڑکے نے آسمان کو دیکھا۔ "چاند۔؟" اس نے چاند کی ہلکی سی بدلی کی جانب اشارہ کیا تو تارہ نے سر نفی میں ہلایا۔

وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر چارٹ پیپر پہ کچھ لکھنے لگا۔ تارہ اس کے لکھنے کی منتظر تھی۔

"فلک؟" چارٹ پیپر لہرایا۔

تارہ نے سر نفی میں ہلایا۔

لڑکے نے کچھ سوچ کر پھر سے چارٹ پیپر پہ کچھ لکھا۔ "ہوا۔" تو تارہ کی بے ساختہ ہنسی چھوٹ گئی۔ بھلا کسی کا نام ہوا بھی ہو سکتا تھا کیا۔ اس کے ہنسنے کو وہ کتنی دیر دیکھنے کے بعد اگلی بار چارٹ پیپر پہ اس کا درست نام لکھ پایا تھا۔ "ستارہ۔؟"

تارہ نے جھٹ سے سر ہاں میں ہلایا اور کھلکھلا کر ہنس دی۔ لڑکا بھی ہنس دیا۔ کافی دیر تک چارٹ پیپر پہ کچھ لکھتا رہا۔ تارہ اپنی واک کرتی رہی

"پیارے نام والی پیاری لڑکی۔ تمہارا یہی نام ہونا چاہیے تھا۔" تارہ اس کی بات پہ گلال ہو گئی۔

یہ پہلی بار تھا کہ کسی لڑکے نے اس کی تعریف کی تھی۔ وہ جلدی سے مارے شرم کے نیچے بھاگ گئی۔ وہ پورا دن اس سے کمرے سے بھی نہیں نکلا گیا۔ اسے لگ رہا تھا ہر طرف وہی جملہ ناچ رہا ہے۔ اسے آنکھیں مار رہا ہے کہ پیارے نام والی پیاری لڑکی جا رہی ہے۔ ہر چیز اس پہ مسکرا رہی ہے کہ کسی کے لیے وہ پیارے نام والی پیاری لڑکی ہے۔ اس دن اس نے کالج سے بھی چھٹی کی۔ سارا دن وہ اسی جملے کو سوچ سوچ کر مسکراتی اور شرماتی رہی۔ لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ کائیاں فطرت والی بھابھی اس کی معصوم اور سادہ سی مسکراہٹ کو بھانپ چکی ہیں اور وہ اندر ہی اندر جاننا چاہتی ہیں کہ ان کی اکلوتی نند آخر کس بات پہ سارا دن یوں خوشی سے مسکرا رہی ہے۔ تارہ بھی اب چھت پہ جاتے ہوئے ہاتھ میں ایک چارٹ پیپر اور پنسل لے کر جاتی تا کہ پوچھے گئے سوالوں کے جواب دے سکے۔ یوں دونوں میں رابطے کا ذریعہ دور سے لہرائے جانے والا ایک

چارٹ پیپر بن گیا۔

اگلے کئی دن نیلو بھابھی تارہ پہ نظر رکھے ہوئے تھیں لیکن چونکہ وہ صبح دیر تک بستر پہ پڑے رہنے کی عادی تھیں اسی لیے وہ اصل بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکیں۔ بس اتنا شک تھا کہ تارہ کا کہیں چکر چل رہا ہے کہ ایسی مسکراہٹیں یوں ہی نہیں چہرے پہ اتر آیا کرتیں۔ وہ کون ہے، کہاں ہے ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ بالآخر انہیں یہی شک گزرا کہ ہو نا ہو کالج کے باہر کوئی لڑکا ہے۔ جس سے اس کی دوستی ہو گئی ہے یا کسی سہیلی کا بھائی ہوگا۔

اسی سوچ کی وجہ سے انہوں نے علی بھائی کو قائل کیا کہ تارہ کو کالج سے خود لینے چھوڑنے کی ذمہ داری انہیں خود اٹھانی چاہیے۔ حالات اتنے اچھے نہیں ہیں کہ جوان لڑکی کو وہ وین پہ بھیج رہے ہیں۔ وین والے کا کیا ہے۔ روز کوئی نہ کوئی الٹی سیدھی خبر سننے کو ملتی رہتی ہے۔ کبھی کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو کون ذمہ دار ہوگا۔ علی بھائی کو اپنی سمجھدار بیوی کی بات سولہ آنے درست لگی تو انہوں نے یہ ذمہ داری خود اٹھالی۔ لیکن بھابھی کو جب ایک طویل عرصے تک علی کی طرف سے کوئی ایسی بات سننے کو نہ ملی جو تارہ سے متعلق ہو تو ان کے اندر مزید بے چینی بڑھ گئی کہ آخر وہ لڑکا ہے کون جس کی وجہ سے تارہ خوش خوش رہتی ہے، مسکراتی رہتی ہے۔ اگر اس کا سرا کالج سے جڑا ہوتا تو اب تک تو تارہ پکڑی جا چکی ہوتی بھائی کے ہاتھوں لیکن ایسی تو کوئی بات سننے میں نہیں آئی تھی۔ محلے میں وہ کہیں آتی جاتی تھی نہیں کہ وہ اس طرف دھیان دیتیں۔

لڑکے کا نام آصف تھا اور وہ لوگ حال ہی میں یہاں اوپر کے پورشن میں کرائے پہ آئے تھے۔ تارہ کو کبھی نہیں پتا چل سکا کہ اس کے ہمسائے کون ہیں۔ امی نے کبھی گھر سے نکلنے ہی کہاں دیا۔ وہ بس کالج سے گھر اور گھر سے کالج آتی جاتی تھی۔ خاندان میں بھی کبھی امی نے اسے اکیلے نہیں بھیجا۔ اپنے ہمراہ لے کر جاتیں اور واپس لاتیں۔ وہ تو کبھی اپنے ننھیال تک میں اکیلے نہیں ٹھہری تھی کہ ابو کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ بچیاں رات گھر سے باہر گزاریں۔ بس محلے کی دو تین خواتین تھیں جن سے امی جی کی سلام دعا اور آنا جانا تھا لیکن تارہ کا تو وہ بھی نہیں تھا۔

آصف پنجاب یونیورسٹی سے بی ایس سی کر رہا تھا۔ اس کی کوئی بہن نہیں تھی اور بس دو ہی بھائی تھے۔ وہ اکثر تارہ کو بتاتا کہ وہ بہت معصوم اور سادہ سی لڑکی ہے ورنہ آج کل کی لڑکیاں بہت تیز ہیں۔ اسے حیرت ہوتی کہ تارہ کے گھر انٹرنیٹ نہیں لگا تھا نہ ہی اس کے پاس موبائل تھا۔ بھلا اس دور میں کون ایسا تھا جو ان سہولیات کے بغیر زندگی گزار رہا ہو۔ کام والیوں تک کے پاس موبائل فون ہوتے ہیں۔ لیکن تارہ کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے کبھی ابو، امی اور بھائی کی طرف سے کی گئی سختی کے بارے میں اس سے بات نہیں کی تھی لیکن وہ اس کی کچھ باتوں سے خود ہی سمجھ گیا تھا کہ ان کے گھر کا ماحول قدرے سخت ہے۔

”تم اچھی لڑکی ہو جو بڑوں کی بات مان لیتی ہو۔ ان کے کہنے کے مطابق رہتی ہو ورنہ آج کل کے دور میں تو چھوٹے چھوٹے بچے بھی بات نہیں سنتے۔“

تارہ اس کی تعریف پہ ہمیشہ خوش ہوتی۔ وہ اس کی عادات کی، اس کی سادگی کی ہمیشہ تعریف کرتا رہتا اور یہ تعریف سننا تارہ کو اچھا لگتا تھا۔

یہ تجربہ نیا تھا اور تارہ کے لیے خوب صورت بھی کہ کوئی تو ہے جو اس کی کسی خوبی پہ دل کھول کر اسے سراہتا ہے۔ اس کی باتیں سنتا ہے۔ اس کی کیفیات اور جذبات کو سمجھتا ہے۔ اسے وقت دیتا ہے۔ اہمیت دیتا ہے۔

”میں تمہیں ایک سادہ سا موبائل گفٹ کرنا چاہتا ہوں جس پہ ہم بات کر سکیں۔“ تارہ کو اس کی بات درست نہیں لگی تھی۔ اس نے منع کر دیا۔

”اس طرح پیپر پہ لکھ لکھ کر کب تک ہم باتیں کریں گے۔ میں پورا دن تم سے رابطے میں رہنا

چاہتا ہوں۔"

تارہ نے کچھ سوچ کر اسے او کے کر دیا تھا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ سارا دن وہ اسے یاد کرتی تھی لیکن بات نہیں کر پاتی تھی۔ موبائل ہوتا تو وہ کسی بھی وقت اس سے بات کر سکتی تھی۔

آصف نے اسے سادہ بٹنوں والا موبائل لے دیا جو اس نے کالج لے جا کر ایک لڑکی سے استعمال کرنا سیکھ لیا تھا۔ یوں اس کا آصف سے ہمہ وقت رابطہ رہنے لگا اور یہیں سے اس کی تختی شروع ہوئی تھی۔

تارہ نے ہمیشہ موبائل بہت چھپا کر رکھا تھا اور زیادہ تر کالج میں یا رات کے وقت آصف سے بات کرتی تھی۔ دوپہر کو جب امی جی اور بھابھی سو جاتیں تو بات کرتی۔ دونوں کے مابین میسجز کا تبادلہ زیادہ رہتا اور کال پہ کم ہی بات ہوتی لیکن جتنی بھی بات ہوتی تارہ نے ہمیشہ کوئی ایسی بات ہونے نہیں دی جسے کر کے وہ بعد میں شرمندہ ہوتی۔ بے شک یہ رشتہ دوستی اور محبت کا تھا لیکن اس نے کبھی بھی آصف سے محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ نہ ہی ایک دو بار کے بعد اسے کرنے دیا۔ وہ یہ ضرور کہتی تھی کہ وہ اس کے لیے اہم ہے، اس کا بہترین دوست ہے جو اس کی سنتا ہے لیکن اس سے زیادہ نہ وہ حد کراس کرتی نہ اسے کرنے دیتی۔

آصف کا تارہ کو سننا، اسے تسلیاں دینا، مشورے دینا ہی تارہ کو اصل میں پسند تھا جو کوئی دوسرا اس کے لیے کبھی نہیں کر سکا تھا۔ یہی سب سننے کے لیے وہ اسے میسجز کیا کرتی۔ آصف کا تسلی دینا انداز ہی تو اس کی زندگی بن گیا تھا۔ کتنا سکون ملتا تھا اسے جب آصف اس کی ہمت بندھاتا تھا، اس کا ساتھ دیتا تھا۔ اس کا ایک ڈھارس بھرا جملہ اس میں نئی طاقت بھر دیتا۔ ایسا ساتھ جو اس کے ابو، بھائی کو دینا چاہیے تھا، ایسا دوست جو اس کی امی کو بننا چاہیے تھا، ایسا ہر رشتہ اس کے لیے آصف بنا تھا تو وہ کیوں اس کے لیے اہم نہ ہوتا۔ آصف بھی سمجھ گیا تھا کہ وہ ایک محبت کو، توجہ کو ترسی ہوئی لڑکی ہے جسے اس سے توجہ اور ہمدردی درکار ہے اسی لیے اس نے خود کو اسی پہ روک کر رکھا تھا۔ محبت کی پینگیں وہ اسے مکمل اعتماد میں لے کر ہی بڑھا سکتا تھا۔ ابھی تو وہ اس کا محض ایک دوست ہی بنا ہوا تھا۔

انہی دنوں رات کے کسی پہر جب تارہ بستر میں دبکی آصف سے بات کر رہی تھی تو کچن میں جاتی ہوئی نیلو بھابھی نے اس کے کمرے کے دروازے سے کان لگائے تو انہیں شبہ ہوا کہ وہ کسی سے بات کر رہی ہے لیکن وہ شبہ کی بنیاد پہ تو اسے نہیں پکڑوا سکتی تھیں۔ انہیں ٹھوس ثبوت چاہیے تھا تاکہ ان کی سبکی نہ ہو جائے۔ موبائل تارہ کو گھر سے نہیں لے کر دیا گیا تھا تو اگر وہ کسی سے بات کر رہی تھی تو اس کا صاف مطلب تھا کہ اس کے پاس موبائل تھا جو اسی لڑکے نے لے کر دیا تھا۔

اگلی صبح ہی بھابھی نے گھر کی تفصیلی صفائی کا بہانہ بنا کر تارہ کے کمرے کی اچھی طرح سے صفائی کی جس کا مطلب ہر کونے کھدرے سے موبائل ڈھونڈنا تھا۔ سارا کمرا ٹھونک بجا کر دیکھ لیا گیا لیکن موبائل کو نہ ملنا تھا نہ ملا کیونکہ تارہ موبائل کالج ساتھ لے کر جاتی تھی۔ اپنے کسی فری پیریڈ میں وہ آصف سے بات کر لیا کرتی اگر وہ فری ہوتا۔ تب ہی بھابھی اس دن تارہ کی واپسی کے وقت میں باہر صحن میں جا کر بیٹھ گئیں تاکہ اسے موبائل کو ادھر ادھر کرنے کا وقت ہی نہ ملے۔ جیسے ہی وہ گھر سے اندر داخل ہوئی بھابھی فوراً جرح کے لیے کھڑی ہو گئیں۔

"اپنا موبائل مجھے دو۔" تارہ یکدم گھبرا گئی۔ اس نے تو فرشتوں کو بھی خبر نہ ہونے دی کہ اس کے پاس موبائل تھا تو بھابھی کو کیسے خبر ہو گئی۔

"موبائل۔ کون سا موبائل۔ میرے پاس کوئی موبائل نہیں ہے۔" اس کا گھبرایا ہوا لہجہ چغلی کھا رہا تھا۔

"میں بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں تارہ کہ تمہارے پاس موبائل ہے۔ شرافت سے میرے

حوالے کر دو۔" بھابھی کسی پولیس والے کی طرح سختی سے جمی کھڑی تھیں۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں بھابھی۔ میرے پاس کوئی موبائل نہیں ہے۔"

"بیگ چیک کرواؤ اپنا۔" بھابھی کے ان الفاظ کے ساتھ تارہ نے جلدی سے بیگ پیچھے کیا تو بھابھی مسکرائیں۔ ان کا شک ٹھیک تھا۔ بیگ میں ہی موبائل تھا تب ہی تو تارہ کی ہوائیاں اڑی تھیں۔

"بیگ دو اپنا مجھے۔" تارہ نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ بری پھنسی تھی اور پکڑائے جانے کی صورت میں جانتی تھی کہ اس کا کیا حشر ہونے والا ہے۔

بھابھی نے آگے بڑھ کر اس کا بیگ کھینچنا چاہا۔

"چھوڑیں میرا بیگ۔ میں نے کہا نا میرے پاس کوئی موبائل نہیں ہے۔" شور کی آواز پہ امی جی بھی باہر صحن میں آ گئیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے تم دونوں کس بات پہ جھگڑ رہی ہو۔؟" وہ ہکا بکا رہ گئیں۔ اس سے پہلے بھی ایسی صورتحال تو نہ آئی تھی کہ دونوں یوں آمنے سامنے ہوتیں۔ "امی جی بھابھی میرا بیگ چھین رہی ہیں۔" وہ سخت روہانسی لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"اس کے پاس موبائل ہے۔" امی دونوں کی حیرت سے شکلیں دیکھنے لگیں۔ یہ کیا نئی کہانی سامنے رہی تھی۔

"بھابھی! میرا بیگ چھوڑیں پلیز۔" دونوں بیگ کو چھین رہی تھیں۔

"موبائل تو میں برآمد کر کے ہی دم لوں گی۔"

نیلو نے یکدم تارہ کو دھکا دیا تو وہ دور جا گری اور بیگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ نیلو نے بیگ جھپٹ لیا۔

"بھابھی میرا بیگ۔" تارہ جلدی سے اٹھی اور بھابھی کی طرف لپکی۔ تب تک نیلو چارپائی پہ اس کا بیگ الٹ چکی تھی۔ کتابیں، اسٹیشنری چارپائی پہ پھیل گئیں۔ نیلو نے جلدی جلدی سب ادھر ادھر کیا تو ایک کتاب سے موبائل باہر چارپائی پہ گرا۔ امی جی ہکا بکا رہ گئیں۔ نیلو بھابھی اپنی فتح پہ مسکرائیں۔ تارہ کھڑی رونے لگی۔

"یہ دیکھیں۔ یہ ہیں آپ کی بیٹی کے کرتوت۔ اس ڈبے سے وہ راتوں کو کسی لڑکے سے بات کرتی ہے جو میں نے اپنی کانوں سے سنی ہیں۔ آپ کی عزت کا جنازہ نکال رہی ہے اور بھی نجانے کیا کیا کرتی رہی ہو گی۔"

امی جی کی حالت تو بت جیسی تھی۔ انہیں یقین نہیں آیا کہ ان کی اتنی اچھی بیٹی یہ سب کر رہی تھی اور انہیں بھی اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔

"مجھے تو کافی دنوں کا شک تھا لیکن سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ آخر اس سے رابطے میں کیسے ہے۔ پھر سب سمجھ میں آ گیا۔ ابھی علی کو بتاتی ہوں۔" بھابھی آگے بڑھیں تو تارہ ان کے قدموں میں گر گئی۔

"پلیز بھابھی! علی بھائی کو کچھ مت بتانا۔ پلیز میں ہاتھ جوڑتی ہوں آپ کے آگے۔ میں آئندہ ایسا کچھ نہیں کروں گی۔ کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گی آپ لوگوں کو۔ پلیز بھائی کو مت بتائیں کچھ بھی۔ دوبارہ مجھ سے ایسی کوئی غلطی ہوئی تو میری کھال ادھیڑ دینا لیکن مجھے ایک موقع دے دیں۔ علی بھائی کو مت بتائیں۔" وہ اس کے پیروں سے لپٹ گئی۔

"کیوں نا بتاؤں۔ وہ بھائی ہے بڑا۔ سربراہ ہے اس گھر کا۔ اسے سب پتا ہونا چاہیے کہ ان کے ناک کے نیچے کیا کھیل کھیل رہی ہے ان کی پیاری بہن۔" بھابھی اسے پرے دھکیل کر اندر چلی گئیں تاکہ علی بھائی کو کال کر سکیں اور وہ وہیں بیٹھی روتی رہی۔ جو قیامت آنا تھی وہ اسے اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ امی جی بالکل بت بنی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اسے کوئی کوسنے نہیں دیے۔ ایک لفظ نہیں کہا۔ بس چپ چاپ زمین دیکھتی رہیں۔ جیسے سکتے میں آ گئی ہوں۔

"امی جی! میری بات سنیں۔ پلیز میری بات سنیں۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا امی جی۔ ہاں میری

اس سے صرف دوستی تھی میں مانتی ہوں۔ بات کرتی تھی اس سے لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں اس غلطی پہ آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ پلیز، میرا یقین کریں میں نے کچھ ایسا نہیں نہیں کیا کہ آپ کی عزت پہ بات آئے۔"

لیکن امی جی بالکل ساکت تھیں۔ انہیں لگ رہا تھا کہ وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہیں۔ ابھی آنکھ کھلے گی اور سب ٹھیک ہو گا لیکن کچھ دیر بعد دروازہ کھول کر علی اندر داخل ہوا تو انہیں خبر ہوئی کہ وہ حقیقت تھی اور بہت بھیانک تھی۔

"یہ رہا اس کا موبائل۔" بھابھی نے جلدی سے علی بھائی کی طرف اس کا موبائل بڑھا دیا۔ علی بھائی کے جبڑے مارے غصے کے بھینچے ہوئے تھے۔ انہوں نے نیلو بھابھی سے موبائل تھامتے زمین پہ ماں کے قدموں میں بیٹھی تارہ کو دیکھا جو رو رہی تھی۔ ہاتھ جوڑ کر معافیاں مانگ رہی تھی۔

موبائل لاک نہیں تھا اسی لیے انہوں نے کالز کھول کر دیکھیں جہاں 'فرینڈ' کے نام سے ہی ڈھیروں کالز تھیں۔ کچھ کالج کی ٹائمنگ کے دوران ۔ کچھ رات کے وقت کی۔ کچھ صبح فجر کے وقت کی۔ ایسے تمام اوقات کی جن میں گھر والے اس کی نگرانی نہیں کر سکتے تھے۔

پھر میسجز کھولے۔ وہاں بھی ان باکس بھرا پڑا تھا ۔ ایسے میسجز تو کوئی بھی زیادہ نہ تھے کہ جو کانوں سے دھوئیں نکال دیتے لیکن پھر بھی ایک لڑکے کے میسجز تو تھے جو ان کی بہن کو ڈیئر، سویٹی جیسے القابات سے نواز رہا تھا۔ موبائل وہیں پٹخا اور لاتوں کا ایک سلسلہ تھا جو تارہ پہ شروع ہوا۔ وہ زمین پہ پڑی پٹتی رہی اور علی بھائی اسے مارتے چلے گئے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر معافیاں مانگتی رہی لیکن اس کے بندھے ہاتھ، بہتے آنسو کسی کو دکھائی نہ دیے۔

"اور پڑھنے دیں اسے وہ ناول اور ڈائجسٹ ۔ دکھائیں اسے ڈرامے اور سنائیں گانے۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ یہ کسی دن یہی سب کرنے لگ جائے گی۔ آ گیا نا وہ دن۔ تب میری باتیں ماں بیٹی کو بری لگتی تھیں۔ ابھی تو موبائل برآمد ہوا ہے نجانے کیا کیا اس لڑکے نے اسے اور اس نے اسے دیا ہو گا۔ ملاقاتیں کی ہوں گی۔ اور نجانے کیا کیا ہوا ہو گا جو سوچتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے۔"

بھابھی کی یہ باتیں علی بھائی کو مزید غصہ دلا رہی تھیں اور اس کے ساتھ ان کی لاتوں اور گالیوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔

"بھائی! مجھ سے اللہ کی قسم اٹھوا لیں، قرآن اٹھوا لیں۔ میں نے کچھ ایسا نہیں کیا۔" وہ روتے ہوئے، ہاتھ جوڑتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"اپنی گندی زبان سے اللہ اور اس کی کتاب کا نام بھی مت لو۔" بھابھی دہاڑیں۔

امی بت بنی کھڑے سب دیکھ رہی تھیں۔ آنسو ایک تواتر سے ان کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔ لیکن وہ کچھ نہیں بولیں۔ حالات نے، ان کے شوہر نے انہیں ایسا بنا دیا تھا کہ انہوں نے خود کو حالات کے رحم وکرم پہ چھوڑتے ہوئے بچوں کی بھی پروا چھوڑ دی تھی کہ وہ کب کیا کر رہے ہیں۔ اب جو ہو رہا تھا اس پہ وہ کیسے بولتیں۔ جب علی بھائی مار مار کر تھک گئے تو امی کی طرف دیکھا۔

"قسم سے امی، جو آپ نے ماں بن کر بھی دکھایا ہو۔ یہ سب آپ کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ بیٹی کے معاملے میں کون اتنا بے خبر ہوتا ہے۔ بیٹی کی ماں کی تو آنکھ بھی اس ڈر سے نہیں لگتی کہ کہیں کچھ ہو نہ جائے اور آپ ایسی بے فکری ماں ہیں۔ کبھی اس بات کی پروا کی ہو کہ بچے کیسے رہ رہے ہیں، کیا کر رہے ہیں۔ میں تو بیٹا تھا آپ سے دور اور دنیا کے نزدیک رہا۔ اسے تو آپ نے گھر کی چار دیواری میں ہی قید رکھا تو اس سے کیسے آپ اتنی بے خبر رہیں۔"

امی اب بھی ایسے ہی کھڑی رہیں۔

"آج سے اس کا کالج جانا بند جہاں یہ ایسی حرکتیں کرتی ہے۔ اس کا کتابیں پڑھنا بھی بند۔ یہ اب سے اپنے کمرے میں ہی بند رہے گی۔ مجھے اس

کی شکل تک نہیں دیکھنا۔" ٹھنڈا مار کر انہوں نے اسے ایک طرف کیا۔

گھٹی گھٹی سی چیخیں تارہ کے منہ سے بلند ہوتی رہیں۔ یہ تو شکر تھا کہ صحن ایسا تھا کہ کسی گھر سے دکھائی نا دیتا ورنہ یہ تماشا سب دیکھتے۔

تب ہی امی یکدم زمین پہ گریں اور انہیں فالج کا اٹیک ہوا۔ علی بھائی انہیں جلدی سے ہسپتال نہ لے جاتے تو نجانے کیا ہو جاتا۔ دو دن وہ ہسپتال میں رہی تھیں۔ بھابھی بھائی انہی کے پاس تھے یا کہاں۔ بس وہ گھر پہ دو دن اکیلی رہی تھی اور باہر تالا پڑا رہا تھا۔

جسم پہ مار کے نشانات نیل کی صورت موجود تھے لیکن جتنی روح گھائل ہوئی تھی وہ نشانات تو کسی آنکھ سے دکھائی نہیں دے سکتے تھے۔ پورا دن وہ روتی رہتی۔ ایک آدھ بار دل کیا کہ خود کو ختم کر دے۔ آخر اس نے اب تک جی کر کیا ہی کیا تھا لیکن بس خود کشی کی حرام موت اور آخرت میں اس کے عذاب سے وہ ڈر گئی۔

دو دن بعد امی گھر آ گئی تھیں لیکن اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ امی کے سامنے جا سکے۔ اس نے آصف کا نام کسی کے سامنے نہیں لیا حالانکہ بھابھی پوچھ پوچھ کر تھک گئیں کہ وہ تھا کون جس سے وہ بات کرتی تھی، اسے کہاں ملا لیکن وہ زبان سے بیٹھی رہی

۔

آصف نے اس سے کسی اور ذریعے سے کبھی رابطہ نہ کیا تھا۔ وہ خود بھی اس دن کے بعد سے ایک سال تک چھت پہ نہ گئی تھی۔ اور جب گئی تو وہاں بھی کوئی آصف نہیں آیا۔ نجانے وہ اس کے بارے میں کیا سوچتا ہوگا۔ سوچتا بھی ہوگا یا نہیں۔ وہ تو کبھی یہ بھی نہیں جان سکی کہ جو کچھ وہ کہتا تھا وہ ان باتوں میں سچا بھی تھا یا نہیں۔

وہ پورا دن کمرے میں پڑی رہتی۔ بند کمرے میں ایک اللہ تھا جس سے وہ بات کر سکتی تھی اور ایک اللہ تھا۔ اندر سے اپنی قمیص نکال نکال کر ان پہ پنسل سے پھول بوٹے بنا کر کڑھائیاں کرتی رہتی۔ کبھی اسکیچنگ شروع کر دیتی۔ کبھی پہلے سے پڑھی ہوئی کورس کی کتابوں کو بار بار پڑھتی۔ پہلے بھی اسے خود سے باتیں کرنے کی عادت تھی جو مزید بڑھ گئی۔ وہ خود ہی اپنے آپ کو مخاطب کرتی اور خود ہی جواب دے دیتی۔

پہلے وہ کمرا اسے جیل لگتا جہاں سے باہر کی اسے کوئی خبر نہیں تھی لیکن پھر اس جیل کی اسے خود کو عادی بنانا پڑا۔ بھابھی ناشتا کمرے میں رکھ جاتیں۔ دوپہر کے کھانے کے ساتھ برتن لے جاتیں۔ رات کا کھانا آتا تو دوپہر کے برتن اٹھا لیے جاتے۔

"تمہاری پھوپھو نادیہ کی کال آئی تھی۔ علی سے ساری بات پوچھ رہی تھیں۔ ساتھ میں کہہ دیا کہ انہیں یقین ہی نہیں آیا کہ تارہ ایسی نکل سکتی ہے۔ ان کو تو بہت ارمان تھے تمہیں اپنے بیٹے کے لیے لے جانے کے۔ اب صاف منع کر دیا ہے رشتے سے۔ کتنی بے عزتی کروائی ہے تم نے بھائی کی۔" ایک دن بھابھی کھانا رکھنے آئیں تو منہ بگاڑ کر سے جتایا۔

پہلے جیسی بات ہوتی تو اتنا تو وہ بھابھی سے سوال کرتی کہ یہ بات جو چار لوگوں کے درمیان تھی پھوپھو نادیہ کو کس نے بتائی۔ جواب وہ جانتی تھی پھر بھی پوچھتی ضرور۔ لیکن اب پہلے جیسی بات جو نہیں رہی تھی اسی لیے بس خاموش رہی۔ اس واقعے نے اس کی رہی سہی خود اعتمادی بالکل ختم کر دی تھی۔

بھابھی نے کام والی کی چھٹی کر دی اور اس سے گھر کا سارا کام کروانا شروع کر دیا۔ اس نے شکر ہی کیا کہ کم از کم اس بہانے وہ کمرے سے باہر تو نکلا کرے گی۔ وہ صفائی ستھرائی کر کے، کچن میں اپنا کھانا بنا کر واپس کمرے میں چلی جاتی۔ اتنا روزن کھلا تھا تو آئندہ شاید زیادہ بھی کھل جاتا تھا لیکن تین سال بعد بھی کوئی زیادہ حالات بہتر نہ ہو سکے تھے۔ بس ایک فرق آیا تھا کہ اس نے سال بعد پھر سے ایکسر سائز کے لیے چھت پہ جانا شروع کر دیا تھا لیکن اب وہ منہ اندھیرے یہ کام کرتی کہ کوئی بھی اسے نہ

دیکھ سکے۔

امی جی نے ایک طویل عرصے تارہ سے بات نہیں کی حالانکہ وہ ان کے کمرے میں جانے لگ گئی تھی۔ ان کے قدموں میں بیٹھ کر خاموش آنسو بہاتی رہتی۔ معافی مانگتی تھی، روتی تھی لیکن امی جی ایسے لیٹی رہتیں جیسے اس کی کوئی معافی، کوئی وضاحت سنتی ہی نہ ہوں۔ وہ بس دوسری طرف منہ پھیر لیا کرتی تھیں۔

وقت کے ساتھ فیزیوتھیراپی سے وہ بہتر تو ہو گئیں لیکن مکمل طور پہ ٹھیک نہیں ہو سکیں۔ علی بھائی نے تب سے اسے مخاطب نہیں کیا تھا تین سال ہو گئے تھے۔ وہ ان کے سامنے بھی نہیں جاتی تھی کہ کہیں وہ اسے پھر سے مارنے نہ لگ جائیں۔ کبھی کبھار اسے وہ مار بہت رلاتی تھی جو بھائی نے اسے ماری تھی۔ اس کے زخم جسم سے کب کے بھر گئے تھے لیکن روح سے نہیں بھرتے تھے۔ کبھی کبھار وہ بددعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے اٹھاتے رہ جاتی لیکن بھائی کے لیے نہیں جنہوں نے مارا تھا، بھابھی کے لیے جنہوں نے اس کے لیے یہ سارا تماشا سجایا تھا۔

تارہ کی زندگی میں بس یہی جمود تھا جس کے ساتھ وہ زندگی گزار رہی تھی۔

☆☆☆

مرتضیٰ کے پاس اس تکلیف کے لیے کوئی الفاظ تھے نہیں جو اسے تارہ کے لیے ہو رہی تھی۔ جو سن کر اتنی تکلیف محسوس کر رہا تھا تو جس پہ گزری تھی وہ کس درد سے گزری ہوگی۔

"کسی کو بے شک یقین ہو نہ ہو آپ کی بات کا مگر مجھے آپ کی بات پہ یقین ہے کہ آپ سچ کہہ رہی ہیں۔ جس غلطی کی آپ کو سزا دی گئی وہ اتنی بڑی نہیں تھی کہ آپ کو اس کی اتنی بڑی سزا دی جاتی۔ یہ سب ظلم ہے۔ سب سے زیادہ شرمندگی مجھے نیلو باجی پہ ہے۔ وہ جب تک اپنے گھر میں تھیں ایسی نہیں تھیں لیکن شادی کے بعد وہ ایسی ہوں گی یہ میں نے یہاں آکر جانا ہے۔ اور جتنا جانا ہے مجھے ان کو بہن کہتے شرمندگی کے سوا کچھ محسوس نہیں ہو رہا۔ یقین کریں کہ ہمارے گھرانے میں ہمیں انسانیت سکھائی گئی تھی لیکن معلوم نہیں وہ سب کچھ کیسے بھول گئیں۔ رشتے کا لحاظ انہوں نے نہیں کیا تو انسانیت کا ہی کر لیتیں۔"

اسے نیلو باجی کا رویہ قابل مذمت لگا۔

"اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ایک باہر کا انسان جس سے میرا کوئی رشتہ نہیں وہ میرا یقین کر رہا ہے لیکن میرے اپنے خونی رشتوں کو میرا یقین نہیں تھا۔ بھابھی کی جہاں تک بات ہے انہوں نے ہمیشہ سے اس گھر میں آکر ایک روایتی بھابھی کا کردار نبھایا ہے۔ انہوں نے یہی سب کرنا تھا۔ میری ایک کمزوری ان کے ہاتھ آئی تو مجھے بھائی اور امی جی کی نظروں میں گرانے کے لیے یہ ان کے لیے آسان رستہ تھا۔ مجھے ان سے سب سے کم شکوہ ہے۔ شکوہ مجھے میری امی جی سے ہے کہ وہ اپنی بیٹی کا کچھ تو اعتبار کرتیں۔ بھائی سے ہے کہ وہ مجھے یوں جانوروں کی طرح مارتے ہوئے ایک بار پوچھ لیتے، صفائی کا موقع دیتے تو میں سب سچ بتا دیتی۔" آنسو اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔

پہلی بار یہ ساری کہانی اس نے کسی کو سنائی تھی۔ شاید اس لیے کہ کبھی کوئی اس کے پاس بیٹھا ہی نہیں تھا جو نرمی سے اس سے پوچھتا کہ بتاؤ اصل ماجرا کیا تھا۔ تم کتنی بچی تھی کتنی چھوٹی تھی۔ تم نے کیا غلطی کی اور کیا تم پہ مسلط کر دی گئی۔ کسی نے ایک طویل عرصے سے اسے محبت سے مخاطب ہی نہیں کیا تھا بلکہ ایک لمبے عرصے تو مخاطب کیا ہی نہیں تھا۔ اب یہ ایک مہربان تھا جو اس سے بات کر لیا کرتا تھا لیکن اس کے بات کرنے سے بھی وہ ڈرتی تھی کہ کہیں پہلے جیسا کوئی نیا الزام اس پہ نہ لگا دیا جائے اور پھر سے ایک نئی سزا نہ سنا دی جائے۔

"میں پچھلی کسی بات کا مداوا نہیں کر سکتا مگر اتنی کوشش ضرور کر سکتا ہوں کہ آپ کی آگے کی زندگی جہنم ہونے سے بچا لوں۔ یقین کریں کہ ہر اندھیری رات کی صبح ہوتی ہے۔ یہ قانون فطرت ہے۔"

مرتضیٰ نے ایک طویل خاموشی کے بعد خود کو کہتے سنا۔

تارہ نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"پلیز، آپ کچھ ایسا مت کریے گا جو میرے ساتھ ساتھ آپ کے لیے بھی مسائل پیدا کر دے۔"
وہ اس کے ارادوں کی مضبوطی سے گھبرا گئی تھی۔

"آپ فکر مت کریں۔ اس بار آپ کے لیے کوئی مسائل پیدا نہیں ہوں گے کیونکہ اس بار نیلو باجی کے مقابلے ان کی نند یا گلی کا کوئی لڑکا نہیں ہے بلکہ ان کا بھائی کھڑا ہے، جس کا مقابلہ کرتے ہوئے بھی وہ سو بار تو سوچیں گی ہی۔" وہ ایک بھرپور تسلی دے کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

تارہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وہ کون تھا اور اس کے لیے کیا بن کر آیا تھا۔ جس عورت کی وجہ سے اسے اتنا درد ملا۔ اسی کا بھائی اس کے تمام کانٹے نکالنے کی بات کر رہا تھا۔ وہ کوئی مسیحا تھا، فرشتہ تھا یا بھلا انسان۔ جو کوئی بھی تھا اس کے دل کو عجیب امید دلا گیا تھا۔

کمرے میں لوٹ کر کچھ دیر مرتضیٰ سوچتا رہا اور پھر کسی نتیجے پہ پہنچ کر اس نے ایک کال ملائی۔ کچھ دیر بات کرنے کے بعد اس نے کال کاٹ دی اور جیسے ایک طمانیت بھری سانس لی۔

وہ اب جو کرنے جا رہا تھا اس سے وہ اس قید میں پڑی لڑکی کے رستے کے کانٹے چن کر اسے رہائی دلوا سکتا تھا۔

☆☆☆

اس دن نیلو باجی مرتضیٰ کے کمرے میں پانی کی بوتل لے کر آئی تھیں۔

"رات کھانے میں کیا بناؤں۔؟" لہجہ حد سے زیادہ میٹھا تھا جس پہ مرتضیٰ کا چونکنا بنتا تھا۔ اب تو جو بھی لہجہ وہ اپناتیں، مرتضیٰ کے دل سے ان کی عزت اور محبت دونوں ہوا ہو گئی تھیں۔ نجانے جو شادی سے پہلے وہ ان کا روپ دیکھتا رہا تھا وہ اصلی تھا یا شادی کے بعد کا یہ روپ؟

"کچھ بھی بنا لیں کیا فرق پڑتا ہے۔ سب اچھا ہی بنتا ہے آپ سے۔" وہ کون سا کھانے میں نخرے دکھاتا تھا۔ جو سامنے رکھو کھا لیتا تھا۔

"سب کچھ امی سے بنانا سیکھا ہے۔ لیکن مجھ سے زیادہ ذائقہ نائلہ کے ہاتھوں میں ہے۔ جو کھاتا ہے تعریف کیے بنا نہیں رہ سکتا۔"

وہ بہن کی تعریف میں رطب اللسان تھیں اور وہ سوچ رہا تھا کہ ان سے کہیں زیادہ ذائقہ تو تارہ کے ہاتھوں میں ہے، جس کی بنائی اس دن کی اروی شملہ وہ بھلائے نہیں بھول رہا تھا۔

"تم نے اپنی شادی کے بارے میں کیا سوچا؟"

نیلو کی ہمیشہ سے دلی خواہش تھی کہ وہ نائلہ کے لیے مان جائے۔ اس نے امی سے بھی بات کی تھی۔ ان کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی کیا بات ہونا تھی کہ گھر میں ہی بیٹی کی شادی کر دیں اور وہ آنکھوں کے سامنے رہے۔ اسی حوالے سے امی نے نیلو کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ مرتضیٰ سے اس کی مرضی معلوم کرے۔ اگر اس کی کہیں اور مرضی نہیں ہوئی تو وہ بڑی تائی امی سے بات کریں گی۔

"فی الحال تو نہیں سوچا تھا لیکن اب سوچ رہا ہوں کہ ٹریننگ ختم ہو تو کچھ سوچنا شروع کروں۔"
اس وقت اس کی وہ حالت تھی کہ بہ مشکل ان کے سوالات کے جواب دے پا رہا تھا۔

"کوئی لڑکی وڑکی دیکھی ہے یا وہ بھی میں دیکھوں؟" ذرا بے تکلفی سے پوچھا کہ وہ جتنا مان دیتا تھا یہ ذمہ داری بھی سونپ دے گا۔

"تائی امی ہیں نا اس کام کے لیے۔ وہ خود اپنی بہو فائنل کریں گی۔" اس کی بات پہ نیلو پھیکا سا مسکرا دیں۔

"وہ آ رہی ہیں اگلے ہفتے۔ پھر یہاں آ کر ہی تفصیل سے بات کریں گی۔"

نیلو نے خوش گوار حیرت سے مرتضیٰ کو دیکھا۔ تو کیا وہ بھی وہی سوچتا تھا جو وہ سوچ رہی تھیں۔

"تائی امی آ رہی ہیں۔ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ میں کل ہی گھر کی تفصیلی صفائی کرواتی ہوں۔"

اور وہ جانتا تھا کہ وہ کس سے یہ تفصیلی صفائی کروائیں گی۔

☆☆☆

جمعے کو دوپہر کے وقت اس نے بس اڈے سے جا کر امی کو پک کیا اور گھر لے آیا۔ تائی امی شام کے وقت پہنچی تھیں تو چائے پہ کوئی انتظام تو کرنا تھا۔ نیلو نے جلدی سے علی کو بازار بھیجا کہ چائے کے ساتھ کھانے کے لیے دو تین لوازمات لے آئیں۔ تائی امی سب سے ملنے کے بعد نیلو کی ساس کے کمرے میں چلی گئیں تا کہ ان سے ملاقات ہو سکے۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ بستر سے بہ مشکل اٹھتی ہیں۔

"تمہاری نند کہاں ہے نیلو۔ اسے بھی تو بلاؤ۔"

تائی امی کی بات پہ نیلو نے پہلو بدلا۔ امی جی بھی بے چین سی دکھائی دیں۔

"وہ لوگوں سے کم ہی ملتی ہے تائی امی۔"

"چلو کم ہی ملتی ہو گی پر ملتی تو ہے۔ جا کر بلا لاؤ ہمیں۔" چاروناچار نیلو کو اٹھنا ہی پڑا۔

"میری تائی امی آئی ہیں۔ کچھ اپنا حلیہ درست کر کے انہیں امی کے کمرے میں سلام کرنے آجاؤ۔" تارہ کے کمرے میں جھانکا تو وہ تسبیح پڑھ رہی تھی۔ سارا دن کمرے میں کام کیا تھا۔ سلائی کڑھائی یا عبادت۔ اس نے کچھ حیرت سے بھابھی کو دیکھا۔

"میں؟" یقین نہیں آیا کہ وہ کسی مہمان سے ملوانے کی بات کر رہی ہیں۔

"تم سے ہی کہہ رہی ہوں۔ وہ ملنا چاہتی ہیں تو کیا کیا جائے۔ منہ ہاتھ دھو کر۔ ڈھنگ کا کوئی لباس پہن کر آجاؤ۔"

ڈھنگ کا لباس اس کے پاس تھا ہی کہاں۔ اس کے پاس تو کچھ بدرنگی ڈھیلی ڈھالی کالے، بھورے رنگ کی قمیصیں ہی تھیں جن پہ وہ سفید دوپٹا اوڑھ لیا کرتی تھی۔ ہاں ایف ایس سی کے زمانے کا عید کا ایک جوڑا پڑا تھا گلابی رنگ میں جو امی جی نے اسے بنوا کر دیا تھا۔ ہر عید پہ وہ وہی جوڑا پہن کر کمرے میں بیٹھ جاتی تا کہ خود کو یقین دلائے کہ آج عید ہے۔

وہی جوڑا پہن کر وہ امی جی کے کمرے میں آئی جہاں علی بھائی کے علاوہ سب موجود تھے۔ اس نے سلام کیا تو مرتضیٰ نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ اس کھلتے گلابی رنگ میں وہ خود بھی گلاب ہی لگ رہی تھی۔ کسی قسم کے میک اپ سے بے نیاز بھی۔ وہ کتنی پیاری لگ رہی تھی کہ تائی امی نے سلام کا جواب اور ماشاء اللہ ایک ساتھ کہا تھا۔ ان کی نظروں میں تارہ کے لیے ایسی چمک تھی کہ نیلو کا دل ڈوب گیا اور امی جی کے اندر امید کا دیا ٹمٹمانے لگا۔

"بہن سعدیہ۔ بغیر کسی لگی لپٹی کے صاف صاف بات کہوں گی کہ میں تو یہاں اتنے دور آئی ہی اس بچی کی وجہ سے ہوں کہ اس کا ہاتھ مانگ سکوں۔ مجھے اپنے مرتضیٰ کے لیے یہ بچی بہت پسند آئی ہے اور پہلے یہ میرے بیٹے کی پسند ہے۔"

امی جی ہکا بکا ان کی شکل دیکھنے لگیں اور نیلو باجی تو بت بن گئیں۔ تارہ کو جیسے حیرت کا جھٹکا لگا اور وہ گنگ سی مرتضیٰ کو دیکھنے لگی جو سادگی سے مسکرا رہا تھا کہ میں نے کہا تھا نا کہ یہ اندھیری رات جلد روشنی میں ڈھل جائے گی۔ ایسی بات کی توقع کسی کو بھی نہیں تھی۔

"اب انکار مت کریے گا کہ یہ میرے بیٹے کی خوشی ہے۔" تائی امی نے اتنے مان، اتنے پیار سے رشتہ مانگا تھا کہ امی جی کی آنکھیں خوشی سے چھلک پڑیں۔

"آپ شاید جانتی نہیں ہیں اس لڑکی کے بارے میں۔ کیا کیا گل کھلاتی رہی ہے یہ۔" نیلو باجی کیوں خاموش رہتیں۔ ایک تو ان کی بہن کی بات نہیں بن رہی تھی، دوسرا تارہ بی بی کے نصیب کھلنے جا رہے تھے وہ بھی ایسی اچھی جگہ۔

"میں سب جانتی ہوں نیلو۔ تمہیں کوئی بات بھی دہرانے کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے۔ نہ صرف میں جانتی ہوں بلکہ مرتضیٰ بھی جانتا ہے۔ اس

لیے کچھ بھی دہرا کر کسی کا دل برا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

تائی امی نے اتنے ٹھوس لہجے میں کہا کہ نیلو ٹس سے مس ہو گئی۔ مرتضیٰ کو غصے سے گھورنے لگیں جو سنجیدہ بیٹھا تھا۔ وہ ذرا سی بھی خبر لگنے دیتا کہ یہ ارادہ رکھتا ہے تو وہ کچھ بھی کر کے اسے پہلے سے باز کر دیتیں۔ وہ تو سوچ بیٹھی تھیں کہ تائی امی شاید نائلہ کے حوالے سے کوئی اشارہ دیں گی حالانکہ یہ سوچنا چاہیے تھا کہ اگر نائلہ کے حوالے سے کچھ کہنا سننا ہوتا تو وہ براہ راست نیچے والے پورشن میں جا کر امی سے کہہ دیتیں، اتنے دور لاہور آنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔

"علی نہیں مانیں گے۔" اس نے نیا پانسا پھینکا۔

"اسے میں منا لوں گی۔" تائی امی کا اعتماد قابل دید تھا۔

"جاؤ کچن میں جا کر چائے رکھو۔ یہاں کیا بیٹھی ہو۔" نیلو باجی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ تارہ کا قیمہ بنا دیتی۔ مکھی بنا کر دیوار سے چپکا دیتی۔ منظر سے کسی طرح غائب کر دیتی۔ بڑی مشکل سے ضبط کر رکھا تھا

اتنے میں علی بھائی اندر داخل ہوئے، بیوی کا پھولا منہ اور امی جی کی نم آنکھوں نے باور کروایا کہ کچھ ہوا ہے۔

"علی بیٹا! یہاں آ کر بیٹھو۔ کچھ بات کرنا ہے تم سے۔" تائی امی نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

نیلو بے چینی سے پہلو بدلنے لگی۔ کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی کہ سامنے تائی امی تھیں جن کے انگنت احسان تھے اور اس کے گھر کے خرچے میں اب بھی وہ امی کی مدد کیا کرتی تھیں۔

"میں اپنے مرتضیٰ کے لیے تارہ کا ہاتھ مانگنے آئی ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔" وہ حیرت سے تائی امی اور مرتضیٰ کی شکل دیکھنے لگے۔ بیگم کے پھولے منہ کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔

"کسی کو اعتراض ہو نہ ہو۔ مجھے اعتراض ہے تائی امی۔ مرتضیٰ میرا بھائی ہے۔ سب سے پہلا حق میرا ہے نا، کہ اس کے لیے لڑکی میں ڈھونڈوں۔ آپ کو ملی بھی تو ایک تھوکی ہوئی لڑکی جسے کوئی چاٹنا پسند نہیں کرتا۔"

"نیلو۔" اس کی بات اتنی سخت تھی کہ علی سے برداشت نہ ہو سکا۔ بھلے وہ بہن کی شکل نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس سے بات نہیں کرتے تھے لیکن اس کے لیے دوسروں کے سامنے ایسی بات سننا انہیں بہت برا لگا تھا۔ مرتضیٰ کے تو روم روم سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ نیلو باجی کے جملے نے اس کا پارہ آسمان پہ پہنچا دیا تھا جو شوہر کے منع کرنے کے باوجود خاموش ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔

"میری بہن جو آپ کے گھر میں ہی موجود ہے۔ وہ آپ کو کیوں دکھائی نہ دی۔ سات سمندر پار لڑکی کا رشتہ لینے آپ آ گئی ہیں جس کے بارے میں جانتی ہی کتنا ہیں آپ؟ نائلہ گھر کی بچی ہے۔ اس کا کیوں نا سوچا آپ نے؟" اب بات ہو رہی تھی تو کھل کر ہونا چاہیے تھی۔ وہ سوچ چکی تھیں نائلہ نہیں تو تارہ بھی نہیں۔

"ایسی کیا خرابی ہے تارہ میں کہ اس کے بارے میں نہ سوچا جائے۔ نائلہ آپ کی طرح میری بہنوں جیسی ہے۔ بچپن سے جیسے آپ کو بڑی بہن سمجھا ویسے اسے چھوٹی بہن سمجھا۔ اب کیسے اسے جیون ساتھی سمجھ لوں۔ ویسے بھی جاننے کی بات تو مت کریں۔ آپ ساری زندگی ہماری آنکھوں کے سامنے رہیں لیکن آپ کو ہم کہاں جان سکے۔ جان سکتے ہوتے تو جو یہاں آ کر آپ نے کیا وہ اتنا حیران اور پشیمان نہ کرتا۔" اس بار مرتضیٰ خاموش نہیں رہا تھا۔ وہ بڑی بہن کو یوں جواب نہیں دینا چاہتا تھا لیکن تارہ کے لیے ان کا جملہ اسے آگ لگا گیا تھا۔

"ایسا کیا کیا ہے میں نے مرتضیٰ کہ تم بہن کے گلے پڑ گئے ہو؟"

"مانا کہ تارہ سے غلطی ہوئی تھی۔ نادان تھی وہ۔ کم عمر تھی۔ گھر کے حالات ایسے رہے تھے کہ وہ باہر

راغب ہو گئی لیکن یہ سب جاننے کے بعد آپ چاہتیں تو اس کا پردہ رکھ سکتی تھیں۔ اسے سب کے سامنے ذلیل ہونے سے بچا سکتی تھیں۔ لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ آپ کے ہاتھ موقع آیا تھا اسے سب کی نظروں سے ہمیشہ کے لیے گرانے کا تو آپ نے اسے پوری طرح استعمال کیا۔ اگر بات تارہ اور نائلہ کے تقابلی جائزے کی ہے تو چھوٹی عمر میں ایک ایسی غلطی نائلہ سے بھی ہوئی تھی جسے آپ سب نے ڈھانپ لیا تھا۔ ایسے چھپا لیا تھا کہ اوپر والے پورشن میں بیٹھے لوگوں تک کو خبر نہ ہو سکی تھی۔" یہ بات اسے ابو سے پتا چلی تھی لیکن وہ ہمیشہ کسی کی پردہ داری کی وجہ سے خاموش رہا تھا۔

تائی امی نے کچھ حیرت سے مرتضیٰ کو دیکھا۔ یہ بات تو انہیں بھی نہیں پتا تھی۔

نیلو باجی کی بولتی اسی ایک بات سے بند ہو گئی۔ علی بھائی نے کچھ بے چینی سے پہلو بدلا۔

"خیر آپ تو بھابھی تھیں آپ سے کیا اچھائی کی امید کی جاتی لیکن علی بھائی آپ تو بڑے بھائی تھے اس کے۔ ایک بار اسے صفائی کا موقع تو دیتے۔ بٹھا کر پیار سے پوچھتے تو سہی کہ کیا سچ تھا کیا جھوٹ۔ آپ تو گھر کے حالات سے واقف تھے پھر بھی اسے مجرم گردان کر اتنی کڑی سزا سنا ڈالی۔ پھر مڑ کر بھی دیکھا تک نہیں کہ وہ کس حال میں اسی چھت تلے رہ رہی ہے جہاں آپ بھی رہتے ہیں۔ بڑے سے بڑے مجرم کو بھی اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقع تو ملتا ہے۔ آپ اس کی نادانی، کم عمری، نا سمجھی کا اسے کچھ تو فائدہ دیتے۔ تھوڑا ظرف بڑا کر کے اسے سمجھا بجھا کر معاملہ دبا لیتے۔ لیکن آپ نے تو ایک ظالم منصف کی طرح بس فیصلہ سنا کر اسے قید میں ڈال دیا۔ آپ نے یہ تک نہیں سوچا کہ جو بات چار لوگوں میں ہوئی وہ خاندان میں کیسے پھیل گئی؟"

اس نے آخر میں نیلو باجی کو جتاتی نظروں سے دیکھا۔ نیلو باجی اب کچھ بھی کہنے کے لائق نہیں رہی تھیں لیکن علی بھائی اس بات پہ یک دم چونکے تھے۔

"اور آنٹی، آپ سے بس یہی شکوہ ہے کہ آپ نے ہمیشہ خاموشی اختیار کیے رکھی اور مظلوم بن گئیں۔ پہلے شوہر کے سامنے۔ پھر بہو کے سامنے۔ پھر بیٹے کے سامنے۔ بیٹی سے کچھ غلط ہوا تو اس کی ڈھال تک نہ بن سکیں حالانکہ آپ تو اپنی بیٹی کی معصومیت اور سادگی سے واقف تھیں۔ آپ نے یہ نہیں سوچا کہ آپ کی تربیت اتنی گئی گزری تو نہیں تھی کہ اس نے کوئی انتہائی قدم اٹھا لیا ہو۔ آپ ہر بات پہ خاموش رہیں۔ بچپن میں جب بچی کو ایک سہیلی کی ضرورت تھی، آپ نہیں بنیں۔ آپ نے اس کی تنہائی دور کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اسے بچپن سے اکیلا چھوڑے رکھا۔ ایسے والدین کے بچے جب گھر سے محبت اور توجہ نہیں پاتے تو باہر ضرور جاتے ہیں اور پھر باہر انہیں جو بھی ملتا ہے ان کے ہاتھوں استعمال ہوتے ہیں۔ والدین کو بچوں کا دوست بننا چاہیے اس سے پہلے کہ باہر والے انہیں اپنا دوست بنا لیں۔ غلطی آپ بڑوں کی تھی جس پہ آپ لوگوں کو تو کسی نے سزا نہیں سنائی اور اس معصوم لڑکی کو ساری سزائیں سنا ڈالیں۔"

امی جی بستر پہ پڑی اس دن بھی خاموش آنسو بہا رہی تھیں۔

"تم نے سب ٹھیک کہا ہے مرتضیٰ۔ میں اچھی ماں نہیں بن سکی کیونکہ میری کوشش ہمیشہ یہی رہی کہ میں اچھی بیوی بن جاؤں۔ اس سے پرے میں نے بچوں کی طرف بھی دیکھا ہی نہیں۔ دیکھ لیتی تو شاید شوہر کے قریب تو نہ ہو سکی تھی، بچوں کو ہی خود سے قریب کر لیتی۔ لیکن یقین جانو میں جانتی ہوں کہ تارہ بے قصور ہے اور اس کی اتنی غلطی نہیں تھی جتنا بہو نے بنا دی۔ مگر مجھے اسی گھر میں اس سمیت رہنا تھا تو میں کیا کرتی۔ مجھے اب بھی خاموش ہونا پڑا۔ میں اس کی طرف اس لیے نہیں دیکھ پاتی کہ میں اس کی مجرم ہوں۔ اس سے نظریں ملاتے مجھے شرم آتی ہے۔ میں اس سے نہیں، خود سے ناراض ہوں۔ خود سے کئی شکوے ہیں مجھے۔ کئی پچھتاوے ہیں۔ میں نے کئی بار اس سے معافی مانگنے کی کوشش کی لیکن پھر یہ سوچ کر کہ میں ماں ہوں تو اس سے کیسے معافی مانگوں مجھ

میں ہمت نہیں ہو سکی۔"

تارہ جو شاید باہر کھڑی سب سن رہی تھی۔ لپک کر امی جی کے سینے سے لگ گئی۔ دونوں رو رہی تھیں۔ امی منہ سے کچھ کہنے کے بجائے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھیں اور وہ ان کے ہاتھ چوم رہی تھی۔

علی بھائی سر جھکائے بیٹھے تھے۔ مرتضیٰ نے انہیں جو آئینہ دکھایا تھا، وہ خود بھی کبھی کبھار وہ آئینہ دیکھتے تھے لیکن پھر جھٹک دیتے تھے۔ زندگی جیسی گزر رہی ہے، گزرنے دو کی سوچ پہ وہ خاموشی کی چادر اوڑھ لیتے تھے۔ اپنا قصور مان لینا، نادم ہونا، اس کا مداوا کرنا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ ان کے بھی نہیں تھا۔

"آنٹی! مجھے اس رشتے پہ کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ جب چاہیں اپنی امانت لے جا سکتی ہیں۔ میں بڑے بھائی ہونے کی ذمہ داری بہتر طریقے سے پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔"

وہ اٹھ کر باہر چلے گئے تھے۔ نیلو باجی بھی ان کے پیچھے لپکیں لیکن انہوں نے کمرے کا دروازہ ان پہ بند کر دیا۔ انہیں کچھ وقت اکیلے خود کے ساتھ گزارنا تھا۔

"میں مرتضیٰ کی ٹریننگ ختم ہوتے ہی اپنی بیٹی کو لینے آؤں گی۔" تائی امی نے مسکرا کر سعدیہ کو دیکھا تو وہ بھی تارہ کا ہاتھ تھام کر مسکرا دیں۔

☆☆☆

"یہ لو اپنا پراسپیکٹس اور اسے بغور پڑھ کر بتانا کہ کون سے مضامین چنو گی۔" مرتضیٰ نے تیار بیوی کے ہاتھ میں مشہور کالج کا پراسپیکٹس تھمایا جو وہ آج ہی آفس سے واپسی پہ لایا تھا۔

"ابھی سیکنڈ ایئر کا رزلٹ تو آ لینے دیں۔" تارہ مسکرا دی۔

شادی کے بعد اس نے پہلا کام ہی اپنی پڑھائی کا سلسلہ دوبارہ جوڑنے کا کیا تھا۔ ساتھ میں مرتضیٰ نے اسے یوگا کلاسز میں بھی ایڈمیشن دلوا دیا تھا۔ بہو آئی تو ابو بھی اوپر آ کر رہنے کے لیے مان گئے تھے اور اب مرتضیٰ کے ساتھ ہی رہتے تھے۔

ان کی شادی پہ علی بھائی نے بہن کو رخصت کرتے ہوئے گلے سے لگایا اور سر پہ ہاتھ دھرا۔ اس سے زیادہ وہ معافی نہیں مانگ سکتے تھے۔ لیکن تارہ کے لیے یہی بہت تھا۔ نیلو باجی کو اس دن کے بعد سے یوں بھی چپ لگ گئی تھی کہ علی بھائی اور ان میں ایک عجیب سا فاصلہ در آیا تھا۔ وہ جو کہتی تھیں کہ وہ سارا گھر اچھے سے سنبھال سکتی ہیں، انہوں نے آ کر ان کے رشتے بکھیر دیے تھے۔ ابھی وقت لگنا تھا انہیں پھر سے سب ٹھیک کرنے میں۔ امی جی نے تو کتنی بار ہی تارہ سے معافی مانگی تھی لیکن تارہ نے انہیں دل سے نہ صرف معاف کیا بلکہ ان کے بندھے ہاتھ چوم چوم کر یقین دلایا کہ وہ ان سے خفا نہیں ہے۔

"تم نے ماسٹرز کس سبجیکٹ میں کرنے کا سوچا ہے ویسے۔" وہ بستر پہ بیٹھا بڑے انہماک سے بیوی کو پڑھتے دیکھ رہا تھا۔

"میں مارشل آرٹس میں کچھ کرنا چاہتی ہوں مرتضیٰ۔"

"اللہ خیر۔ تاکہ میری پٹائی لگا سکو۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"نہیں تاکہ اپنا شوق پورا کر سکوں۔"

مرتضیٰ نے سر تائید میں ہلایا۔

"اچھا اب اس اکو کو تو کمرے سے باہر کرو۔ اس کی اب کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہوں نا تمہیں کمپنی دینے کے لیے اور جب میں نہ ہوں تو تائی امی، ابو ہوں گے۔"

تارہ ہولے سے مسکرا دی۔

"میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ یہ میرے برے دنوں کا ساتھی ہے۔"

"تو میں کیا ہوں۔؟" مرتضیٰ نے منہ بنایا۔

"آپ اچھے دنوں میں لانے کا ذریعہ اور اب بہت اچھے دنوں کے ساتھی۔" اس کی بات پہ وہ دونوں ہنس دیے۔

وہ جو کہہ کر گیا تھا کہ اس کی زندگی میں تپتی دھوپ کو گھنی چھاؤں سے بدل دے گا تو وہ خود اس کے لیے گھنی چھاؤں بن گیا تھا۔

☆☆

قرۃ العین خرم ہاشمی

ڈگڈگی

”دعا! کبھی کمرے سے باہر آ کر ماں کے پاس بھی بیٹھ جایا کرو۔“

پورے گھر میں پھیلی خاموشی سے گھبرا کر ارم نے اونچی آواز میں چھوٹی اور لاڈلی بیٹی کو پکارا جو آج کے زمانے کے سب سے خطرناک وائرس ”موبائل فون“ کا شکار ہو کر اپنی ایک الگ دنیا بنا کر کمرے میں بند رہتی تھی۔ ٹیکنالوجی کی دنیا میں گم دعا ماں کے مسلسل پکارنے پر چونکی۔ جلدی سے سائن آؤٹ کیا اور کمرے سے باہر نکلی۔

ارم بڑبڑاتی ہوئی لاؤنج میں بکھری نادیدہ چیزیں ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہی تھی کیونکہ گھر میں کم افراد ہونے کی وجہ سے ہر چیز اسی ترتیب میں موجود رہتی۔ اس گھر کے پانچوں افراد نظم وضبط سے زندگی گزارنے کے عادی تھے اس لیے گھر میں بکھری ہوئی چیزیں کم ہی نظر آتی تھیں۔

”آج آپ نے آنٹی طاہرہ کے ساتھ شاپنگ پہ جانا تھا ناں؟“

بیس سالہ دعا نے مسکراتے ہوئے لاؤنج میں قدم رکھا اور ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔ صوفہ کشن درست کرتی ارم نے خفا نگاہ اس پر ڈالی۔

”تمہیں اکیلا چھوڑ کر؟ ماں ہوں، بیٹی نہیں جسے اپنی خوشی سے آگے کچھ نظر نہیں آتا۔“

ارم کا اشارہ کل شام کے واقعہ کی طرف تھا جب دعا اپنی سہیلیوں کے ساتھ شاپنگ پر جاتے



ہوئے ماں کو اکیلا چھوڑ گئی تھی۔

"سوری مما، مگر فریال نے اچانک پروگرام بنایا تو مجھے جانا پڑا۔ ورنہ میں آپ کو بھی اکیلا چھوڑ کر نہیں جاتی۔"

اس نے جلدی سے وضاحت دی۔

"یہ نئی بات نہیں ہے۔ تم ہمیشہ اچانک ہی پروگرام بناتی ہو جبکہ ہم نے طے کیا تھا کہ ڈنر تمہاری مرضی کا بنے گا اور ہم مل کر انجوائے کریں گے۔ میں نے اتنی محنت اور محبت سے تمہاری پسند کا کھانا بنایا مگر تم نے دوستوں کے ساتھ ڈنر کر لیا۔" ارم نے منہ بنا کر کہا۔ محنت سے بنائے کھانے کی بے قدری نے اس کا دل بہت دکھایا تھا۔

"میں کیا کروں؟ میرا سوشل سرکل بہت بڑا ہے۔ ہر روز کسی نئی ایکٹویٹی کی وجہ سے معروف رہتی ہوں۔"

اس نے فخریہ انداز میں کہا تو ارم نے گھورا۔ وہ کھسیانی ہو کر مسکرانے لگی۔

"تم سے بڑی کرن بھی ہے مگر اسے ہر چیز میں بیلنس کرنا آتا ہے۔ توازن زندگی کی خوب صورتی ہے۔"

اس نے ہمیشہ کی طرح بھینس کے آگے بین بجایا تھا۔

"کچھ ہفتوں تک کرن آپی ہاؤس جاب مکمل ہوتے ہی گھر واپس آجائیں گی۔ ان کے آنے سے آپ کا اکیلا پن دور ہو جائے گا۔ ویسے یاد تو میں بھی کرتی ہوں۔ ہمارے گھر کے سب افراد ہی دور ہیں۔ کرن آپی دوسرے شہر میں اور دانیال بھائی اعلا تعلیم کے لیے لندن چلے گئے۔ بابا ویسے ہی زیادہ تر شہر سے باہر ہوتے ہیں۔ رہ گئے آپ اور میں۔ ہم دونوں کے مزاج ہی نہیں ملتے۔ قسم سے ساس، بہو والی وائبز آتی ہیں۔" اس نے شرارت سے کہا۔ ارم گہری سانس لے کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

"میں اکثر اتنی محنت اور محبت سے سجائے آشیانے کو خالی ہوتا دیکھ کر عجیب سی اداسی کا شکار ہو جاتی ہوں۔ شاید اس لیے بھی تمہاری لاپروائی پر غصہ آتا ہے۔"

اس نے تھکے لہجے میں کہا۔

دعا نے جلدی سے ماں کا ہاتھ تھام کر تسلی دی۔

کچھ دیر دونوں کے درمیان خاموشی حائل رہی۔ اس خاموشی کو دعا کے موبائل ٹون نے توڑا۔ وہ جلدی سے موبائل کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ارم کے منہ کے زاویے بگڑے جو اسے فوراً محسوس ہو گئے تھے۔

"سوری مما، مگر آپ کو پتا تو ہے کہ میرے بنائے اسکیچز کتنے مشہور ہیں۔ پچھلے دنوں میں نے جن مشہور شخصیات کے اسکیچز بنا کر سوشل میڈیا پر شیئر کیے تھے۔ اس پر دو سو لائکس اور کمنٹس ہیں۔ میرے کام کی بہت تعریف ہو رہی ہے۔ سب پوچھتے ہیں کہ میں نے کہاں سے سیکھا؟ جب میں انہیں بتاتی ہوں کہ میرا شوق ہے تو وہ بہت حیران ہوتے ہیں۔"

اس نے خوشی سے بتایا۔ کمپیوٹر سائنس کی طالبہ ہونے کے ساتھ وہ ایک اچھی آرٹسٹ بھی تھی۔ رنگوں سے کھیلنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ سوشل میڈیا سرکل نے اس کے شوق کو مزید بڑھا دیا تھا۔ اسی وجہ سے بہت سے لوگ اس سے فیور لیتے ہوئے فری میں کام کروا لیتے جیسے کوئی ڈرائنگ چارٹ بنانا یا کسی خاص ایونٹ کے لیے مختلف اسکیچز یا کارڈز بنانا وغیرہ۔ دعا اپنی سادگی اور جذباتی پن میں چند تعریفوں کے عوض سب کام کر دیتی۔ اس لیے بھی اس کے پاس وقت کی کمی رہتی تھی۔ ابھی بھی اسے موبائل پر معروف دیکھ کر ارم نے گہری سانس لی اور ریموٹ اٹھا کر دیوار پر لگی اسکرین پر اپنا پسندیدہ کوکنگ چینل دیکھنے لگی۔ دعا نے ماں کو معروف دیکھا تو چپکے سے وہاں سے کھسک گئی۔ اسے اپنی فیس بک دوست ہما کے بھائی کی سالگرہ کے لیے کچھ خاص کارڈز بنانے تھے۔

☆☆☆

"دعا! تمہارا کام بہت کمال کا ہے۔"

"کیا خوب صورت تخیل ہے۔"

"تمہارا بنایا اسکیچ دیکھ کر تو میں حیران رہ گئی۔ اتنا پرفیکٹ......؟"

"میرے گھر میں تو سب تمہارے کام کے فین ہیں۔"

اس طرح کے ملتے جلتے کئی تبصروں سے اس کا ان باکس بھرا رہتا تھا۔ دعا یہ سب تبصرے بار بار

بڑھتی اور خوشی سے پھولے نہیں سماتی۔ اس کے فالورز کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ شہرت کا نشہ اسے سرشار رکھتا۔ کئی لوگ اس کے کام کے حوالے سے جانتے تھے۔ وہ سوشل میڈیا پر جتنی ان رہنے لگی تھی، گھر والوں سے اس کا فاصلہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

کرن ہاؤس جاب مکمل کر کے واپس آ گئی اور آج کل گورنمنٹ ہسپتال میں اپنے فرائض سر انجام دے رہی تھی۔ دعا کی نسبت کرن سمجھ دار تھی۔ وہ ہر چیز کو بیلنس کرنا جانتی تھی۔ اپنے فارغ وقت کی اس کی کوشش ہوتی کہ اپنی ماں کی تنہائی دور کر سکے۔ ارم اس کے آنے سے بہت خوش تھی۔ دعا سے اس کے شکوے کم ہو گئے مگر ختم نہیں ہوئے تھے۔

دوسری طرف دعا کی شخصیت میں آنے والی تبدیلی منفی تھی۔ اسے ہر وہ بات بری لگتی جو اس کی بہتری کے لیے کی جاتی تھی۔ اس لیے گھر والوں سے دور رہنے لگی تھی۔

☆☆☆

وہ شام کی چائے پینے کا ارادہ کرتے ہوئے جیسے ہی کمرے سے نکلی تو لاؤنج میں بیٹھی ماں سے باتیں کرتی کرن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''ڈاکٹر میں بنی ہوں مگر مصروفیت تمہاری بڑھ گئی ہے۔'' کرن نے مسکرا کر کہا۔ اس کا منہ بن گیا۔

''کیونکہ ڈاکٹر تو بہت سے لوگ ہوتے ہیں جبکہ میرا جیسا ہنر بہت کم لوگوں کے پاس ہے۔ شہرت سب کو تو نہیں ملتی ناں۔'' اس نے غرور سے گردن اکڑا کر کہا۔

''تم سوشل میڈیا کے چند لائکس اور کمنٹس کو اپنی کامیابی سمجھ رہی ہو؟'' ارم نے حیرانی سے سوال کیا۔

''اف! وہ چند لائکس اور کمنٹس حاصل کرنے میں بہت محنت لگتی ہے۔ لوگ میرے کام کے دیوانے ہیں۔ میرے فالورز کی تعداد دو ہزار ہو گئی ہے۔''

اس نے ایسے کہا جیسے وہ انٹرنیشنل اسٹار بن گئی ہے۔ جس کے لاکھوں فین ایک جھلک دیکھنے کے لیے مرے جاتے ہیں۔ کرن اور ارم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ہنس پڑیں۔ ان دونوں کو ہنستا دیکھ کر اسے بہت برا لگا۔

''آپ لوگوں کو ٹیلنٹ کی کیا قدر ہے؟ اسی لیے میں آپ سب سے دور رہتی ہوں۔'' وہ غصے سے بولتی واپس کمرے کی طرف بڑھی۔

''رکو میری بات سنو! اچھا سوری۔۔!'' کرن نے بے اختیار پکارا مگر وہ کچھ بھی سنے بغیر وہاں سے چلی گئی۔

''میں نے اسے ناراض کر دیا۔'' کرن نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''میں کافی ٹائم سے نوٹ کر رہی ہوں کہ دعا کی سوچ بہت منفی ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی مرضی اور پسند کے خلاف بات کرنے والا ہر شخص اسے دشمن ہی نظر آتا ہے۔'' ارم نے فکرمندی سے کہا۔

''اس کی عمر ابھی ایسی ہی ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی۔ ویسے بھی ہم سب کی لاڈلی ہے۔ نخرے تو کرے گی۔'' کرن نے لاپروائی سے کہا۔

چھوٹی بہن سے اس کی محبت ایسی ہی بے لوث تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ دعا کو منانے کے لیے اپنے ساتھ آؤٹنگ پر لے گئی۔ دعا کی من پسند آئسکریم اور بے تکان گفتگو کو ڈرائیونگ کرتی کرن بہت توجہ سے سن رہی تھی اس لیے دعا کا خراب موڈ بحال ہو گیا۔ ایک گھنٹے بعد دونوں گھر واپس لوٹی تو انھیں ہنستا مسکراتا دیکھ کر ارم نے سکون کی سانس لی۔

☆☆☆

دعا جب سے یونیورسٹی سے واپس لوٹی، کمرا بند کر کے بیٹھی تھی۔ ارم نے کچھ دیر تو برداشت کیا مگر پھر اس کا صبر بھی جواب دے گیا اس لیے کرن تھکی ہاری گھر میں داخل ہوئی تو ماں کو غصے میں دیکھ کر چونک گئی۔

''ضرور دعا نے کچھ کیا ہوگا۔'' کرن نے سلام کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''ہاں تو اور کون ہے یہاں؟ تمہارا باپ اور بھائی تو گھر سے باہر ہوتے ہیں۔ ہم تین ہی ایک دوسرے سے الجھنے کے لیے رہ گئے ہیں۔'' اس نے چڑے لہجے میں کہا۔

کرن نے ماں کو کندھوں سے تھاما اور اپنے سامنے بٹھا کر میز پر رکھا پانی کا گلاس پیش کیا۔ ارم نے خاموشی سے پانی پیا تو اس کا غصہ کچھ کم ہوا۔

"اب بتائیں کیا ہوا؟" کرن نے نرمی سے سوال کیا۔

"وہی جس کا ڈر تھا۔ ہر وقت موبائل ہاتھ میں رہے گا تو پڑھائی کیسی ہوگی؟ مجھے تو لگتا ہے مشکل ہی ہے یہ فائنل سمسٹر پاس کرے۔ اس سمسٹر میں بمشکل پاس ہوئی ہے۔" ارم نے سر پکڑتے ہوئے کہا۔

کرن ان کی بات سن کر پریشان تو ہوئی مگر ظاہر نہیں کیا کیونکہ وہ تینوں بہن بھائی ہمیشہ سے پڑھائی میں اچھے رہے تھے۔ اس لیے بھی ان کے والدین کو پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میں دعا سے بات کرتی ہوں۔ ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔"

اس نے نرمی سے کہا تو ارم گہری سانس لے کر رہ گئی۔

"آپ کو مما نے بھیجا ہوگا؟ آپ بھی مجھے ہی الزام دیں گی۔" وہ کمرے میں داخل ہوئی تو دعا نے منہ بسور کر کہا۔ وہ مسکرائی۔

"ہرگز نہیں! میں تو یہ کہنے آئی تھی کہ کل میری وارڈ میں دس سال کا بہت پیارا سا بچہ ایڈمٹ ہوا ہے۔ وہ بہت بیمار ہے۔ میری اس سے بہت اچھی دوستی ہوگئی ہے۔ کیا تم اس کا اسکیچ بنا دو گی؟"

کرن نے اپنے موبائل میں ایک تصویر دکھائی۔ بچہ بہت کمزور تھا مگر اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں امید کی چمک بہت واضح تھی۔ بچے کی تصویر دیکھ کر دعا اداس ہوگئی۔

"کتنا معصوم سا ہے۔ میں ضرور اس کا اسکیچ بناؤں گی اور آپ کے ساتھ اس سے ملنے بھی جاؤں گی۔"

دعا نے پرجوش ہو کر کہا تو وہ مسکرا کر سر ہلانے لگی۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کرن فریش ہونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کرن کے نارمل رویے نے دعا کو پُرسکون کر دیا تھا۔ وہ دلجمعی سے بیمار بچے کا اسکیچ بنانے لگی۔

☆☆☆

"آپی! کیا سچ میں اسکیچ بہت اچھا بنا ہے؟" دعا نے گھر سے نکلتے، گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کئی بار یہ سوال کیا تو موڑ کاٹتی کرن مسکرا دی۔

"مجھے یقین ہے احمد کو یہ اسکیچ بہت پسند آئے گا۔ تم نے اس کے لیے پھول اور چاکلیٹس بھی تو لی ہیں۔ وہ بہت خوش ہوگا۔"

کرن نے تسلی دی تو وہ سر ہلا کر گاڑی سے باہر دیکھنے لگی۔ کرن نے سرسری نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔

"تمہیں نہیں لگتا کہ پچھلے کچھ عرصے میں تم سوشل میڈیا کو بہت اہم سمجھنے لگی ہو؟ میرا مطلب ہے تمہارا زیادہ وقت ان لوگوں کے ساتھ گزرتا ہے جن سے تم بس نام کی حد تک واقف ہو۔ کیا یہ عجیب نہیں لگتا؟"

اس نے سرسری انداز میں سوال کیا تاکہ دعا کو برا نہ لگے۔ اسی وقت ان کی گاڑی ٹریفک جام میں پھنس گئی تو کرن کو مجبوراً رکنا پڑا۔ تب اچانک اس کی نگاہ فٹ پاتھ پر کھڑے ایک شخص پر پڑی جس نے بندر کی رسی تھام رکھی تھی اور وہ ڈگڈگی بجا کر اسے مختلف تماشے دکھانے پر مجبور کر رہا تھا تاکہ لوگ خوش ہو کر پیسے دیں۔ کرن بہت غور سے اس آدمی کے ہاتھوں کی حرکات کو دیکھ رہی تھی جبکہ اس سب سے بے پروا دعا اپنی دھن میں بول رہی تھی۔

"وہ سب میرے کام کو سراہتے ہیں۔ اپنے گھر، یونیورسٹی، فیملی میں سب مجھے عام سمجھ کر برتاؤ کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک میری کوئی اہمیت نہیں ہے جبکہ سوشل میڈیا پر میرے فالورز ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ میری پوسٹ پر لائکس اور تبصرے کرنے والوں کی بڑی تعداد ہوتی ہے۔" اس نے فخر سے کہا۔

کرن نے گردن گھما کر پہلے اسے اور پھر اس آدمی کو دیکھا جو ڈگڈگی بجاتے ہوئے بندر کا تماشا دکھا رہا تھا۔

"میری معصوم بہن! سوشل میڈیا پر ہماری کامیابی، ہمارا اسٹیٹس، ہماری قابلیت اس ڈگڈگی کی طرح ہے جسے جب جب بجاؤ گے، اپنے آس پاس

ہمدردی، لگاوٹ، محبت، خلوص، وغیرہ جیسے جھوٹے کرتب دکھانے، تماشے کرنے والے جمع کرتے جاؤ گے۔ ایک بار اپنی کامیابی کی ڈگڈگی بجانا بند کرو اور پھر دیکھو کون کتنا بڑا تمہارے ہنر، تمہاری قابلیت کا قدردان ہے۔"

اس کی بات مکمل ہوتے ہی راستہ کھلا تو وہ تیزی سے گاڑی نکال کر لے گئی۔ دعا کو اس کی بات کا مطلب واضح سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اس لیے وہ الجھ گئی۔ احمد سے ملتے ہوئے بھی وہ اسی الجھن کا شکار تھی مگر احمد کے پیارے چہرے پر خوشی اور مسرت دیکھ کر وہ سب بھول گئی۔ احمد حیران تھا کہ اس کا اسکیچ اتنی عمدگی سے بنا ہے۔ وہ بار بار اپنے چہرے کو چھو کر دیکھ رہا تھا۔ کافی دیر احمد کے ساتھ گزار کر وہ واپس جانے کے لیے ہسپتال سے نکلی تھیں۔

"میں گاڑی لے کر آتی ہوں تم مین گیٹ پر پہنچو۔" کرن نے جلدی سے کہا اور دوسری سمت میں چلی گئی۔

دعا بھی تیزی سے مین گیٹ کی طرف بڑھی۔ اس ہسپتال کی پارکنگ بیسمنٹ میں بنی تھی۔ اس لیے کرن کو گاڑی لانے میں کچھ ٹائم لگتا تھا۔ دعا جیسے ہی باہر نکلی تو سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کی نگاہ کچھ دور سڑک کنارے کھڑے آدمی اور اس کے بندر پڑی تو اسے بے اختیار کرن کی کہی باتیں یاد آئیں۔ اس کا ذہن پھر سے الجھ گیا۔ اسی بے دھیانی میں وہ سیڑھیوں سے سلپ ہو کر زمین پر گرتے ہی بے ہوش ہو گئی۔ کچھ دیر میں ہی وہاں لوگ اکٹھے ہو گئے۔ اسے فوری طور پر ایمرجنسی میں لے جایا گیا۔ کرن کو جیسے ہی اطلاع ملی وہ دیوانہ وار بھاگتی ہوئی ایمرجنسی میں داخل ہوئی جہاں خون میں لت پت دعا بے ہوش پڑی اس کا دل دہلا گئی تھی۔

☆☆☆

"بس اور نہیں کھانا۔" دعا نے کمزور آواز میں بیزاری سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد تازہ جوس بنا دوں گی۔" ارم نے سوپ کا باؤل پیچھے کرتے ہوئے نرمی سے اس کے چہرے پر آئے بال پیچھے کیے۔

"میری بیٹی کتنی کمزور ہو گئی ہے۔"

اس کے پیلے چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ فکرمندی سے سوچ رہی تھی جبکہ دعا بیزاری سے کمرے میں ادھر اُدھر نگاہ ڈال رہی تھی۔ چند دنوں کی بیماری نے اسے چڑچڑا بنا دیا تھا۔ اسے بیڈ ریسٹ کرتے ہوئے پندرہ دن ہو چکے تھے۔ سیڑھیوں سے گرنے کی وجہ سے اس کے سر اور بازوؤں پر کافی چوٹیں لگی تھیں جس کی وجہ سے وہ ہر کام کے لیے دوسروں پر انحصار کر رہی تھی۔ ارم تو ہر پل اس کے پاس رہتی۔ بیٹی کے گرنے کا سن کر سہیل بھی فوراً گھر آ گئے تھے جبکہ دانیال ہر روز اس سے ویڈیو کال پر بات کرتا۔ کمزوری کی وجہ سے دعا زیادہ دیر اسکرین کو ٹائم نہیں دے پاتی تھی۔ اسے شدید چکر آنے لگتے تھے۔

"شکر ہے دعا کی سب رپورٹس ٹھیک آئی ہیں۔ ان شاء اللہ کچھ دنوں میں دوبارہ سے نارمل روٹین کی طرف لوٹ آئے گی۔"

کرن ہسپتال سے واپس لوٹی تو اس کے ہاتھ میں دعا کی نئی ٹیسٹ رپورٹ تھی۔ ارم نے سنتے ہی دعا کو گلے سے لگا کر پیار کیا اور شکرانے کے نفل ادا کرنے کے لیے چلی گئی۔ کرن مسکراتی ہوئی دعا کے ساتھ بیڈ پر نیم دراز ہو کر باتیں کرنے لگی۔ وہ جب سے بیمار ہوئی تھی سب اسی طرح خیال رکھ رہے تھے۔ کوئی اسے ایک لمحے کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑتا تھا۔

"یاد آیا...... تمہارے سب سے بڑے پرستار نے تمہارے لیے یہ پھول اور چاکلیٹ بھیجی ہے۔"

کرن نے جلدی سے سائیڈ میز پر رکھا اپنا بیگ اٹھا کر اس میں سے گلاب کی کلی اور چھوٹی چاکلیٹ نکالی جو ہسپتال کی کینٹین سے احمد نے خریدی تھی۔ دعا نے حیرت سے دونوں چیزیں تھام لیں۔

"ایک اور بھی مزے کی چیز ہے تمہارے لیے۔"

کرن نے شرارت سے کہتے ہوئے ایک کاغذ بیگ سے نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے ہاتھ

بڑھا کر کاغذ تھاما۔ اسے کھول کر دیکھتے ہی بے اختیار ہنس پڑی۔ احمد نے مختلف کلر پنسل کے استعمال سے اس کی تصویر بنانے کی کوشش کی تھی۔

"ویسے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تمہاری جلد کی رنگت براؤن کے بجائے ہری ہے اور آنکھیں کالی کے بجائے پنک اور......!" کرن نے شرارت سے کہا تو دعا ہنستے ہنستے نڈھال ہی ہوگئی۔

"اف! آج کتنے دنوں کے بعد دل سے ہنسی ہوں......" اس نے بمشکل اپنی ہنسی پر قابو پایا۔ "آپ فکر مت کریں میں ٹھیک ہوتے ہی سب سے پہلے احمد کو اسکیچ بنانا سکھاؤں گی تاکہ اگلی بار وہ میری ایسی رنگ برنگی شکل نہ بنائے۔" اس نے عہد کرتے ہوئے کہا تو کرن نے سر ہلا دیا۔

"اچھا بتاؤ! کون سی آئی ڈی اوپن کرنی ہے؟ انسٹا گرام کی یا فیس بک؟" کرن نے اپنا موبائل ہاتھ میں پکڑتے ہوئے سوال کیا۔

"کس لیے؟" دعا نے لاپروائی سے پوچھا۔ کرن چونکی۔

"تمہارے فالوورز اداس اور پریشان ہوں گے کہ مستقبل کی پاکستانی پکاسو کہاں گم ہوگئی ہیں۔" کرن نے چھیڑتے ہوئے کہا۔ دعا نے نگاہیں چرائیں۔

"آپ نے ٹھیک کہا تھا۔ جب تک اپنے نام، اپنے کام، اپنی کامیابی کی ڈگڈگی بجاتے رہو سب آس پاس رہتے ہیں جیسے ہی ہم ڈگڈگی بجانا روکتے ہیں، وہ لوگ ایسے غائب ہوجاتے ہیں جیسے کبھی تھے ہی نہیں!" اس نے مدھم لہجے میں اعتراف کیا۔ کرن نے سر ہلایا۔ وہ جانتی تھی کہ دعا اس سچ کو پا چکی ہے جو اس کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔

"کوئی بات نہیں! ہم ہیں تمہارے ساتھ۔" کرن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اس کے موبائل پر ضروری کال آنے لگی تو وہ فوراً اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ دعا نے اس کے جاتے ہی تکیے کے نیچے رکھا اپنا موبائل نکالا اور خاموش نگاہوں سے سوشل میڈیا پر مسلسل لاگ ان ہوئی اپنی آئی ڈی کو دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں بے ساختہ نمی پھیل گئی۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ پچھلے پندرہ دن سے ہر روز اپنے سوشل میڈیا اکاؤنٹ کو دن میں کئی بار دیکھتی تھی شاید کسی نے اس کی کمی محسوس کی ہو۔ کسی نے اس کی غیر حاضری کا نوٹس لیا ہو مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ منظر سے ایسے غائب ہوئی تھی جیسے کبھی اس کا حصہ تھی ہی نہیں۔ اس کی دوستوں نے ایک یا دو بار کال کر کے حال پوچھا تھا جن کی ایک کال پر وہ سب کچھ چھوڑ کر فوراً گھر سے چلی جاتی تھی۔ جب اسے ضرورت پڑی تو وہ سب ہمیشہ کی طرح شاپنگ، آوٹنگ، موویز، پارٹی کرنے میں مصروف تھے۔

"زندگی کا یہ تجربہ تلخ ضرور ہے مگر اس سے کشید ہونے والا سچ، میری آئندہ زندگی کے لیے کافی ہے۔ کم از کم مجھے یہ تو سمجھ میں آگیا کہ میں اپنی زندگی کا سب سے قیمتی وقت ان چیزوں اور لوگوں پر ضائع کر رہی تھی جو اس کے قابل نہیں تھے۔"

اس نے مایوسی سے سوچا اور سوشل میڈیا سے لاگ آؤٹ کرتے ہوئے اپنا موبائل سائیڈ میز کی دراز میں ڈال دیا۔ جب وہ مڑی تو اس کی نگاہ بے ساختہ بستر پر پڑے کاغذ پر پڑی۔ اس نے احمد کا بھیجا کاغذ اٹھایا اور پھر گلاب کی کلی کی خوشبو کو سونگھا تو ایسے لگا جیسے اس کی اندر پھیلی مایوسی میں کسی کے خلوص کی خوشبو شامل ہوگئی تھی۔ اس کی اداسی غائب ہوگئی۔

"کسی کا معمولی اور بے لوث عمل ہی ہم سب کی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہوتا ہے اور میں خوش نصیب ہوں کہ میرے آس پاس اتنے پیارے اور محبت کرنے والے رشتے موجود ہیں۔"

اس نے بہت احتیاط سے وہ کاغذ تہ کر کے دراز میں رکھ دیا کہ زندگی میں جب کبھی بھی وہ خلوص کی خوشبو محسوس کرنا چاہے تو اس کاغذ کو چھو کر دیکھ لے گی۔

☆☆

سحر خاک

سُنی سنائی

"اللہ جی پلیز! جلدی جلدی اچھا سا اینڈ ہو جائے۔ آپ کو تو پتا ہے کل مکمل کرنا ہے مجھے یہ ناول۔ میرے اور اس پیارے سے چاند کے پیارے اللہ جی۔" چاند کی دیوانی نے چاند کو دیکھتے ہوئے کہا پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

"ہائے ہائے یہ کیا کہہ رہی ہو؟" دائیں والی



چھت سے حیرانی سے بھری آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ تجسس لیے خلافِ عادت باتیں سننے لگی۔

"تو سچ کہہ رہی ہوں، اڑتی اڑتی خبر پہنچی ہے مجھ تک۔"

"وہ! دیکھو ذرا، ہمیں تو شک تک نہ ہونے دیا کبھی"۔ شگفتہ آنٹی کی آواز میں ابھی بھی حیرانی محسوس ہو رہی تھی۔

"ارے بہن! بہت سیدھی ہو تم بھلا ایسے کارناموں کی خبر کون ہونے دیتا ہے۔" دوسری عورت نے ذرا ہلکی آواز میں کہا۔

"سیدھی ضرور ہوں مگر بہت عقل مند ہوں، اس عدیل پہ تو مجھے شک تھا مگر کبھی کوئی سراغ ہاتھ نہیں لگا بس۔" شگفتہ آنٹی نے فوراً جھوٹ گھڑا۔

"مگر یہ بات اپنے تک ہی رکھنا ہم کیوں کسی کی بیٹی کو بدنام کریں۔"

"زنجبیل! نیچے آؤ کھانا کھالو روٹیاں ٹھنڈی ہو رہی ہیں۔" نیچے سے زرینہ نے آواز دی۔

"اچھا امی! آ رہی ہوں بس۔" وہ غصے کو ضبط کرتی ہوئی نیچے چلی گئی ورنہ دل تو اس کا شگفتہ آنٹی کو ٹوکنے کا تھا۔

"جلدی آؤ، ایک تو تمہاری اس ڈائری اور پین سے جان نہیں چھوٹتی۔"

"کام ہی کرتی ہوں میں کون سا شوق سے لے کر پھرتی ہوں۔"

"اتنی اکتائی ہوئی کیوں ہو۔" زرینہ نے اپنی بیٹی کو کچھ جھنجلاہٹ میں دیکھا تو پوچھا۔

"ساتھ والی شگفتہ آنٹی کسی عورت سے پتا نہیں کس لڑکی کا ذکر ہماری گلی والے عدیل کے ساتھ کر رہی تھیں۔ مجھے تو سمجھ میں ہی نہیں آتا لوگوں کو کیا مسئلہ ہے، جھوٹے الزامات لگاتے رہتے ہیں۔ مگر میں آپ کو کہہ رہی ہوں اگر شگفتہ آنٹی آپ سے اس بارے میں کوئی بات کریں تو پلیز، ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیجیے گا۔" وہ جانتی تھی اپنی ماں کو خبریں پھیلانے میں تو ہمیشہ اچھی کارکردگی دکھائی تھیں وہ۔

"ارے نہیں۔ مجھے کیا ضرورت ہے پرائے معاملے میں کودنے کی۔" انہوں نے بُرا مناتے ہوئے کہا۔

"ویسے کڑھی زیادہ مزے کی بنی ہے آج۔" زنجبیل نے اپنی بات کا اثر زائل کرنے کے لیے ماں کی تعریف کی۔

"کیوں پہلے اچھی نہیں بنتی تھی۔"

"نہیں پہلے بھی اچھی ہوتی تھی مگر آج زیادہ اچھی بنی ہے۔"

"ہاں وہ وہی کل کا تھا۔ اچھا وہ ذرا باؤل میں کڑھی ڈال دو، میں شگفتہ کو دے آؤں اسے پسند ہے۔"

"زنجبیل نے اس بات پر ماں کو ایکسرے مشین کی نظر سے دیکھا۔

"گھور کیوں رہی ہو، ہمسائے کے گھر کوئی چیز دینا جرم تو نہیں ہے۔"

"چیز دینا جرم نہیں ہے۔ مگر جو آپ کرنے جا رہی ہیں وہ جرم ہے بلکہ گناہ ہے، وہ بھی بہت بڑا۔ اور ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ آپ کو کوئی ضرورت نہیں ہے پرائے معاملے میں کودنے کی۔"

"اچھا چلو، جاؤ کڑھی لا کر دو، زیادہ میری ماں نہ بنو۔ اور ویسے بھی محلے کی خیر خبر رکھنی چاہیے۔ اور دنیا پاگل نہیں ہے جو ایسے ہی باتیں بنائے۔ بڑے کہتے ہیں زبانِ خلق کو نقارہ خدا سمجھو۔"

"جی مگر جب زبانوں سے سچی باتیں نکلیں نہ کہ اس طرح کے جھوٹ۔" اس نے کڑھی کا باؤل زرینہ کو دیتے ہوئے کہا۔

"چار کہانیاں کیا لکھ لیں تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ماں کی ہی تربیت کرنے لگ گئی ہو۔ دروازہ بند کر لو، میں آتی ہوں گھنٹے میں"۔ انہوں نے گیٹ کا لاک کھولتے ہوئے کہا۔

"یا اللہ جی! امی کی یہ عادت ختم کر دیں مجھے

بالکل زہر لگتی ہے ان کی یہ ٹوہ لینے اور باتیں پھیلانے والی عادت۔''

☆☆☆

''ارے، زرینہ باجی آپ!'' شگفتہ نے خوف زدہ سی ہو کر کہا۔ کہیں ہماری باتیں سن تو نہیں لی۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

''کیوں میں نہیں آ سکتی تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے میں پہلی بار آئی ہوں تمہارے گھر۔''

''نہیں نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے بس ایسے کہہ دیا آپ برا نہ مانیں۔'' شگفتہ نے اپنے وہموں کو جھٹکتے ہوئے کہا۔

''نہیں، میں اپنی چھوٹی بہن کی بات کا برا کیوں منانے لگی۔ یہ کڑھی لائی ہوں تمہارے لیے۔''

''یہ تو بہت اچھا کیا آپ نے، میرا ابھی دل کر رہا تھا مگر اس گرمی کے ڈر سے تو مجھ سے بنائی ہی نہیں گئی۔''

''چلو تمہارے نصیب کی تھی تو تم تک پہنچ گئی۔ ویسے میں تم سے کچھ پوچھنے بھی آئی تھی......'' زرینہ نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''یہ عدیل والا کیا معاملہ ہے۔''

زرینہ کی اس بات پر تو شگفتہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور وہ ہونقوں کی طرح زرینہ کو دیکھنے لگی۔

''ارے۔ میں نے کون سا کوئی انوکھا سوال پوچھ لیا جو تم سوچ میں پڑ گئیں۔''

''آ آ نہیں...... سوچ میں تو نہیں پڑی...... مگر آپ کو کیسے پتا چلا۔'' شگفتہ نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''سب کو پتا چل گیا ہے تو مجھے بھی معلوم ہو گیا۔''

زرینہ کا انداز اور سوال شگفتہ کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ مگر اس نے گھبراتے ہوئے بتانا شروع کیا۔ ''بس باجی، وہ محلے میں خبر پھیلی ہے کہ عدیل اور وہ...... زنجبیل ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔''

''اچھا۔ تو اس زنجبیل نے عدیل کو بھی اپنے چکر میں پھنسا لیا۔ ''ارے میں نے تو اسے اس دن

ڈرائیور کے ساتھ بھی دیکھا ہے ایک بار جو محلے کی سب لڑکیوں کو یونیورسٹی چھوڑنے جاتا ہے۔'' اس بار تو شگفتہ کے حواس جواب دیتے دیتے بچے تھے۔

''واقعی باجی...... تو پھر آپ نے زنجبیل کو روکا نہیں؟''

''مجھے کیا پڑی تھی اسے روکنے کی اور ویسے بھی آج کل جس طرح لڑکوں کو لگام ڈالنا مشکل ہے ویسے ہی لڑکیوں کو بھی ہے۔''

''ہمم......''

شگفتہ کے منہ سے مارے حیرانی کے یہ ہی نکل سکا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ زرینہ خود اپنی بیٹی کے بارے میں ایسی باتیں بتائیں گی اور رہی سہی کسر زرینہ کے اطمینان نے نکال دی تھی۔

''مجھے لگتا ہے تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے میں چلتی ہوں تم آرام کرو۔'' زرینہ نے شگفتہ کے تاثرات سے خراب طبیعت کا اندازہ لگایا۔

☆☆☆

''تمہیں کیا ہوا ہے ایسے بت بنی بیٹھی ہو۔'' اسلم گھر آیا تو زرینہ کو سوچ میں گم دیکھا تو پوچھا۔

''سوچنے والی بات تو ہے۔''

''اب بتاؤ بھی، آخر ایسا کیا ہو گیا جس نے تمہیں کڑھی بھی بھلا دی۔'' اسلم نے کڑھی کی خوشبو سونگھتے ہوئے شگفتہ پر چوٹ کی۔

''یہ جو زنجبیل ہے نا، اس کا افیئر چل رہا ہے اپنی گلی والے عدیل کے ساتھ۔''

''مگر وہ ایسی لڑکی لگتی تو نہیں اور عدیل کو بھی کبھی ایسی ویسی کوئی حرکت کرتے نہیں دیکھا۔''

''اصل بات تو سن لیں آپ۔''

''ابھی کچھ رہتا ہے بتانے والا؟''

''اصل حیرانی والی بات یہ ہے کہ ابھی زرینہ باجی آئی تھیں کڑھی دینے اور مجھ سے خود زنجبیل اور عدیل کے متعلق پوچھنے لگیں۔ میں نے تو ڈرتے ڈرتے بتایا کہ محلے میں یہ بات پھیلی ہے مگر انہیں کوئی غصہ نہیں آیا نہ کوئی...... واویلا کیا بلکہ مجھے خود بتا کر گئیں...... ہیں

کہ وہ تو اس وین ڈرائیور سے بھی ملتی ہے باہر۔"

"بات تو حیرانی والی ہے مگر چھوڑو آج کل سب چلتا ہے۔ تم جا کر کھانا لاؤ، مجھے بھوک لگی ہے۔"

"اچھا لا رہی ہوں مگر آپ نہ کسی سے ذکر کیجیے گا خوامخواہ ہمارا نام آ جائے گا۔"

"اچھا جاؤ، نصیحتیں نہ کرو۔"

شگفتہ چلی گئی مگر وہ جانتی تھی کہ اسلم کو بتانے کا نتیجہ، اس بات کا صبح تک محلے کے مردوں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل جانا ہی تھا۔

☆☆☆

چند دن گزرنے کے ساتھ ساتھ زنجبیل کے بارے میں پھیلی افواہ بھی بہت سی زبانوں اور کانوں سے گزر گئی۔ مگر زرینہ خود ہی اپنی بیٹی پر لگائے بہتانوں سے انجان اس کی مہندی کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔

مہندی کی تقریب میں بھی زنجبیل کی ہی باتیں ہو رہی تھیں۔ تب ہی لڑکے والوں کے مہندی لے کر آنے کا شور مچ گیا۔ اور زنجبیل کے بارے میں ہونے والی چہ مگوئیوں کا سلسلہ کچھ دیر کے لیے تھم گیا۔ اور زنجبیل کے ہونے والے سسرالیوں اور دولہے کے متعلق باتیں شروع ہو گئیں۔

"بے چارہ لڑکا۔ اسے کیا پتا کیسی لڑکی اس کے گلے باندھی جا رہی ہے۔"

"ہاں سراسر دھوکا دے رہی ہیں ماں بیٹی مل کر۔ ویسے یہ عدیل نہیں آیا کیا..... میں تو آئی تھی کہ کوئی نہ کوئی تماشا ضرور ہوگا۔" شگفتہ کو آ کر جھوٹی خبر دینے والی عورت نے اس سے کہا۔

"بیٹھا ہوگا کہیں کسی اور لڑکی کے ساتھ، وہ کون سا جوگ لے کر بیٹھنے والوں میں سے ہے؟"

"یہ بھی ہے۔" دونوں نے ہاتھ پر ہاتھ مارتے دبی آواز میں قہقہہ لگائے ہوئے کہا۔

"چلو آؤ، زنجبیل کی تصویریں لیتے ہیں، عدیل کی ماں کو دکھائیں گے۔"

خوبصورت غرارے کے ساتھ قمیص پہنے، فریش پھولوں سے سجے جھولے پر بیٹھی بہت خوش اور حسین لگ رہی تھی۔

ہال کے دوسرے حصے میں کسی لڑکے نے فلک کو مٹھائی کھلاتے ہوئے زنجبیل اور وین ڈرائیور کے بارے میں ہلکا سا اشارہ دیا۔ تو وہ اٹھ کر اپنے باپ کے پاس آیا۔

"ابو! زنجبیل اچھی لڑکی نہیں ہے۔"

"یہ کیا بکواس کر رہے ہو، جاؤ جا کر اسٹیج پر بیٹھو، تماشا مت بناؤ، نہ ہمارا نہ لڑکی والوں کا۔"

"آپ سمجھ کیوں نہیں رہے میں اس سے شادی نہیں کروں گا۔"

"تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ وہ بن باپ کی بچی ہے۔ اتنی اچھی ہے، پڑھی لکھی ہے اور کیا چاہیے تمہیں؟"

"کوئی نہ کوئی آ کر اس کے برے کردار کے بارے میں باتیں کر رہا ہے۔"

"لوگوں کی باتوں میں آ کر اس کی اور اپنی خوشیاں برباد مت کرو۔ اس کا کردار بالکل ٹھیک ہے ہم نے رشتہ طے کرتے وقت پوچھ گچھ کی تھی۔"

"تو پھر لوگ کیوں یہ سب کہہ رہے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے رشتہ دار ہوں جو کسی ذاتی رنجش کی وجہ سے الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہیں..... تم جاؤ جا کر بیٹھو، ہال کا ٹائم ختم ہونے والا ہے۔"

فلک کو باپ کی بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ مگر وہ دوبارہ رسم کے لیے بیٹھا ہی تھا کہ اس کی ماں بھی واویلا کرتی ہوئی آئی اور فلک کو گھر چلنے کا کہا۔

"اب تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"پاگل ہو گئی ہوں۔ اتنا بڑا دھوکا دے رہی تھیں یہ ماں بیٹی ہمیں۔ کوئی عورت کہہ رہی ہے گلی میں کسی لڑکے کو پسند کرتی ہے۔ کسی کا کہنا ہے وین ڈرائیور سے شادی کرنا چاہتی تھی اور کوئی یونیورسٹی میں کسی ٹیچر کے بارے میں انکشاف کر رہی ہے۔ اتنے برے کردار کی لڑکی کو کوئی شریف گھرانا کیسے اپنی بہو بنا لے۔"

"دیکھا ابو! میں کہہ رہا تھا آپ سے مگر آپ ہی نہیں مانے۔"

”امی! آپ ایک بار آنٹی زرینہ کی بات تو سن لیں۔“ فلک کی بہن نے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”بس چپ رہو تم۔ تمہیں نہیں پتا ایسے معاملات کی سنجیدگی کا۔“ پھر شوہر سے مخاطب ہوئیں، ”چلیں آپ بھی، کیا دیکھ رہے ہیں مجھے؟“

سب مہمان ہال کے دروازے سے باہر جا رہے تھے تب ہی عدیل اپنی ماں کے ساتھ ہال میں داخل ہوا۔

”رک جائیں، میری بات سنیں۔ میں عدیل کی ماں ہوں اور یہ ہے عدیل۔ ہمیں پتا چلا آپ کا ایسے رشتہ ختم کر کے جانے کا تو ہم غلط فہمی دور کرنے آ گئے۔ زنجبیل بہت اچھی لڑکی ہے اس کا کردار بھی اچھا ہے۔ میرے بیٹے کا اور اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”ہم بہرے یا اندھے نہیں ہیں جو آپ کی بات پر یقین کر لیں۔ چلیں اگر ہم یقین کر بھی لیں تو وہ دوسرا لڑکا اور وہ یونیورسٹی والا ٹیچر ان کے تو بڑے گہرے تعلقات ہیں نا، اس فراڈ لڑکی کے ساتھ۔“ فلک کی ماں نے اسی طرف آتی زنجبیل کو دیکھ کر غصے سے کہا۔

”آنٹی، عدیل بھائی، آپ رہنے دیں۔ آپ کو کوئی ضرورت نہیں ہے ان کی منتیں کرنے کی۔ اچھا ہوا یہ رشتہ ختم ہو گیا۔ جن لوگوں کو آج مجھ پر اور میری ماں پر یقین نہیں ہے وہ کل کو کیا یقین کرتے۔“ زنجبیل نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ بھلا تم کیوں چاہو گی میرے بیٹے سے عزت کے ساتھ شادی کرنا۔ تمہیں کوئی کمی تھوڑی ہے اپنے جیسوں کی۔“

”آنٹی! اب آپ حد سے بڑھ رہی ہیں۔“

حدیں تو تم ماں بیٹی نے پار کی ہیں۔ اپنی عزت کا خیال تو تھا ہی نہیں ہماری بھی بے عزتی کروا دی۔ چلیں سب چلتے ہیں ہم۔“

☆☆☆

”تم مجھے معاف کر دو۔ میں گناہ گار ہوں [illegible] نے کسی کی بیٹی کے تمہاری۔ جو ذلت کا [illegible] لیے کھودا تھا وہی گڑھا میری بیٹی کی عزت اور خوشیوں کی قبر بن گیا۔“ زرینہ نے زنجبیل کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”نہیں امی! ایسا مت کریں پلیز۔ آپ کو آپ کی غلطیوں کا احساس ہو گیا بس ٹھیک ہے، میرے لیے کافی ہے۔“

”تم سمجھاتی رہیں مجھے، مگر قسم کھا کر کہتی ہوں مجھے پتا ہوتا کہ اس دن شگفتہ وہ گھٹیا باتیں تمہارے بارے میں کر رہی ہے میں منہ نوچ لیتی اس کا۔ مگر میں تو سمجھی کہ وہ جو نئے کرائے دار آئے ہیں ان کی بیٹی زنجبیل کی بات کر رہی ہے۔“

”اب آپ وہ باتیں نہ سوچیں۔ بس اور یہ رونا بند کریں۔“

”تم بہت ظرف والی ہو زنجبیل۔“ زرینہ نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”ماں باپ اولاد کی بے شمار غلطیاں معاف کرتے ہیں تو پھر ایک آدھ غلطی کے لیے اولاد بھی معاف کر سکتی ہے۔“

”میں نے ارادہ ہے۔ یہاں سے جانے کا۔ بس ہم کل ہی سامان پیک کرنا شروع کرتے ہیں اور تمہارے ماموں کے پاس چلے جائیں گے۔ وہ خود ہی اس گھر کو بکوا دیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں سونے جا رہی ہوں، آپ بھی سو جائیں آ کر۔“

زنجبیل کو لیٹے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو گیا مگر نیند کا شائبہ تک نہ تھا اس کی آنکھوں میں۔ اس نے اپنی ڈائری اور پین نکالا اور لکھنا شروع کیا۔

سنی سنائی باتوں پر بھی تم کان نہ دھرنا۔
جو کان میں پڑ جائے تو زباں تک لانے سے پہلے تصدیق کرنا۔
سگوں کی زبانیں ہی ڈس گئیں مجھے۔
تم کسی کی زندگی میں زہر نہ بھرنا۔
میں بے قصور ہی قصوروار ٹھہری۔
پھر مقدمہ بھی تھا کس کس سے لڑنا۔
بڑا بھاری وقت ہے مجھ پر ”خاک“
میری خوشیوں کا چمن بن گیا ویرانہ

☆☆

روبینہ شاہین

یہ رشتے

''عمارہ! جلدی اٹھو میں ناشتا بنا رہی ہوں تم اسکول کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' نگہت نے بیٹی کو نیند سے جگایا۔

''ناشتا کرلوں گی پر اسکول نہیں جاؤں گی۔'' عمارہ نے بستر پر لیٹے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا۔

''اسکول کیوں نہیں جاؤ گی...... پڑھنا لکھنا نہیں ہے تمہیں؟'' نگہت نے عمارہ کو ڈانٹتے ہوئے سوال کیا۔

''اسکول فیس ٹائم پر جمع نہیں کرواتی ہیں آپ! ٹیچر مجھے سزا دیتی ہیں، میری انسلٹ ہوتی ہے کلاس میں۔'' عمارہ نے شکوہ کیا۔

''تم اسکول جاؤ، آج تمہیں لینے آؤں گی اسکول اور فیس بھی پے کردوں گی۔ اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ اسکول دیر سے جاؤ گی تو ٹیچر سزا دیں گی۔''

''تم نے عمارہ سے اسکول کی فیس جمع کرانے کا وعدہ کرلیا ہے لیکن پیسے کہاں سے آئیں گے؟'' سمیع جو بیوی اور بیٹی کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے نگہت سے سوال کیا۔

''آپ پریشان نہ ہوں مجھے کپڑوں کی سلائی کے پیسے مل گئے ہیں۔ آئیں ناشتا کرلیں۔''

☆☆☆

''آپا جان بیٹے کی شادی کی تیاری کر رہی ہیں آنے والے مہینے میں شادی کی تاریخ ہوگی۔'' نگہت نے سمیع کو بتایا۔

''آپا کی فیملی کے لیے ''پہناؤنیاں'' یعنی سب کے لیے جوڑے اور دولہا دلہن کے لیے کوئی مہنگا تحفہ بھی لینا ہوگا، ان کے پہلے [illegible] کی شادی ہے۔'' سمیع [illegible] نے فکر مند ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ صحیح کہتے ہیں لیکن سمیرا کے بیٹے کا عقیقہ ہے۔ اس مہینے اس کے بچے کی بھی پہلی خوشی ہے۔ سمیرا کی بھی ساری فیملی کے لیے کپڑے، بچے کے لیے کھلونے کپڑے اور سونے کا کوئی تحفہ بھی دینا ہوگا۔ ہم پہلے سمیرا کی شاپنگ کرلیتے ہیں اس کے بعد آپا کی فیملی کی شاپنگ کریں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ایک شاپ پر پارٹ ٹائم کر رہا ہوں وہاں سے بھی پیسے ملیں گے ان شاء اللہ کچھ انتظام ہو جائے گا۔''

''آپ اسی لیے رات دیر سے گھر آتے ہیں؟''

''میں نے سوچا دوستوں میں بیٹھ کے وقت ضائع ہوتا ہے۔ چائے بسکٹ پر پیسے علیحدہ خرچ ہوتے ہیں۔ اب یہ پیسے بھی بچیں گے اور آمدنی بھی ہوگی۔''

''آپ نے بہت اچھا کیا اس مہنگائی میں گھر کا خرچ چلانا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ پٹرول، گھی، تیل، آٹا، چینی، دالیں، سبزی گوشت سب کچھ مہنگا...... گیس اور بجلی آئے نہ آئے لیکن گیس اور بجلی کے بل اف ......اب توبہ توبہ۔'' نگہت نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

☆☆☆

''ممما! میرا رزلٹ آ گیا ہے، میں فرسٹ آئی ہوں اور میرا برتھ ڈے بھی آنے والا ہے۔ پاپا مجھے گفٹ دیں گے، طاہر بھیا سے کیک لوں گی اور آپ کی طرف سے اچھا [illegible] عمارہ نے اپنا رزلٹ کارڈ دکھاتے ہوئے فرمائش کی۔



"مل جائے گا آپ کو گفٹ، کیک اور اچھا سا ڈنر بھی، میں اب کھانا لگاتی ہوں، تم یونیفارم چینج کرو اور کھانا کھاؤ۔" نگہت نے بیٹی کو پیار کیا۔

"طاہر! کھانا کھالو ہمارے ساتھ۔"

"نہیں مما! مجھے دیر ہو جائے گی، کوچنگ کے لیے جانا ہے۔" طاہر نے نگہت کو جواب دیا۔

"آج کل تم بہت مصروف رہتے ہو صبح یونی ورسٹی جاتے ہو، دوپہر کو کچھ دیر کے لیے آتے ہو پھر چلے جاتے ہو اور رات کو دیر سے آتے ہو۔"

"میرا فائنل ایئر ہے اس لیے زیادہ پڑھنا پڑتا ہے۔ یونی ورسٹی سے کوچنگ اور پھر رات کو دیر تک گروپ اسٹڈیز کرتے ہیں۔" طاہر نے شوز پہنتے ہوئے جواب دیا اور اللہ حافظ کہتے ہوئے گھر سے باہر چلا گیا۔

☆☆☆

"سمیع! یہ دیکھیں۔ میرا اس کے شوہر اور بچے کے لیے کپڑے خرید لیے، اب اس کے ساس سسر اور نندوں کے لیے شاپنگ کرنا ہے اور اپنے نواسے کے لیے گفٹ لینا ہے۔ لگتا ہے جو بجٹ ہم نے رکھا ہے وہ کم ہوگا، ہر چیز مہنگی ہے۔" نگہت خریدے ہوئے کپڑے سمیع کو دکھانے کے ساتھ ساتھ مہنگائی کا بھی شکوہ کیا۔

میری بھولی بیگم! مہنگائی اور بڑھتی قیمتوں میں ہماری خواتین کا ہاتھ ہے۔ پیسے کمانے میں ہم بے چارے مردوں کی سانسیں ڈوبنے لگتی ہیں لیکن عورتوں کا شاپنگ کا شوق پورا نہیں ہوتا۔" سمیع صاحب نے نگہت پر میٹھا سا طنز کیا۔

"لگا دیں ہر الزام ہم عورتوں پر۔ ڈالر مہنگا ہو، پٹرول کی قیمت بڑھے سب ہمارا قصور ہے، ہماری

غلطی۔'' نگہت گرمی میں شاپنگ کر کے آئی تھی سمیع کے طنز پر بھڑک اٹھی۔

''بیگم! ہمیں آنکھوں سے قتل کرنے کا ارادہ ہے کیا؟ ہم تو ماحول کو خوش گوار کرنے کے لیے ہنسی مذاق کرتے ہیں، آپ، ناراض ہو گئیں۔'' سمیع نے بیگم کو مناتے ہوئے عمارہ عمارہ! بیٹا جلدی سے اپنی مما کو ٹھنڈا شربت پلاؤ ٹمپریچر بہت ہائی ہے۔'' نگہت مسلسل سمیع کو غصے سے گھور رہی تھی۔

''پاپا! آپ مما کو پریشان نہ کریں اور مما آپ شربت پی لیجیے، غصہ نہ کریں۔'' عمارہ نے بہت پیار سے کہا تو نگہت ٹھنڈے شربت کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگیں۔

☆☆☆

رات دیر تک نگہت سلائی کر رہی تھی۔

''بہت رات ہو گئی ہے نگہت، اب سو جاؤ، آرام کرو، سلائی کا کام صبح کر لینا۔'' سمیع نے نگہت کے نازک ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے مشورہ دیا۔

''بوتیک سے سلائی کا ارجنٹ آرڈر ملا ہے، پیسے بھی زیادہ ملیں گے۔ یمیرا کے بیٹے کے لیے کوئی مہنگا اور خوب صورت گفٹ خریدوں گی باقی جو تیاری کرنا ہے اس کے لیے اپنے سونے کی جھمکے بیچ دوں گی پہلے بچے کی خوشی ہے اور بیٹی کے سسرال کا معاملہ ہے اتنا تو کرنا ہوگا۔'' نگہت کے لہجے میں ماں کا پیار بول رہا تھا۔

''تم اپنے جھمکے نہیں بیچو گی۔ یہ جھمکے میں نے تمہیں شادی کی پہلی رات رونمائی میں گفٹ کیے تھے۔ میں فیکٹری سے ایڈوانس لینے کی کوشش کروں گا۔ سب انتظام ہو جائے گا، تم اپنا بھی خیال رکھو، ان سب کاموں کے بوجھ سے بیمار پڑ گئیں تو ہم سب کا خیال کون رکھے گا؟'' سمیع نے نگہت کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سمجھایا۔

''آپ پریشان نہ ہوں میں ٹھیک ہوں، یمیرا کے بچے کے عقیقہ اور آپا جان کے بیٹے کی شادی میں شرکت کی تیاریاں ہو جائیں تو میری ساری تھکن دور ہو جائے گی۔'' نگہت کے لہجے میں امید کی کرن تھی۔

☆☆☆

آپ لوگ آ جائیں ناشتا کر لیں۔'' نگہت نے ناشتا لگاتے ہوئے سمیع اور اپنے بیٹے طاہر کو آواز دی۔

''واہ مما! میرا فیورٹ لچھا پراٹھا اور مزیدار آملیٹ ......ناشتا تو زبردست ہے۔'' طاہر پرجوش لہجے میں کہتا ہوا ناشتے سے انصاف کرنے لگا۔

''واقعی ناشتا بہت مزے دار ہے۔'' سمیع نے ستائشی نظروں سے نگہت کو دیکھا۔

''مما! یہ پیسے رکھیں۔ آپ اپنے جھمکے نہیں بیچیں گی اور پاپا آپ بھی ایڈوانس نہیں لیں گے۔'' طاہر نے ایک لفافہ نگہت کو دیا۔

''لگتا ہے تم نے ہماری باتیں سن لی ہیں، لیکن بیٹا، تمہارے پاس یہ پیسے کہاں سے آئے؟'' نگہت اور سمیع نے ایک ساتھ سوال کیا۔

''آپ لوگوں کی باتیں کل میں نے سن لی تھیں اور یہ میری محنت کے پیسے ہیں، میں ٹیوشنز پڑھاتا ہوں۔''

تم اپنی پڑھائی پر توجہ دو تمہارا فائنل ایئر ہے۔'' سمیع نے بیٹے کو سمجھایا۔

''میں پڑھائی پر پورا فوکس کرتا ہوں کچھ وقت ملتا ہے تو ٹیوشن پڑھاتا ہوں۔ مجھے بڑا بیٹا ہونے کا فرض بھی تو نبھانا ہے، مجھے جلد کوئی اچھی نوکری بھی مل جائے گی، ان شاء اللہ ہماری مشکلات اور پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔''

''مجھے فخر ہے تم پر بیٹا، بہت خوش قسمت ہوں میں کہ تمہارے جیسا ذمہ داری بیٹا اور تمہاری ماں جیسی وفا دار بیوی ملی۔ تم لوگوں کے ہوتے ہوئے کوئی مشکل اور پریشانی میری ہمت اور حوصلے کو شکست نہیں دے سکتی۔'' سمیع کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمک رہے تھے۔

طاہر اور نگہت کے ہونٹوں پر ایک پر امید مسکراہٹ تھی۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں رشتے تو بہت ہوتے ہیں لیکن جن رشتوں میں خلوص ہو وہ بہت قیمتی ہوتے ہیں سمیع، ہم کتنے امیر ہیں کہ ہمیں ایسے مخلص رشتے ملے ہیں جو بہت قیمتی ہیں۔''

نگہت نے سمیع کی سوچ سے اتفاق کیا اور ان سب کے چہرے خوشی سے کھل گئے۔

☆☆

جھائیاں، حسن کو گھنائیں

بے داغ چہرہ ہر عورت کا خواب ہوتا ہے، اگر کسی وجہ سے چہرے پر داغ دھبے نمایاں ہو جائیں تو نہ صرف دیکھنے والے پر برا تاثر چھوڑتے ہیں بلکہ آپ کی شخصیت میں احساس کمتری پیدا کرتے ہیں۔ خاص کر چہرے پر نمودار ہونے والی جھائیاں اچھے بھلے حسن کا بیڑہ غرق کر دیتی ہیں۔



جھائیوں کی سب سے بڑی وجہ وٹامن ڈی، بی اور آئرن کی کمی ہے۔

☆صبح نہار منہ ناشتے سے قبل ایک گلاس نیم گرم پانی میں ایک عدد لیموں کا رس ملا کر پینے سے چہرے کی جھائیاں ختم ہوتی ہیں۔

☆سونف کو رات میں گرم پانی میں بھگو دیں اور نہار منہ شہد میں ملا کر استعمال کریں۔

☆ہفتے میں ایک مرتبہ عرق گلاب میں پسا کافور ملا کر لگائیں۔

☆سنگترے کے چھلکوں کو سکھا کر اس میں عرق گلاب اور لہسن شامل کر کے پیس لیں اور چہرے پر ملیں۔

☆ایک چمچہ زیتون کا تیل اور اسی مقدار میں چینی آپس میں ملا کر اچھی طرح مکس کریں اور پیسٹ کو چہرے اور گردن پر پندرہ سے بیس منٹ لگائیں اور پھر نیم گرم پانی سے دھوئیں۔

☆مولی کے دو ٹکڑے پیس کر اسے ایک چائے کا چمچہ دہی میں ملا کر چہرے پر لگائیں۔

☆مسور کی دال، انڈے کا چھلکا اور سوکھے مالٹے کے چھلکے ہم وزن لے کر پیس لیں، پھر اس مرکب میں تھوڑا پانی ملا کر لیپ بنائیں پھر اس کو چہرے پر لگائیں۔

☆چنے کی دال دودھ میں بھگو کر ایک یا دو دن کے لیے رکھ دیں جب خشک ہو جائے تو اس کو پیس کر ابٹن کی طرح لگائیں۔

☆دو چمچے دہی لیں، اس میں ہلدی کو ملائیں اور متاثرہ حصے پر بیس منٹ تک لگائیں۔ اس کے بعد آپ ٹھنڈے پانی سے منہ دھولیں۔

☆ناریل کے تیل کے چند قطرے اپنے ہاتھوں میں لیں چہرے پر اس کا مساج ایسے کریں کہ تیل تہوں تک پہنچ جائے اور بیس سے پچیس منٹ تک تیل لگا کر چہرے پر لگا رہنے دیں تاکہ تیل اچھی طرح اسکن میں جذب ہو جائے اس کے بعد آپ ٹھنڈے پانی سے منہ دھولیں۔ یہ طریقہ آپ ہفتہ میں دو سے تین دفعہ کریں۔

☆☆

"کرن کا دستر خوان"

گاجر کا سرائیکی اچار

اشیاء:

گاجر	دس سے بارہ عدد
نمک	حسب ذائقہ
چائنیز نمک	ایک چمچہ
چینی	دو چائے کے چمچے
مکئی کا آٹا	ایک کھانے کا چمچہ
تیل	ایک کھانے کا چمچہ
سویا ساس	ایک چائے کا چمچہ
سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ
پانی	ایک کپ

ترکیب:۔

گاجریں دھولیں، ان کا چھلکا اتاریں۔ انہیں لمبا یا گول کاٹ لیں۔ تیل گرم کریں، گرم ہو جانے پر گاجریں ڈال دیں، ایک منٹ کے بعد نمک اور چائنیز نمک ملا دیں۔ کچھ دیر بعد اس میں ایک کپ پانی ڈال دیں۔ چھ سے سات منٹ گاجریں ابالیں۔ اس میں چینی، سرکہ، مکئی کا آٹا، سویا ساس ملا دیں دو منٹ پکائیں۔ یہ ڈش ابلے ہوئے چاولوں یا نان روٹی کسی کے ساتھ پیش کریں۔ بہت مزا دے گی۔



دہی چکن

اشیاء:

چکن	ایک کلو
دہی	ڈیڑھ کپ
ثابت زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
پسا زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
پسی سفید مرچ	آدھا کھانے کا چمچہ
کالی مرچ	آدھا کھانے کا چمچہ
ادرک	ایک ٹکڑا (جولین کٹی ہوئی)
کریم	آدھا کپ
نمک	ایک چائے کا چمچہ
ٹماٹر	ایک عدد
تیل	پانچ کھانے کے چمچے
پسا ادرک لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
بڑی الائچی	چار عدد
چھوٹی الائچی	چار عدد
چورس باریک کٹی پیاز	ایک عدد
ہرا دھنیا	سجاوٹ کے لیے

ترکیب:۔

ایک پین میں تیل ڈالیں پھر اس میں چکن کو اتنی دیر پکائیں کہ چکن پر ہلکی سی سرخی آجائے آنچ ہلکی کردیں اور اس میں پسا ادرک لہسن ڈال دیں۔ تین سے چار منٹ پکائیں اور اس میں بڑی الائچی، ثابت زیرہ اور چھوٹی الائچی ڈال دیں۔ اتنا پکائیں کہ پانی خشک ہو جائے پھر ایک پیالے میں دہی ڈالیں اور اس میں پسا زیرہ، پسا دھنیا، سفید مرچ اور نمک ملا دیں۔ اس آمیزے کو چکن میں ملا دیں۔ تھوڑا سا بھون کر اس میں ٹماٹر اور پیاز ملا دیں۔ ہلکی آنچ پر چکن کو بارہ سے تیرہ منٹ پکائیں۔ پانی بھون کر ہری مرچ اور ادرک ملا دیں۔ پھر اس میں کریم ڈال دیں اور پانچ سے سات منٹ ... کو ڈھک کر چکن کو پکائیں سرو کرتے وقت ہرا دھنیا ڈال کر پیش کریں۔

☆☆

خواتین میں "پی سی او ایس" اور "پی سی او ڈی" کے مسائل

خواتین میں "پی سی او ڈی" یعنی پولی سسٹک اوورین ڈیزیز اور "پی سی او ایس" پولی سسٹک اوورین سنڈروم جیسے مسائل عام ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ دونوں مسائل بظاہر ایک ہیں لیکن ان کی علامات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ پہلے نمبر میں اووریز کے ہارمونز متاثر ہوتے ہیں اور ماہانہ نظام یعنی حیض کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور ان خرابیوں کی وجہ سے مختلف علامات بدن میں پیدا ہوتی ہیں، جو ہر لڑکی یا خاتون میں مختلف ہوتی ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے اس حالت کی کوئی طبی وجہ نہیں ہے یہ پندرہ سال کی عمر سے پچاس سال کی عمر تک کی خواتین کو ہو سکتا ہے۔ جدید میڈیکل سائنس کے مطابق بدن کے آٹو امیون نظام کے تحت اووریز اپنا خود کار نظام درست کرتی ہیں۔ اس کے لیے ایک قدیم ٹوٹکہ یہ ہے کہ گڑ پانی میں ابال کر نیم گرم پی لیا جائے تو نظام درست ہو سکتا ہے۔ اگر ہارمونل نظام درست نہ ہو تو یہ پولی سسٹک اوورین سنڈروم میں بدل جاتا ہے جو اپنے ساتھ علامات کا ایک پورا پیکج لیے ہوتا ہے۔ اور بدقسمتی سے ہماری خواتین اسی سنڈروم کے ساتھ کلینکس یا اور فٹنس سینٹرز میں قدم رکھتی ہیں ہر دس میں سے چار خواتین یہ علامات رکھتی ہیں۔ مختلف شہروں میں مختلف اعداد و شمار ہوں گے۔

اس کی علامات میں بے قاعدہ حیض۔ یا حیض نہ ہونا، جو طبی زبان میں ایمینوریا اور اولگومینوریا کہلائے جاتے ہیں۔ ان کی دکھائی دینے والی علامات میں سر کے بے تحاشا گرتے ہوئے بال، تیس سال کی عمر سے اوپر خواتین کے جوڑوں میں درد، جلد پر دانے، چہرے کے ساتھ بدن کے دوسرے حصوں پر بھی دانے اور بالوں کی زیادتی، تیزی سے بڑھتا وزن، آنکھوں اور ہاتھ پاؤں پر سوجن، پسینے اور پیشاب کی تیز بو، شدید ڈپریشن اور بانجھ پن شامل ہیں۔

"پی سی او ڈی" کا سب سے بہترین علاج ماہانہ نظام کو درست کرنا ہے۔ اور یہ ادویات کے ساتھ ساتھ ایکسرسائز اور غذا سے بھی ہوتا ہے۔ اس کے لیے غذا میں پروٹین کی مقدار بڑھا دینی چاہیے۔ دودھ، دہی، پنیر، لال لوبیا، مچھلی، چنے کی دال اور سویا بہترین ہیں۔ اگر "پی سی او ڈی" کی بڑی علامت اولیگو مینوریا ہو۔ اولیگو مینوریا وہ حالت ہے جب ایک حیض سے دوسرے حیض کے دوران 35 دن یا اس سے زیادہ وقفہ آئے۔ اس دوران علامات یہ ہوتی ہیں۔ موٹاپا، چہرے پر فالتو بال اور دانے، تھکاوٹ اور سر درد، معدے کی خرابی، خواتین اس طبی حالت کے ساتھ موٹاپے اور بانجھ پن کا شکار ہوتی ہیں۔ اپنی گائنا کولوجسٹ سے تفصیلی بات چیت کیجیے اور اپنے ماہانہ نظام کو باقاعدہ کرنے کی کوشش کیجیے۔

جو خواتین اپنے گھر کے کام بھی خود کریں، لیکن وزن کم نہ ہو اگر پی سی او ڈی کی علامات نہیں ہیں تو وہ رات کے کھانے کے بعد تیز قدموں سے بیس منٹ چہل قدمی ضرور کریں۔ آفس میں مستقل بیٹھ کر کام کرنے والی خواتین جن کے پیٹ اور کولہے بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔

بچے کی پیدائش کے بعد وزن کم نہ ہو یا بچے کی پیدائش آپریشن سے ہوئی ہو اور پیٹ کم نہیں ہو رہا ہو تو آدھا پاؤ کا جو دو گلاس پانی میں ابال کر جب ایک گلاس پانی رہ جائے تو نیم گرم ہی یہ پانی پی لیا جائے (ایک ہفتے تک) تو آپریشن کی تکالیف رفع ہو جاتی ہیں۔ شادی بے شک انسان کے لیے ضروری ہے لیکن اگر کسی وجہ سے نہیں ہو رہی ہے تو اس کے لیے ڈپریشن میں جانے کی ضرورت نہیں ہے، اپنے آپ کو فٹ رکھنے کی مصروف رکھنے کی ضرورت ہے۔ اچھی کتب پڑھیں، اچھی فلمز دیکھیں، کسی این جی او سے منسلک ہو جائیں ملازمت شروع کر دیں۔

زیادہ ذہنی دباؤ و تناؤ کا نتیجہ بھی، پی سی او ڈی، کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ کوشش کریں، دماغ کو حالت سکون میں رکھیں۔

اور مناسب ایکسرسائز ضرور کریں۔ اگر جم جوائن نہیں کر سکتیں تو گھر پر ہی ایک ہلکی پھلکی مشین خرید لیں اور اس پر روزانہ ایک گھنٹہ ایکسرسائز کریں۔ اگر مشین خریدنا ممکن نہیں تو فرش پر دری بچھا کر خیالی سائیکل چلائیں۔ پیٹ اور کمر شیپ میں رہیں گے۔ زمین پر اکڑوں بیٹھ کر خیالی چکی چلائیں، اس طرح بازو، شانے اور سینہ سڈول رہیں گے۔

☆☆

شعلۂ عبیر

کرن کرن خوشبو

القرآن

☆۔(اے پیغمبر) ہم نے تم پر سچی کتاب نازل کی ہے تاکہ اللہ کی ہدایات کے مطابق لوگوں کے مقدمات کے فیصلے کرو اور خیانت کرنے والوں کی طرف داری میں نہ جھگڑو۔ (سورہ النساء۔105)

☆۔اور (اے انسان!) تو اس بات کی پیروی نہ کر جس کا تجھے (صحیح) علم نہیں، بے شک ناک، کان اور آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک سے باز پرس ہوگی۔ (سورہ بنی اسرائیل۔36)

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
کچھ حکمران ہوں گے، کمینے قسم کے لوگ ان کے پاس کثرت سے ہوں گے، وہ ظلم کریں گے اور جھوٹ بولیں گے۔ جو آدمی ان کے پاس جا کر ان کے جھوٹ کی تصدیق کرے گا اور ان کے ظلم پر ان کی اعانت کرے گا، اس کا مجھ سے اور میرا اس سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ جو آدمی ان کے پاس نہ گیا؟ ان کے جھوٹ کی تصدیق نہ کی اور نہ ہی ظلم پر ان کی مدد کی، وہ مجھ سے ہے اور میں اس کا ہوں۔ (مسند احمد۔11135)

عبیداللہ سندھی نے فرمایا

☆۔غلام قوم کے معیار بھی عجیب ہوتے ہیں۔ شریف کو بے وقوف، مکار کو چالاک، قاتل کو بہادر اور مال دار کو بڑا آدمی سمجھتے ہیں۔

☆۔میرے نزدیک انقلاب کا جذبہ بھی فرد کی خودی کو بیدار کرتا ہے اور جب انسان کی خودی بیدار ہو جائے تو وہ بلا خوف وخطر زندگی کی کشمکشوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔ وہ فرسودہ اور بے کار دستوروں کو توڑ پھوڑ دیتا ہے اور زندگی کی نئی طرح کی بنیاد ڈالتا ہے۔

☆۔قومی اور بین الاقوامی انقلابوں کے لیے نہایت اعلیٰ درجہ کے ضبط کی ضرورت ہوتی ہے۔

☆۔ایک عقل مند اقلیت بھی اپنی پارٹی کو ملک کی رہنما جماعت بنا سکتی ہے۔

فوزیہ ثمر بٹ...... گجرات

طویل شادی شدہ زندگی

ایک طویل فاصلے کے لیے ایئر پورٹ کے چیک ان کاؤنٹر پہ جہاز کے عملے کے ایک فرد نے شوہر سے نہایت معذرت خواہانہ انداز میں درخواست کرتے ہوئے کہا:
"سر! مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے جہاز میں بہت زیادہ رش کی وجہ سے آپ میاں بیوی کو الگ الگ سیٹیں دی جا رہی ہیں۔ آپ کی سیٹ کا نمبر 14A ہے جبکہ آپ کی بیگم کا سیٹ نمبر 45H ہے۔"
شوہر: "اوہ! شکریہ۔ کیا مجھے اس تعاون کے لیے مزید کچھ رقم ادا کرنی پڑے گی؟"
عملے نے جواب دیا: "نہیں سر! آپ کو کچھ نہیں دینا پڑے گا آپ کی بیگم پہلے ہی ادا کر چکی ہیں۔"

اقصیٰ شہزاد...... تلہ گنگ

وہ مجھے بھول گئے

1937ء میں انگلینڈ میں چیلسی اور چارلٹن کے مابین فٹ بال کا میچ، سکسٹی منٹ پر شدید دھند کی

وجہ سے رک گیا۔ لیکن چارلٹن کے گول کیپر سیمے بارٹرم کھیل کو روکنے کے پندرہ منٹ بعد بھی گول کے اندر موجود تھے۔ کیونکہ اس نے اپنے گول پوسٹ کے پیچھے ہجوم کی وجہ سے ریفری کی سیٹی نہیں سنی تھی۔ وہ اپنے بازوؤں کو پھیلائے ہوئے اور اپنی توجہ مرکوز کر کے گول پوسٹ پر کھڑا رہا۔ پندرہ منٹ بعد جب اسٹیڈیم کا سیکورٹی عملہ اس کے پاس پہنچا اور اسے اطلاع دی کہ میچ منسوخ کر دیا گیا ہے۔ تو سیمے بارٹرم نے شدید غم کے ساتھ کہا۔

"کتنے افسوس کی بات ہے کہ جن کے دفاع کے لیے میں کھڑا رہا وہ مجھے بھول گئے۔"

زندگی کے میدان میں کتنے ایسے ساتھی موجود ہوتے ہیں جن کے مفادات میں ہم نے اپنا وقت، صلاحیت اور توانائی صرف کی ہوتی ہے لیکن حالات کی دھند وہ ہمیں بھول جاتے ہیں۔ دوست اور ساتھی چاہے کھیل کے میدان کے ہوں یا زندگی کے حالات وواقعات کے سرد اور گرم میں ہمیشہ انہیں یاد رکھ کر ساتھ لے کر چلنا چاہیے ایک اعلاظرف انسان کی طرح۔

افشاں سمیع ...... کراچی

ہری مرچیں

☆ شادی وہ واحد زخم ہے جس پہ ہلدی پہلے ہی لگادی جاتی ہے۔

☆ جدید تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ پچانوے فیصد خواتین اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتیں اور باقی پانچ فیصد مان کر دو گھنٹے بعد مکر جاتی ہیں۔

☆ پاکستانی دولہے کی سب سے بڑی ٹینشن مولوی نکاح کے وقت کلمے نہ سن لے۔

☆ قسم سے ایک ساتھ سارے گناہ یاد آ جاتے ہیں جب بیگم صاحبہ یہ کہتی ہیں "تم بیٹھو تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

☆ درویش سے کسی نے پوچھا: "نیا سال آنے والا ہے۔ اگلے سال میرے ازدواجی حالات کیسے ہوں گے؟ درویش نے کش لگایا اور کہا: سال بدلے گا سالا نہیں باقی توں حساب لالے۔

☆ اگر کسی کا اخلاق دیکھنا ہو تو اس کا موبائل چارج سے ہٹا کر اپنا موبائل لگادیں، تو آپ کو لگ پتا جاتا ہے۔

بڑا آدمی

مسٹر ڈیل کارنیگی کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے Now to stop worrying start living

یہ کتاب پہلی بار 1946ء میں چھپی مصنف لکھتے ہیں کہ جب میں نے پہلی بار اس کتاب کو مرتب کرنے کا ارادہ کیا تو میں نے اعلان کیا کہ جو شخص اس موضوع پر بہترین حقیقی کہانی پیش کرے گا اس کو دو سو ڈالر دیے جائیں گے۔ اس سلسلہ میں موصول ہونے والی دو اہم ترین کہانیوں میں سے ایک کہانی وہ تھی جس کا ایک حصہ حسب ذیل ہے۔

مسٹر سی آر برٹن نے لکھا کہ میں نو سال کا تھا میری ماں کا انتقال ہو گیا۔ بارہ سال کی عمر میں میں نے اپنے باپ کو بھی کھو دیا۔ اس کے بعد میں بے سہارا ہو کر رہ گیا۔ مجھے لوگ یتیم کہنے لگے۔

اس کے بعد مسٹر اور مسز لافٹن نے مجھ کو ازراہ ہمدردی اپنے پاس رکھ لیا۔ انہوں نے کہا کہ تم جب تک چاہو ہمارے پاس رہ سکتے ہو۔ میں اسکول جانے لگا تو اسکول کے بچے میری اونچی ناک پر مذاق اڑاتے۔ وہ مجھے تحقیر کے طور پر یتیم بچہ کہنے لگے۔ مجھے ان کی باتوں سے بہت تکلیف ہوتی تھی حتیٰ کہ میں چاہنے لگا کہ ان سے لڑوں مگر جس چیز نے مجھے لڑائی سے بچایا وہ مسٹر لافٹن کا یہ جملہ تھا۔

"ہمیشہ یاد رکھو کہ جنگ ہر آدمی کر سکتا ہے مگر بڑا آدمی وہ ہے جو جنگ سے اعراض کرے۔"

چھوٹے ظرف والا آدمی ایک سخت بات سن کر بگڑ اٹھتا ہے۔ مگر بڑے ظرف والے آدمی کے اوپر طوفان گزر جاتے ہیں اور پھر بھی اس کا سکون برہم نہیں ہوتا۔

☆☆

بشریٰ محمود

یادوں کے دریچے سے

نوشی مغل، کی ڈائری میں تحریر

محسن نقوی کی غزل

کبھی شام ہجر گزارتے کبھی زلف یار سنوارتے
کٹی عمر اپنی قفس قفس تری خوشبوؤں کو پکارتے

نہ وہ مہ جبینوں کی ٹولیاں، نہ وہ رنگ رنگ کی بولیاں
نہ وہ محبتوں کی بازیاں، کبھی جیتتے کبھی ہارتے

نہ وہ آرزوؤں کے خواب تھے، وہ خیال تھے وہ سراب تھے
سر دشت ایک بھی گل نہ تھا جسے آنسوؤں سے سنوارتے

تھا جو ایک لمحہ وصال کا وہ ریاض تھا کئی سال کا
وہی ایک پل میں گزر گیا جسے عمر گزری پکارتے

تھے جو جان سے بھی عزیز تر، رہے عمر بھر وہی بے خبر
تھی یہ آرزو مرے چارہ گر مری ناؤ پار اتارتے

گو نہ لب پہ کوئی سوال تھا، مرا دل پُر ملال تھا
میں خاموش در پہ کھڑا رہا، رہے وہ بھی گیسو سنوارتے

لائبہ ملک، کی ڈائری میں تحریر

ایک خوبصورت غزل

ترستی آنکھیں، اداس چہرہ، نحیف لہجہ، بغیر تیرے
بکھری زلفیں، لباس اُجڑا، وجود خستہ، بغیر تیرے

عمیق جنگل، گھپ اندھیرا، ڈوبی سانسیں، ضعیف دھڑکن
برہنہ پاؤں، بے نام منزل نشان نہ رستہ، بغیر تیرے

خاموش بلبل، سرد بیت جھڑ، بے رنگ موسم، ویران گلشن
نہ پھول خوشبو، نہ بادل نہ کوئی نغمہ، بغیر تیرے

امید مدھم، مزاج برہم، مایوس جیون، بے آس ہر دم
نہ کوئی خواہش نہ کوئی حسرت، نہ ہے تمنا، بغیر تیرے

کالی صبحیں، سُرخ راتیں، وقت ساکن، اُداس شامیں
ہزار صدیوں کے ہے برابر، ہر ایک لمحہ، بغیر تیرے

تعویذ اُلٹے، ادھوری منت، وظیفے، جادو ناکام سارے
نہ استخارہ ہی کام آیا، نہ کوئی دھاگا، بغیر تیرے

عجیب قسمت، نصیب اُلجھا، غلط لکیریں میرا مقدر
ہاں گردشوں میں یہ آ گیا ہے میرا ستارہ، بغیر تیرے

بحر کامل، فراق حاوی، جدائی یکسر، طویل دوری
خواب قربت، وصال حسرت، رضا ہے تنہا بغیر تیرے

ماہ رُخ، کی ڈائری میں تحریر

زبیر راج کی غزل

مکمل دو ہی دانوں پر یہ تسبیح محبت ہے
جو آئے تیسرا دانہ تو ڈوری ٹوٹ جاتی ہے

مقرر وقت ہوتا ہے محبت کی نمازوں کا
ادا جن کی نکل جائے قضا بھی چھوٹ جاتی ہے

محبت کی نمازوں میں امامت ایک کو سونپو
اسے تکنے، اُسے تکنے سے نیت ٹوٹ جاتی ہے

محبت دل کا سجدہ ہے جو ہے توحید پر قائم
نظر کے شرک والوں سے محبت روٹھ جاتی ہے

بت محبوب پانا ہے تو پھر اللہ سے مانگو
کہ پوجا بت کی کرنے میں تو قسمت پھوٹ جاتی ہے

کچھ موتی چنے ہیں ...... ادارہ

مرضی

شادی کیا چیز ہے، جسے لڑکیاں لازوال خوشیوں کا ایک جہاں کہتی ہیں۔ اس دنیا میں آ کر تو انسان اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتا۔ لڑکیاں کیوں سوچتی ہیں کہ ان کا اپنا گھر ہوگا۔ والدین کے گھر اس سے کہیں زیادہ آزادی ہوتی ہے اور یہیں تو روٹی، کپڑا بغیر طعنے کے ملتا ہے۔ ہنسنے اور بولنے کی آزادی ہوتی ہے۔

(ماریہ نذیر...... بھاگٹانوالہ)

بچے دو ہی اچھے

ہمارے ہاں پاکستان میں خاندانی منصوبہ بندی کا محکمہ ختم کر دینا چاہیے کیونکہ یہی کام مہنگائی کر رہی ہے۔ جب عورت حاملہ ہوتی ہے تو اسپیشلسٹوں کو ہر وزٹ کا دو سو روپیہ دینا پڑتا ہے۔ دوائیاں مہنگی اور جعلی، جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اسپتال کا خرچا کیونکہ پاکستان میں عموماً آپریشن کے ذریعے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر لڑکا ہو جائے تو اسپتال کے خاکروبوں اور آیاؤں کی قطار لگ جاتی ہے۔ جب بچہ اسکول میں داخل ہوتا ہے تو خرچے کا میٹر آن ہوتا ہے اچھا رزلٹ لینا ہو تو ٹیوشن لگانی پڑتی ہے۔ ٹیوشن پڑھانے والے عموماً کھانے کے وقت آتے ہیں اوپر سے کتابیں مہنگی اور زیادہ کہ انسان کے ہوش گم ہو جائیں۔ اسی لیے آج کل جس کی بھی شادی ہوتی ہے، وہ صرف دو بچے پیدا کرنے کے چکر میں ہی ہوتے ہیں۔ (جاوید اقبال...... اڈرن کولمبس)

(نوشی مغل...... جلال پور بھٹیاں)

نسل اور زمانہ

ہر نسل اپنے زمانے میں پیدا ہوتی ہے اور اپنے ہی زمانے میں سانس لے سکتی ہے۔ ہر دور کا اپنا ایک رمز ہوتا ہے۔ جس دور میں ہم زندگی گزار رہے ہیں۔ اس کا اپنا ایک رمز ہے جو اس رمز سے انکاری ہیں وہ خود بھی ہلاکت میں پڑیں گے اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی ہلاکت میں ڈالیں گے۔ تاریخ کے نظام قضا و قدر کو جھٹلانا امتوں اور ملتوں کو بھی راس نہیں آیا، یہ وہ مسخرگی ہے جو تاریخ کی کبریائی نے بھی برداشت نہیں کی۔

اختلاف کرنے والوں کو اس امر پر تو اتفاق کرنا ہی پڑے گا کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے زمانے میں نہیں، اپنے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں اور اگر ہم اپنے زمانے میں پیدا نہیں ہوئے تو پھر مژدہ ہو کہ ہم پیدا ہی نہیں ہوئے پچھلی نسلیں اپنا اپنا بوجھ اٹھا کر اپنے دن گزار گئیں۔ ہمیں اپنا بوجھ اٹھانا ہے اور ان کے تجربوں سے سبق سیکھنا ہے۔

(جون ایلیا...... اس دوران میں)

ذاتی جذبے

غم اور مسرت دونوں جذبے ذاتی ہیں۔ ہر شخص مختلف چیزوں میں خوشی ڈھونڈتا ہے۔ اپنا اپنا ظرف ہے۔ جیسے جنت دوزخ کا تخیل، ایک بچے کے لیے بہشت کا تخیل کچھ اور ہوگا اور بوڑھے کے لیے کچھ۔ دہقان کا نظریۂ جنہم فلسفی کے نظریے سے مختلف ہوگا اور پھر دل کی گہرائیوں کو کون پہنچ سکتا ہے۔ مکمل قبضہ ہو جانے پر بھی زندگی کا ایک حصہ ایسا رہ جاتا ہے۔ جس میں کسی کا دخل نہیں ہوتا۔ وہاں کوئی قدم نہیں رکھ سکتا۔

(شفیق الرحمٰن...... پچھتاوے)

فوزیہ ثمر بٹ...... گجرات

☆☆

مُدیرہ کرن

نامے میرے نام

اقصیٰ شہزاد ...... تلہ گنگ

امید کرتی ہوں کہ سب خیریت سے ہوں گے۔ میں کھاریاں آئی ہوئی ہوں۔ بھائی کے یہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ اِدھر آ کے ہی ڈائجسٹ لیا۔ ٹائٹل اچھا لگ رہا تھا۔ پچھلے مہینے کا بھی ٹائٹل اچھا تھا۔

''حمد و نعت'' کے بعد سینہ فاروق سے ملاقات کی۔ ''میری بھی سنیے'' چھوڑ دیا سب سے پہلے ''دامن سحاب'' پڑھی۔ رائٹر جی یہ کیا کر دیا۔ سلوئی کے ساتھ اسفند کا پیار تو پانی کے بلبلے کی طرح ثابت ہوا۔ وقت پڑنے پہ اعتبار ہی نہیں کیا۔ جرار اور حیا کا بھی کوئی سین دکھاتے۔ ''گھر گھر وندہ'' (ام اقصیٰ) کا مکمل ناول بھی اچھا تھا۔ اینڈ میں بہت خوب صورت نصیحت کی گئی۔ ''سپاس گزار'' بہت مزے کی اسٹوری ہے۔ کیا اینڈ پہ آئینور اور عباد مل جائیں گے......؟

''اسی کا نام زندگی ہے'' یہ ناولٹ بھی اچھا تھا۔ محنت کرو تو منزل ضرور ملتی ہے۔ عاکفہ نے جی محنت کی تو اسے اس کا اجر مل گیا۔

''گنوا کر دل و جاں ہم'' جب اسٹوری ختم ہو گی تب پڑھوں گی۔ اب بات ہو جائے افسانوں کی۔ ''پہلے نمبر پہ'' ''مونا نقوی کا افسانہ تھا اس کے بعد ''قرۃ العین خرم ہاشمی جی'' کا ''اس شہر کی کیا بات تھی''۔ ''ایک لطیفہ بھی ایسا تھا جس میں شوہر کا موبائل چوری ہو جاتا ہے اور چوری کرنے والا اس کی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے۔ خاص متاثر نہ کر سکا یہ افسانہ دو اسٹوریز چھوڑ دی ہیں۔ پچھلے مہینے میں نگہت سیما کی اسٹوری بہت مزے کی تھی۔ کیا تھا نگہت جی جو عبدالرحمن اور خانم کو ملا دیتیں۔

''نامے میرے نام'' السلام علیکم فرینڈز۔ سبیکا فراہم تلہ گنگ، خوش آمدید پیاری ہماری مستقل مزاجی کے پیچھے وجہ یہ ہے کہ ہمیں کرن سے پیار ہی بہت ہے۔ پچھلے مہینے کچھ مصروفیت کی وجہ سے حاضری نہ لگوا سکی۔ اس بار کوشش کی ہے۔ ایک ہی شہر کی ہیں کچھ اتا پتا بتائیں نا۔ آپی آپ سے ایک گلہ ہے۔ ''مقابل ہے آئینہ'' کیوں ختم کر دیا۔ ایک بار میرا لگائیں پھر ختم کر دیجیے گا۔ اینڈ پہ ایک بات کہنا چاہوں گی۔ کاٹنی نہیں ہے۔ یہاں پر لوگ کسی کا مذاق نہیں معاف کرتے غلطیاں کیا معاف کریں گے۔

ج:۔ اقصیٰ! کوشش کریں گے آپ کا ''مقابل ہے آئینہ'' لگا دیں۔ غلطیاں یا مذاق معاف کرنا انسان کے موڈ پر منحصر کرتا ہے۔ موڈ اچھا ہو تو بڑی سے بڑی غلطی معاف کر دی جاتی ہے اور خراب ہو تو چھوٹا سا مذاق بھی برا لگ جاتا ہے۔

علینہ بتول ...... تلہ گنگ

تمام قارئین کو سلام سب سے پہلے چار سال کرن کے ساتھ ہونے کے باوجود بھی خط لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ مگر اس بار میں نے بھی قسم کھالی کہ خط ضرور لکھوں گی۔

ٹائٹل گرل بہت پسند آئی۔ ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے دامن سحاب پڑھا۔ سلوئی کو دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے میری تو آنکھیں بھر آئیں۔ پھر آئے ''گنوا کر دل و جاں ہم'' پر یہ خانم ہاجرہ معلوم ہوتی ہیں۔ پھر زارون، شہریار، داؤد اور یاور کی شرارتیں پڑھ کر ہنسی سے برا حال ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو گھر والے شک کرنے لگتے ہیں۔ پھر پڑھا ''سپاس گزار'' حق ہا ...... کتنی محنتی لڑکی ہے۔ میں بھی آئینور جیسا بننا چاہتی تھی ہمیشہ سے۔ یہ سموئیل عباد اب غلط فہمی کا شکار ہو جائے گا۔ پھر مکمل ناول کی طرف ''ایک یقین سا اس گماں'' میں بہت اچھا لگا۔ دوست واقعی بہت پوزیسو ہوتے ہیں مگر اتنے ظالم نہیں ہوتے۔ ''اسی کا نام زندگی ہے''۔ بہت پسند آیا۔ محنتی لڑکیاں مجھے بہت پسند ہیں ''گھر گھر وندہ'' آدھا پڑھا ہے۔ اور افسانے ابھی تک نہیں پڑھے۔

مدیرہ آپی! آپ سے پوچھنا تھا کہ میں اک افسانہ دینا چاہتی ہوں مگر مجھے طریقہ کار معلوم نہیں آپ ضرور بتایے گا۔ پھر نامے میرے نام پر آئی سب سے پہلے نوشی آپی کا خط پڑھا۔ میں تو آپ کی فین ہوں نوشی

آپی۔ آپ بہت اچھی باتیں کرتی ہیں (ماشاء اللہ)۔ یادوں کے دریچے سے دعائے امید کی غزل پسند آئی۔ کرن کا دستر خوان پڑھا۔ میں کھانا اچھا بلکہ (بہتر) بنا لیتی ہوں۔ مگر تجربہ روز کرتی ہوں۔ (ہاہاہا)

ج:۔ علینہ! "تا ہے میرے نام" میں خوش آمدید۔ باقاعدگی سے نہیں ممکن تو جب وقت ملے تو اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے۔ ہم ہی نہیں ہماری مصنفات بھی قارئین کی رائے کی منتظر رہتی ہیں۔ آپ افسانہ اگر ڈاک سے پوسٹ کرنا چاہتی ہیں تو۔ "37 اردو بازار کراچی کراچی ڈائجسٹ۔" اس پتے پر پوسٹ کر دیجیے۔ اگر ای میل کرنا چاہتی ہیں تو ای میل ایڈریس ڈائجسٹ پر جو دیا ہے اس پر پوسٹ کر دیجیے۔

فوزیہ ثمر بٹ ہانیہ عمران آمنہ بتول، حریم فاطمہ، گجرات

ٹائٹل زبردست لگا ذرا ماڈل جی پوچھ کر بتائیں۔ اتنے وائٹ دانتوں کا راز، بلکہ کرن کے ٹوٹکوں میں یہ راز شامل کر دیجیے۔

اداریہ کی باتیں سنیں۔ ہائے ہم بھی اک دن یہ جہاں چھوڑ جائیں گے۔ وقت ہے کہ بھاگتا جا رہا ہے۔ ایسے لگتا ہے وقت کو پر لگ گئے۔ ہر شے کو بھاگے لے جا رہا ہے۔ 75 سال تو ہو گئے۔ ہم سے پہلے بھی اور ہم بھی یہی حسرت لے کر گہری نیند سو جائیں گے کہ کبھی اس ملک کو قائد جیسا عظیم حکمران ملے گا۔ ہمیشہ کی طرح "حمد باری تعالیٰ" "نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو دل سے پڑھی۔ انٹرویو میں سینہ فاروق سے مل کر اچھا لگا۔ کابلی پلاؤ اپنی ایج سے زیادہ کی پرفارمنس کر رہی۔ ڈینڈرن۔ T4G کے کمرشل میں بالکل الگ پرسنلٹی لگ رہی ہیں۔ "تاش گھر" باریشہ کوئی بچانے نہیں آئے گا۔ مجھے لگتا ہے وہ بوڑھی عورت روشن بیگم ہی ہوں۔ تعبیر کے ساتھ تو بہت برا ہوا۔ اچھے کردار سارے دکھ جھیل رہے ہیں اور شیطان عیش کر رہے ہیں۔ آخر ان سب کی پکڑ کب ہوگی صندل اور میرزاد کے بارے میں بھی کچھ بتائیں۔ اور صندل کی ماں آمنہ کا قصہ بھی۔ ارشادی بابا آمنہ کیا صندل کے والدین تھے؟

ابھی تک پرائے دکھ لیے بیٹھی ہیں۔ باریشہ کو برباد کرنا چاہتی ہیں کیا زویا جانتی نہیں باریشہ صندل اور میر کی بیٹی اس کی بھتیجی ہے۔

"سپاس گزار" فاطمہ اور شمشاد کی جوڑی مجھے پسند نہیں آ رہی اور رطابہ کے بارے میں پڑھ کر دل دکھتا ہے میرا۔ پتا نہیں ایسے لوگوں کو اصلاح کا موقع کیوں نہیں دیتا ہے۔ دوسروں کا سکون برباد کر رکھا ہے اور نہیں تو اپنی اولاد تک کو اذیت دینے سے باز نہیں آتے کہ ان کے بداعمال دوسروں کی زندگیوں کا سکون تباہ کیے ہوئے ہیں۔

"دامن سحاب" سلوٹی کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ لگتا ہے بہادر زمرد کے احساس دلانے پر اب ذرا ہوش میں آئے گا۔ یہ کیسی محبت تھی کہ کسی نے بیوی کو کٹہرے میں کھڑا کیا۔ الزام لگایا اور بغیر کسی صفائی کے جرم عائد کر دیا۔ لگ پتہ جاؤ اس گے ملک بہادر تم پر حقیقت آشنا ہوگی اپنے ہاتھوں اپنی محبت گنوادی۔

"جھ گنوا کر دل و جاں ہم۔" چلو جی یہ تو کنفرم ہوا مہریار ملک حیات راؤ اور کشور کا بیٹا ہے۔ ثمرور بیگم کا جو پردیس سے واپس آ رہا ہے کیا وہ حسنات راؤ ہے۔ زمن لگتا ہے مہریار کی کزن ہوگی۔ "اک یقین سا اس گمان میں تھا" حقیقت میں ایسا ہوتا تو نہیں۔ مگر یقین کر لیتے ہیں۔ ایک تو محبت ایسی خالص ولن کوئی اور نہیں دوست نکلا، واہ جی کیا بات ہے۔ صوفیہ کے ماں باپ کے ساتھ برا ہوا۔

گھر گھروندہ پرفیکٹ تحریر تھی۔ خدیجہ ام رحمت اور طلحہ دادی تک تو کہانی زبردست لگی تھی لگا ہے یہ ساری مخلوق کسی اور سیارے کی ہے۔ پیار محبت خلوص رشتوں کا مان پڑھ کر سکون مل رہا تھا۔ مگر یہ شادیاں ہوتے ہی خدیجہ بھی بدل گئی حالانکہ اس نے بڑا مشکل وقت دیکھا ہے۔ رحمت کی پریاں بھی پرفیکٹ تھیں اگر خدیجہ بھی بدل گئی تھی تو رحمت کی پریوں میں بھی تلخیاں آ گئی۔ کہتے ہیں جس نے دکھ جھیلا ہو وہ کسی اور کو دکھ نہیں دے سکتا۔ مگر خدیجہ نے بہو کے ساتھ اپنا رویہ بدل دیا۔ تحریر کا اینڈ تلخی لیے ہوا تھا زندگی کی۔ رائٹر جی کیا

تھا جو دل ہمارا بھی خوش ہو جاتا۔ "اسی کا نام زندگی ہے" عاکفہ بھی اس دنیا کی باسی تھی۔ بس یہ کہ کسی کو محنت کا پھل مل جاتا ہے اور کوئی دوسروں کو کامیابیاں دیتے دیتے خود بھی داماں رہ جاتے ہیں۔ اور ایسے لوگ حیران و پریشان رہ جاتے ہیں کہ ساڈے نال ہو کی گیاں۔

افسانے "مٹی کا گھر" اے سے لے کر زیڈ تک ہر کوئی ایک دوسرے کو لوٹ مار میں لگا ہے۔ بس اپنا متاع جیسے بھی حاصل ہو جائے۔ وہی مثل جیسے کو تیسا۔ "لفظوں کی مار" مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آیا سسرال جا کر لڑکیاں ہر بات میں انا کیوں لے آتی ہیں۔ سسرالیوں کی ہر بات بری اور ذات پروار کیوں لگتی ہے حالانکہ میکے میں بھی بھائی بہنوں ماں باپ کے ساتھ توں تڑا ہو جاتی ہے۔

"کرن کرن خوشبو" دسمبر کی نظم پسند آئی۔ لو جی اہی اوتھے دے اوتھے ہی آں نواں سال وی آ گیا۔ "یادوں کے دریچے" روا جاوید ہمرہ، اقرا کی ڈائری بہت اچھی لگی۔ محسن نقوی اور منیر نیازی کی تحریر میں پہلی بار پڑھ رہی ہوں۔ "کرن کتاب" کا بیوٹی باکس، زیرہ فیشل بڑا اوکھا لگا مجھے تو یہ نہ ہو میں لگاتے لگاتے کسٹمر کی آنکھوں میں زیرہ چلا جائے تے ہور کی بجائے پیسے کمانے کے کسٹمر میرے کولوں ہتھوں لے جائے۔ ساگ فیشل مولی فیشل کسٹمر سمجھیں ہم پارلر نہیں سبزی منڈی آ بیٹھے ہیں۔ "کرن کا دستر خوان" گاجر کے حلوہ کے ساتھ دوستی ہے مگر یہ مولی کی بالٹر سیدھا سا مولی کا پراٹھا اور ساتھ چائے کا مگ واہ دسمبر تیریاں کیا ہی بتاں نے۔

"تاسے میرے نام" میں نوشی مغل ہمیں آپ کا سیریس پن ذرا اچھا نہیں لگا۔ یہی بات آپ ہمیں اپنے چہچہاتے انداز میں بھی کہہ سکتی تھیں۔ جو ہم سب کی سمجھ دانیوں میں سمجھ میں آ جاتی تھی۔ ویسے پریشان کا کوئی سر پیر ساتوں وی دس دے نال سی۔ اسی ایویں اپنے قیاس کے گھوڑے دوڑا دوڑا کے تھکا بیٹھے آں۔ ماریہ نذیر، شمع جادید، مہر صفیہ، ثنا شہزادا اقصیٰ شہزادی گجرات کی شہزادی وردہ باتی تمام کو نیا سال مبارک ہو۔ ہم سب پاکستانیوں، غزہ کے مسلمانوں سب کے لیے مبارک ہو۔ 10 جنوری کو ہماری پیاری سی بہنا صالحہ سیفی اللہ کی رخصتی ہے۔ ہماری دعا ہے صالحہ سیفی اللہ آپ کو نیا سال مبارک ہو اور شادی مبارک ہو۔ خدا بہت اچھا نصیب کرے۔ ہم سب کی دعا ہے۔ آمین۔

میری زر عائشہ عمران کا پہلا ہیپی نیو ایئر ہے۔ زر عائشہ جانی ہیپی نیو ایئر۔

ج:۔ فوزیہ! قائد جیسا حکمران کو بھی لوگ کرپٹ ثابت کر دیتے اگر وہ کچھ دن زندہ رہتے اور حکمرانی کرتے، ضروری نہیں کہ ہم ایک مکمل انسان تلاش کریں۔ لیکن جو آپشن ہمیں دیے گئے ہیں سیاست دانوں میں، ان میں یہ کم از کم دیکھ سکتے ہیں کہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کس نے زیادہ کام ہے۔ کس نے سب سے زیادہ آسانیاں فراہم کی ہیں۔

"گھر گھروندہ" ضروری نہیں ہے کہ جس نے مشکل زندگی گزاری ہو تو وہ دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرے۔ بعض اوقات زیادہ تکلیفیں جھیلنے سے انسان کا رویہ منفی ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر حسد کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

"لفظوں کی مار" سسرال میں طنز کیا جاتا ہے اور ماں غصہ میں بولتی ہے زیادہ تر تربیت کے لیے۔ طنزیہ وار زیادہ برے لگتے ہیں۔

خدیجہ ظہیر......راولپنڈی

یونہی بیٹھے بیٹھے خیال آیا کرن پڑھتے ہوئے کہ کیوں نا خط ہی لکھ ڈالا جائے کیونکہ کبھی خط لکھنے کی کوشش نہیں کی۔

افسانے سبھی اچھے تھے۔ "مٹی کا گھر" بہت اچھا پیغام لیے ہوئے تھا۔ باقی سب افسانے بھی اچھے تھے۔ سینہ فاروق سے ملاقات اچھی رہی۔ یہ ہمارے کالج میں مجھ سے جونیئر تھی۔ اس وقت کیا خبر تھی کہ میڈیا پہ جا کر اتنی مشہور ہو جائے گی۔

"اسی کا نام زندگی" بس گزارے لائق تھی۔

"سپاس گزار" بہت زبردست جا رہا ہے۔ کہانی پہ گرفت بہت مضبوط ہے میمونہ تمہاری۔ گڈ ورک۔

"گھر گھروندہ" بہت زیادہ کردار تھے۔ کہانی بس ٹھیک رہی۔ ام اقصیٰ سے توقع زیادہ ہوتی ہے۔ کہانی

کا پیغام اخیر میں اچھا لگا لیکن مجموعی کہانی بہت ... کن تھی۔ "اک یقین سا اس گماں" اچھی تحریر تھی۔

"گنواں کر دل و جاں ہم" بہت دلچسپ چل رہی ہے۔ ام طیفور لکھیں اور اچھا نہ ہو۔ کیسے ہو سکتا ہے۔ کم لکھا مگر جب لکھا اچھا ہی لکھا۔

"دامن سحاب" اچھا چل رہا ہے مگر اب تیزی سے اختتامی مراحل میں لے جانا ضروری ہے۔

باقی مستقل سلسلے اچھے رہے۔ "کرن کا دستر خوان" نہ دیا کریں۔ اب ہر کوئی فوڈ چینل سے دیکھ کر کھانا بنا لیتا ہے۔ البتہ بیوٹی بکس اچھا سلسلہ ہے۔

تبصرہ ختم ہو گیا تو خط بھی ختم ہو گیا۔ پھر دوبارہ بھی کوشش کروں لکھنے کی۔

مزہ آیا لکھ کر۔ نجانے آپ کو پڑھ کر کیسا لگا ہو گا۔

ج: خدیجہ! آپ نے میرے نام میں آپ نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ خوش آمدید آپ ہمیں آئندہ بھی اپنی رائے سے آگاہ کیجیے گا۔ آپ لوگوں کی پسند اور نا پسند ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ڈائجسٹ وہاں بھی پڑھا جاتا ہے۔ جہاں انٹرنیٹ کی سہولت نہیں ہے۔ وہاں کیبل سسٹم نہیں ہیں۔

نوشی مغل...... جلال پور بھٹیاں

سب سے پہلے میں سوہنی موہنی نکی وڈی آپی باجی اور دادی کو میری طرف سے نیا سال مبارک ہو۔ ہماری زندگی کا ایک سال اور جدا ہو گیا ہم سے اللہ پاک سے دعا ہے کہ آنے والا سال ہم سب کے لیے ڈھیروں ڈھیر خوشیاں لانے کا سبب بنے (کڑیوں چپ نہ رہو۔ آمین بولو) سرورق پر بیٹھی ماڈل نے ہاتھ کا پوز ایسے بنوایا جیسے ہن ای میتوں وٹا مار کے نس جانا سو (ہاہاہا)

"حمد و نعت" بھی اچھی لگیں ...... سبینہ فاروق

ارے یہ تو اپنی سبینہ ہے خوش آمدید کیوٹ سی۔ کرن میں ویسے شاہین آپی محترمہ کی عمر بھی پوچھ لیتیں تو اچھا تھا ... ویسے میرا تجربہ تو یہ بتاتا ہے بہنوں کہ یہ محترمہ لم و بیش بائیس سال کی ہیں۔ آگے بڑھی تو شگفتہ یاسمین سے ٹکرا گئی (ہی ہی ہی) خیر ان سے باتیں شاتیں ... یوسف۔ پھر باری آئی کہانیوں کی۔

"مٹی کا گھر" اللہ اکبر اس کہانی کو پڑھ کر تو میں دو منٹ اور بارہ سیکنڈ کے لیے تو بالکل ساکت سی ہو گئی۔ بھٹنے والوں کے لیے بہت بڑا سبق تھا۔ اللہ پاک کسی دشمن کی بیٹی کو بھی یہ دن نا دکھائے "قربانی" قربانی دا نام سن کر میتوں عید الضحیٰ دی قربانی یاد آ گئی۔ (ہی ہی ہی) لیکن کہانی پڑھی تو ایک بھائی کی ذمہ داری کا احساس ہوا۔ دوجے بھائی توں تے ڈائن اور مطلب اس کی چالاک بیوی لے اڑی (ہی ہی)۔ ویسے اس طرح کی بھابھی ہونے سے اچھا، بندہ ... کنوارا ہی رہ لے (ہاہاہا)

"اس شہر کی کیا بات تھی" اک موبائل کے چھن جانے نے شکور کی زندگی کو کس قدر بدل دیا۔ اس واسطے سیانے کہہ گئے نیں کہ جو ہوندا ساڈی بھلائی واسطے ہوندا۔ سیاستاں لی لی (شائستہ) ہن آئی عقل ٹھکانے؟" اسی کا نام زندگی ہے" ہائے اللہ جی مرتضیٰ کا عاکفہ کو پیار بھرے لہجے میں غصے والا ڈانٹنا بہت اچھا لگا خیر اتنا اتنا تو چلتا ہی رہتا ہے زندگی میں۔ ماشاء اللہ عاکفہ کو بہت اچھا سسرال ملا۔ اب ایک عارفہ کنواری رہ گئی اور ایک (ارے نئی نئی میتوں نئی کرنا ابھی ویاہ ہی ہی ہی)

"لفظوں کی مار" ماشاء اللہ یہ کہانی ہم جیسی لڑکیوں کے لیے تھی صبر کا دوسرا نام ہی عورت ہے۔ بس میتوں جیہڑی ساس دا نام تے ایڈریس دے دیو ذرا میں انوں سمجھا کے آواں ...... (ہی ہی ہی) "حدود" تو پیالے پیالے بچوں اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اتفاق میں برکت ہے مل جل کر رہو گے دوسروں کا خیال رکھو گے تو لوگ مشکل وقت اور خوشی غمی میں ہمارے ساتھ رہیں گے۔ لگ گئی ہے سمجھ (ہی ہی ہی) سوما نقوی کا افسانہ، واقعی دل میں غلط فہمی کا پودا لگ جائے اور اس کو اکھاڑنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ خیر افسانہ ٹھیک ہی تھا۔ ویسے جڑے کی بات بتاؤں اس بار کا کرن ماشاء اللہ صحت مند تھا بالکل شیدے چاچوں کی طرح (ہاہاہاہا) "گھر گھر وندہ" یہ ناول ہر لحاظ سے پرفیکٹ تھا لیکن میں نے ابھی تک اپنی زندگی میں ایسی کوئی فیملی نہیں دیکھی کہ تین تین بچے مطلب ٹرپل بے بی ہی ہی ہی خیر مانا کہ خدیجہ نے

براوقت دیکھا ہے لیکن اس کو ایسے بھی تو تلخ رویہ نہیں رکھنا چاہیے نا بہو کے ساتھ، اللہ پاک ہدایت دے خدیجہ بیگم کو ویسے آج کل کے شوہر تو بیویوں کی بھی سنتے ہیں تو شاہ میر تم کسی صدی میں جی رہے ہو (آ کھوں آ کھوں) "گنوا کر دل و جاں ہم" ہاہائے وے منڈیا چوہدری شہاب بیڑا اتر جائے تیرا ککھ نہ روے تیرا۔ اے کی کیتا جلا دتا چوہدری آفتاب نوں اور قاسے تینوں وی ذرا شرم نہ آئی تائے نہ رل کے۔ ایہہ کم کردے ہوئے چچ چچ۔ لیکن یہ کوٹھڑی میں ملنے کے لیے حیات کی جگہ قاسم کیسے پہنچ گیا؟" اک یقین سا اس گماں میں تھا" آپیہ آپی سپرب بہت اچھا لگا یہ ناول۔ میں تو مجھی یہ سب نوشین (ارے میں نہیں کہانی والی) کا ہی کیا دھرا ہے لیکن شکر ہے نوشین تم نے نام نہیں بدنام کیا (میرا نہیں اپنا) ہاہاہا۔

ج: نوشی! معذرت ہمیں آپ کا خط ادھورا ملا تھا۔ اس لیے وہیں تک پبلش کر دیا۔

ماہ رخ بلند...... کراچی

ٹائٹل بہت خوب صورت تھا۔ ماڈل بہت پیاری لگ رہی تھی۔ سب سے پہلے افسانوں کی طرف چلی تو لبنیٰ آصف کا افسانہ "سالگرہ مبارک" زبردست۔ سالگرہ منانے کے چکر میں پورا گھر ہی جلا دیا۔ ام ہانی کا افسانہ "اچھی خالہ گندی ماما" اچھا تھا۔ مجھے میری امی یاد آ گئیں کہ کاش میری امی بھی میرے پاس ہوتیں۔ افراح شاہینہ کا افسانہ "مجھ سے پہلی سی محبت" اچھا تھا۔ فروا کتنی چالاک تھی۔ شکر کہ نائمہ کو عقل بھی آ گئی تھی۔ "ڈیلیور ٹو ڈے" مجھے سب افسانوں میں سب سے زیادہ اچھا لگا۔ خاتون کی ڈائری اچھا افسانہ تھا۔ واقعی میں سب کہتے ہیں کہ تم نور اذان کیا کرتی ہو۔

"دامن سحاب" "میرا موسٹ فیورٹ ناولٹ ہے۔ حیا مجھے بہت ہی اچھی لگی۔ اس کے بعد فلک تنویر کا ناول پڑھا "برخ" امایہ بہت ہی خود غرض تھی اس کی سزا بچاری شفق کاٹ رہی تھی۔ سبق آموز ناول تھا۔

اس کے بعد سیدھا "تائے میرے نام" پر آ گئے نوشی آپی نے مجھے یاد کیا ہائے اللہ مجھے یقین نہیں آ رہا۔ نوشی آپی تھینک یو سوچ۔ آپ نے لکھا ہے کہ بڑی بہن ہونے کے ناتے آپ پوچھ سکتی ہیں کہ میں اکتوبر میں کہاں تھی۔ تو میرا جواب ہے کہ بے شک آپ کا حق ہے کہ آپ پوچھیں۔ میں اپنی نانی کے گھر گئی ہوئی تھی۔ اور عشو آپی آپ کو مبارک ہو کہ فرسٹ ایئر میں 380 نمبر آئے۔ ماریہ آپی نے خوش آمدید کہا تو شکر ماریہ آپو۔ ثنا آپی، شکر ہے کہ آپ آ گئیں۔ آپ نے مجھے وش کیا مجھے بہت خوشی ہوئی تھینک یو۔ عشو آپی آپ نے مجھے ماہی کہا مجھے بہت ہی اچھا لگا۔ نوشی آپی آپ نے اجازت دے دی اور میں آپ کی چھوٹی بہن بن گئی۔

ج: ماہ رخ! ہم زیادہ مکمل ناول ہی دیتے ہیں۔ اتفاق سے بھی بڑا مکمل ناول آ جاتا ہے تو اس کے لیے معذرت۔

رتبہ ایمان...... نامعلوم

عرصہ دراز سے آپ کے جریدے کی قاری ہوں۔ مذکورہ جریدے نے اپنی تحاریر کے ذریعے معاشرے میں تفریح برائے اصلاح کا جو بیڑا اٹھایا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ جریدے میں اپنی تحاریر بھیجنے کے مکمل طریقہ کار کے بارے میں مکمل رہنمائی درکار ہے۔ براہ کرم مجھے بتائیں کہ آپ کے ڈائجسٹ میں تصنیفات بھیجنے کا طریقہ کار کیا ہے۔ کیا میں ای میل کے ذریعے تحریرات بھیج سکتی ہوں۔

آپ کے وقت اور غور و فکر کا شکریہ۔ میں آپ کے جواب کی منتظر رہوں گی۔ والسلام

ج: رتبہ! جس میل پر آپ نے یہ خط بھیجا ہے۔ اسی پر آپ اپنی کہانیاں بھی بھیج سکتی ہیں۔ یا پھر 37 اردو بازار کراچی کرن ڈائجسٹ۔ اس پتے پر پوسٹ کر سکتی ہیں۔

عائشہ کیانی...... لاہور

ج: عائشہ آپ 03172266944 واٹس ایپ نمبر پر میسج کر کے ڈائجسٹ منگوا سکتی ہیں۔

☆☆